بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
مئی 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM

بیاد محمود ریاض

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

مستقل سلسلے

مئی 2014
جلد 28 شمارہ 9
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی ون ڈی پی آر ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رنگینیِ خیال

شعاع کا مئی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وہ قومیں جو دانش، سوچ اور فکر رکھتی ہیں، ان میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے۔ اپنی رائے، سوچ اور فکر رکھنے کا جمہوری حق ہر فرد کو حاصل ہے۔ مباحثے، مذاکرے جمہوریت کی روح ہیں لیکن یہ مذاکرے اسی وقت بامقصد اور بامعنی ہو سکتے ہیں جب گفتگو میں دیانت داری اور اخلاق کو مدِنظر رکھا جائے۔ حقائق کو درست انداز میں پیش کیا جائے۔ سچائی کا چہرہ مسخ نہ کیا جائے۔

میڈیا کی آزادی کے بعد اہم اور قومی نوعیت کے حساس مسائل کو بھی مباحثوں اور مذاکروں کی نذر کر دیا گیا ہے۔۔۔ ان بحث مباحثوں میں اخلاقیات کے کسی بھی اصول کی پاس داری نظر نہیں آتی۔ اوّل تو حساس نوعیت کے مسائل کو چھیڑنا ہی غلط ہے پھر کم از کم گفتگو میں اخلاقی حدود کا تو خیال رکھنا چاہیے۔

ہر آزادی کی کچھ حدود متعین ہوتی ہیں۔ اخلاقیات تو پہلا اصول ہونا چاہیے۔

محمود ریاض صاحب،

اوّل فنا، آخر فنا۔ بے شک ہر ذی نفس کے لیے موت کا فیصلہ اٹل اور برحق ہے مگر وہ لوگ جو اپنی زندگی میں ایسا کچھ کر جائیں کہ ان کے دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد لوگوں سے دلی تعلق برقرار رہے، مرنے کے بعد بھی لوگ انہیں فراموش نہ کریں۔ محمود ریاض صاحب ایسی ہی شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی سوچ اور فکر سے جو چراغ روشن کیے، وہ آج بھی بہت سی زندگیوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

انہوں نے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد جس سوچ، فکر کے تحت رکھی۔ ساری زندگی ان اصولوں پر کاربند رہے اور آج جبکہ ان کی وفات کو ایک عشرہ سے زیادہ بیت چکا ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے شائع ہونے والے پرچے اسی راستے پر گامزن ہیں۔

10 مئی سنہ 2005ء کو ریاض صاحب دُنیا سے رخصت ہوئے لیکن ان کے روشن کیے چراغ آج بھی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

قارئین سے محمود ریاض صاحب کے لیے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- تعبیر۔ مریم عزیز کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- وہ کون تھی۔ مسرت ناز کا مکمل ناول،
- امایہ خان اور نگہت سیما کے ناولٹ،
- سائرہ رضا، شازیہ جمال نیر، یاسمین حنفی، صبا سحر اور تسنیم شریف کے افسانے،
- ممتاز قریشی سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ مدیحہ رضوی اور حسن نعمان کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- آئینہ خانے میں، شاعری سچ بولتی ہے، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

ہر اک طرح کا ہنر آزمانے والے ہو
قدیم ہو کے بھی میرے زمانے والے ہو

ظہورِ وقت کے پہلے سے ہو یہاں موجود
نہ آنے والے کہیں سے نہ جانے والے ہو

نہ جو بھی ردّ و بدل ہے، تم ہی کو زیبا ہے
بنانے والے ہو، چاہے مٹانے والے ہو

ہو زندگی ہی سراسر کہ بار بار یہاں
مجھے تو موت کے منہ سے بچانے والے ہو

جمانے والے ہو اپنا ہی کوئی رنگ ظفر
کہ ہر جما ہوا پہلا اڑانے والے ہو

ظفر اقبال

نعت رسولِ مقبول

وردِ قلب ہے سدا پاک نام آپ کا
دھڑکنوں میں ذکر ہے صبح و شام آپ کا

رحمتیں ہی رحمتیں، برکتیں ہی برکتیں
ہے ازل کی صبح سے یہ غلام آپ کا

سب فنا پذیر ہیں، مرگ کے اسیر ہیں
ثبت لوحِ وقت پر ہے دوام آپ کا

از پئے درود ہو یا پئے سلام ہو
خالق اور خلق کے لب پہ نام آپ کا

تیرگی میں نور دیں، یاس میں سرور دیں
زندگی کی جان ہے ابتسام آپ کا

ہو سفر ریاض کا، پھر سے جانب حرم
راستے میں ذکر ہو گام گام آپ کا

ریاض مجید

ادارہ

خواب اور تعبیر

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ایسے علاقے کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جہاں کھجوروں کے درخت (بہت زیادہ) ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا علاقہ ہے۔ لیکن وہ تو مدینہ یعنی یثرب تھا اور میں نے اپنے اس خواب میں دیکھا کہ میں نے تلوار چلائی تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا۔ اس کا مطلب (یہ ظاہر ہوا کہ وہ) احد کے دن مسلمانوں کو پہنچنے والا نقصان تھا' پھر میں نے تلوار کو حرکت دی تو وہ پہلے سے بہتر ہو گئی۔ تو اس سے مراد وہ فتح اور مسلمانوں کا (منتشر ہو جانے کے بعد) اکٹھا ہو جانا تھا جو اللہ نے نصیب فرمایا۔ میں نے اس خواب میں گائیں دیکھیں اور (خواب میں سنا) اللہ بہتری والا ہے۔ اس کا مطلب جنگ احد میں شہید ہونے والے مومن افراد تھے اور خیر سے مراد بعد میں حاصل ہونے والی بھلائی تھی (اور اس سے پہلے) بدر میں اللہ نے ہمیں خلوص کا جو ثواب عطا فرمایا (وہ مراد تھا۔")

فوائد و مسائل :

(1) تلوار سے مراد مسلمانوں کی اجتماعی قوت' تلوار ٹوٹنے سے مراد اس قوت میں کمی اور تلوار درست ہو جانے کا مطلب اس نقصان کا ازالہ تھا۔

(2) گائے کا ذبح ہونا مومن کی شہادت کا اشارہ ہے۔

(3) ہجرت والا خواب اس لحاظ سے سچ تھا کہ کھجوروں والے علاقے کی طرف ہجرت ہوئی' البتہ اس علاقے کے تعین میں اشتباہ ہوا یعنی اصل تعبیر مدینہ منورہ ہی تھی۔

جاہلیت میں مدینہ شریف کا نام یثرب تھا۔ ہجرت نبوی کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر" ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام طیبہ اور طابہ (پاک زمین) رکھا۔ اب اسے یثرب نہیں کہنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وضاحت کے لیے "یثرب" کا لفظ فرمایا۔

سونے کے کنگن

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے اپنے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن دیکھے۔ میں نے ان پر پھونک ماری (تو وہ غائب ہو گئے) میں نے اس کی تعبیر کی کہ ان سے مراد یہ دو کذاب ہیں مسلیمہ اور عنسیٰ۔"

فوائد و مسائل :

(1) مرد کے لیے سونے کے زیور پہننا منع ہے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں سونے کے کنگنوں سے مراد کوئی ناگوار واقعہ یا شخص ہی ہو سکتا ہے اور پھونک مارنے سے مراد ان کا مقابلہ کرنا اور انہیں شکست دینا ہے۔

(2) اسود عنسیٰ نے یمن کے شہر صنعاء میں نبوت کا جھوٹا دعوا کیا تھا۔ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے گھر میں داخل ہو کر قتل کر دیا۔ مسلیمہ کذاب نے یمامہ میں نبوت کا جھوٹا دعوا کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور وہ مارا گیا۔ اسے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے سید الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو جنگ احد میں شہید کیا تھا۔

حضرت ام فضل رضی اللہ عنہا کا خواب

حضرت قابوس بن مخارق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے' حضرت ام فضل (لبابہ بنت حارث) رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے (خواب میں) دیکھا گویا میرے گھر میں آپ کے جسم مبارک کا حصہ ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تو نے اچھی چیز دیکھی ہے۔ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے ہاں لڑکا پیدا ہو گا تو تم اسے دودھ پلاؤ گی۔"

چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو انہیں ام فضل رضی اللہ عنہا نے دودھ پلایا جو قثم (بن عباس) رضی اللہ عنہ سے تھا۔ انہوں نے بیان فرمایا میں انہیں (حسن یا حسین رضی اللہ عنہ کو) لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کی آغوش میں رکھ دیا۔ بچے نے پیشاب کر دیا تو میں نے اس کے کندھے پر چپت لگائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تجھ پر رحم کرے! تو نے میرے بیٹے کو تکلیف پہنچائی ہے۔"

سیاہ فام عورت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب بیان فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے ایک سیاہ فام اور بکھرے بالوں والی عورت دیکھی' وہ مدینہ سے نکلی اور مہیعہ یعنی جحفہ کے مقام پر جا ٹھہری۔"

میں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ مدینہ کی وبا جحفہ منتقل ہو گئی ہے۔

فوائد و مسائل :

(1) شروع میں مدینہ کی آب و ہوا اچھی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خواب کے ذریعے سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش خبری دی کہ مدینہ سے وبا ختم ہو جائے گی' چنانچہ ایسے ہی ہوا۔

(2) خواب میں بدصورت انسان سے مراد بیماری یا مصیبت اور خوب صورت انسان سے مراد راحت و نعمت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

نیکیاں

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"قبیلہ بلی کے دو آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (ہجرت کر کے مدینہ) آ گئے۔ وہ دونوں اکٹھے مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے کی نسبت (نیکی کے کاموں میں) زیادہ محنت کرنے والا تھا' چنانچہ اس محنت کرنے والے نے جہاد کیا اور شہید ہو گیا۔ دوسرا آدمی اس کے بعد ایک سال تک زندہ رہا' پھر وہ فوت ہو گیا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اچانک دیکھا کہ وہ دونوں بھی وہاں موجود ہیں۔ جنت سے ایک آدمی باہر آیا اور اس نے بعد میں فوت ہونے والے کو (جنت میں جانے کی) اجازت دے دی۔ (کچھ دیر بعد) وہ پھر نکلا اور شہید ہونے والے کو جنت دے دی۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "واپس چلے جاؤ' ابھی آپ کا وقت نہیں آیا"۔

صبح ہوئی تو طلحہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خواب سنایا۔ انہیں اس پر تعجب ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو بھی معلوم ہوا اور لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (تفصیل سے خواب کی) بات سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہیں کس بات پر تعجب ہے؟"

انہوں نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دونوں میں یہ شخص زیادہ محنت والا تھا' پھر اسے شہادت بھی نصیب ہوئی لیکن جنت میں دوسرا اس سے پہلے چلا گیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ (دوسرا) اس (پہلے) کے بعد ایک سال تک زندہ نہیں رہا؟"

انہوں نے کہا "جی ہاں!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس نے رمضان کا مہینہ پایا اور اس میں روزے رکھے اور سال میں اتنی اتنی رکعت نماز پڑھی؟"

انہوں نے کہا "جی ہاں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ان دونوں (کے درجات) میں تو آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے سے بھی زیادہ فرق ہے۔"

فوائد و مسائل :

(1) بعض اوقات خواب سے وہی کچھ مراد ہوتا ہے جو خواب میں نظر آیا' جیسے اس خواب کو صحابہ نے حقیقت پر محمول کیا اور اس کی تعبیر کچھ اور نہیں سمجھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اس فہم کی تائید فرمائی۔

(2) مومن کے لیے لمبی زندگی رحمت ہے جب کہ نیکیوں کی توفیق حاصل ہو۔

(3) طویل عرصہ نماز روزے کا ثواب شہادت کے ثواب سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن شہید کے لیے کچھ خاص انعامات ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتے۔

(4) اس حدیث میں ان دو صحابیوں کے جنتی ہونے کی بشارت ہے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے لیے بھی جنت کی بشارت ہے' ویسے بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر جنت کی بشارت دی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد سے واپس تشریف لائے تو ایک آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! میں نے خواب میں ایک سائبان (یا بادل) دیکھا ہے جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ لوگ اس (گھی اور شہد) سے لے رہے ہیں۔ کوئی زیادہ لے رہا ہے کوئی کم اور میں نے ایک رسی دیکھی جو آسمان تک پہنچی ہوئی تھی اور میں نے دیکھا کہ آپ نے اسے پکڑا اور اس کے ذریعے سے اوپر تشریف لے گئے' پھر آپ کے بعد ایک اور آدمی نے وہ رسی پکڑی اور وہ اس کے ذریعے سے اوپر چلا گیا' پھر اس کے بعد ایک اور آدمی نے اسے پکڑا' وہ بھی اس کے ذریعے سے اوپر چلا گیا' پھر اس کے بعد ایک آدمی نے اسے پکڑا تو وہ ٹوٹ گئی۔ پھر وہ رسی جوڑ دی گئی تو وہ اس کے ذریعے سے اوپر چلا گیا۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے اس کی تعبیر کرنے کی اجازت دیجئے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آپ اس کی تعبیر کریں۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"سائبان (یا بادل) تو اسلام ہے۔ اس سے ٹپکنے والا شہد اور گھی قرآن ہے' یعنی اس کی شیرینی اور نرمی ہے اور اس سے لینے والے لوگ کم یا زیادہ قرآن (کا علم و فہم) حاصل کرنے والے ہیں۔ آسمان تک پہنچنے والی رسی سے مراد وہ حق (سچا دین) ہے جس پر آپ قائم ہیں۔ آپ نے اسے پکڑا اور اس کے ذریعے سے بلند ہو گئے (بلند درجات پر فائز ہو گئے) پھر آپ کے بعد ایک آدمی

پکڑے گا اور اس کے ذریعے سے بلند ہو جائے گا۔

پھر دوسرا آدمی بھی اس (کو پکڑ کر اس) کے ذریعے سے بلند ہو جائے گا۔ پھر ایک اور آدمی پکڑے گا تو رسی ٹوٹ جائے گی لیکن پھر جڑ جائے گی اور وہ اس کے ذریعے سے بلند ہو جائے گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آپ نے کچھ صحیح کہا اور کچھ غلطی کی ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کو قسم دے کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے یہ بتا دیجئے کہ میں نے کون سی بات صحیح کہی اور کون سی غلط کہی؟"

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوبکر! قسم نہ کھاؤ۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ بزرگ اور استاد کی اجازت سے عام آدمی یا شاگرد تعبیر بیان کر سکتا ہے۔

2۔ رسی پکڑنے سے مراد دین پر عمل کرنا اور تین بزرگوں کا اس رسی کو پکڑنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور خلافت کے منصب پر فائز ہونا ہے۔

3۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لیے رسی کا ٹوٹ جانا ان مشکلات اور فتنوں کی طرف اشارہ ہے جو انہیں پیش آئے اور اسی رسی کے جڑ جانے کے بعد اس کے ذریعے سے اوپر چلے جانے سے غالباً" یہ اشارہ ہے کہ وہ اس فتنے میں حق پر ہوں گے' لہٰذا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دونوں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی جنت میں ہوں گے۔

4۔ کسی حکمت کی بنا پر خواب کے کچھ حصے کی تعبیر بتانا اور کچھ نہ بتانا جائز ہے' جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعبیر میں واقع ہونے والی غلطی کی وضاحت نہیں فرمائی۔

5۔ اس سچے خواب میں خلفائے ثلاثہ کی عظمت و شان کا اظہار ہے۔

تہجد کی نماز

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غیر شادی شدہ نوجوان لڑکا تھا۔ میں رات کو مسجد میں سویا کرتا تھا۔ ہم میں سے جو کوئی خواب دیکھتا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتا۔ میں نے کہا "یا اللہ! اگر تیرے پاس میرے لیے خیر ہے تو مجھے بھی کوئی خواب دکھا دے جس کی تعبیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کریں' چنانچہ (ایک بار) میں سویا تو میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میرے پاس دو فرشتے آئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ انہیں ایک اور فرشتہ ملا' اس نے (مجھ سے) کہا گھبرا مت۔ وہ دونوں فرشتے مجھے جہنم کی طرف لے گئے۔ دیکھا تو اس کی منڈیر بنی ہوئی تھی جس طرح کنویں کی منڈیر ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس میں کچھ لوگ تھے جن میں سے بعض کو میں نے پہچان لیا' پھر وہ (فرشتے) مجھے دائیں طرف لے گئے۔"

صبح ہوئی تو میں نے یہ خواب (اپنی ہمشیرہ ام المومنین) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو سنایا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عبداللہ نیک آدمی ہے' کاش وہ رات کو نماز تہجد زیادہ پڑھتا۔"

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت سالم رحمتہ اللہ نے فرمایا "اس لیے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ رات کو بہت زیادہ نماز پڑھتے تھے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ایک نوجوان کنوارا آدمی ضرورت پڑنے پر دن یا رات کو مسجد میں سو سکتا ہے۔

2۔ نیک آدمی کی اس انداز سے تعریف کرنا جائز ہے

جس سے اس میں فخر کے جذبات پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو۔

3۔ نیکی کی ترغیب دلانے کے لیے موجود نیکی کا ذکر کر کے کوتاہی بیان کرنا درست ہے تاکہ اصلاح کی ہمت پیدا ہو۔

4۔ اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کا اشارہ ہے۔

جنتی شخص

حضرت خرشہ بن حرافزاری رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ "میں مدینہ منورہ آیا تو مسجد نبوی میں کچھ بزرگ حضرات کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے تشریف لائے تو لوگوں نے کہا۔

"جو کوئی ایک جنتی آدمی کو دیکھنا چاہتا ہے' وہ انہیں دیکھ لے۔"

انہوں نے ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا اور ان سے کہا۔

"کچھ لوگ آپ کے بارے میں اس اس طرح کہتے ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "الحمدللہ! جنت اللہ کی ہے' وہ جسے چاہے گا' اس میں داخل کرے گا۔ (لوگ یہ بات اس لیے کہتے ہیں کہ) میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا گویا ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے کہا "چلیے۔" تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک بڑی شاہراہ پر لے چلا۔ (چلتے چلتے) مجھے بائیں طرف ایک راستہ نظر آیا۔ میں نے اس پر چلنے کا ارادہ کیا تو اس (میرے ساتھی) نے کہا "آپ اس راستے والوں میں سے نہیں۔ پھر مجھے دائیں طرف ایک راستہ نظر آیا۔ میں اس پر چل پڑا حتی کہ میں ایک پھسلواں پہاڑ تک جا پہنچا۔ اس شخص نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اوپر کی طرف اچھال دیا۔ اچانک میں اس (پہاڑ) کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ میں وہاں نہ ٹھہر سکا اور پاؤں نہ جما سکا۔ اچانک دیکھا کہ لوہے کا ایک ستون ہے۔ جس کے بالائی حصے میں سونے کا ایک حلقہ ہے۔ اس شخص نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اوپر اچھال دیا حتی کہ میں نے وہ حلقہ پکڑ لیا اس نے کہا "کیا آپ نے اسے اچھی طرح پکڑ لیا ہے؟" میں نے کہا "ہاں" تو پھر اس نے ستون کو پاؤں مارا (اور گرا دیا) اور میں حلقے کو مضبوطی سے پکڑے رہا۔ (پھر میں بیدار ہو گیا۔)

صحابی فرماتے ہیں۔

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب سنایا تو آپ نے فرمایا۔

"تو نے اچھی چیز دیکھی ہے۔ وہ شاہراہ تو میدان محشر تھی۔ بائیں طرف جو راستہ نظر آیا' وہ جہنمیوں کا راستہ تھا۔ تو اس راستے والوں میں سے نہیں۔ اور جو راستہ تجھے دائیں طرف نظر آیا' وہ اہل جنت کا راستہ تھا۔ وہ پھسلواں پہاڑ شہیدوں کا مقام تھا اور جو حلقہ تو نے پکڑا' وہ اسلام کا حلقہ ہے۔ اسے فوت ہونے تک مضبوطی سے پکڑے رہنا۔" (مسلم)

(اب اس خواب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعبیر کی وجہ سے) مجھے امید ہے کہ میں جنت والوں میں سے ہوں گا۔" (دریافت کرنے پر) معلوم ہوا کہ وہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تھے۔

فوائد و مسائل :

1۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے سے پہلے یہودی مذہب پر تھے اور ان کے بہت بڑے عالم تھے۔

2۔ دین پر مرتے دم تک قائم رہنا نجات کا باعث ہے۔

3۔ شہادت کے منصب کو پھسلواں پہاڑ سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ جس طرح پھسلن والے پہاڑ پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے اسی طرح جہاد کر کے شہادت حاصل کرنا مشکل ہے لیکن وہ پہاڑ کی طرح بلند اور عظیم مقام ہے۔

☼

بیاد محمود ریاض

جاوداں زندگی

تابندہ گوہر قریشی

ان کے جانے سے یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

ایک یونانی فلاسفر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دن کے اجالے میں چراغ لیے گلیوں میں گھس جاتا۔ لوگوں نے اس دیوانگی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا۔

"انسان کو تلاش کرتا ہے۔"

کیا تعجب ہے کہ انسانوں کی اس بھری دنیا میں اسے ایک انسان نہیں مل سکتا تھا۔ حقیقی معنوں میں انسان ملنا بہت ہی مشکل ہے، لیکن یہ دنیا انسانوں سے خالی بھی نہیں۔ انسان مل سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر ہوگی۔ محمود ریاض صاحب ایسے ہی انسان تھے۔ ان کی خاموش انسانی خدمتیں حقیقی انسان ہونے کا ثبوت ہیں۔ مشرقی تہذیب و تمدن، بلند اخلاق، پرانی حسین روایات کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایثار کے صحیح معنی بھی جانتے تھے۔ ان سے مل لینے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کا دل نہ توڑا جائے۔ بڑے نرم دل اور انسان دوست تھے۔ ان کی کن کن باتوں، علمی ادبی کارناموں کا ذکر کریں یا پر خلوص انسان کا۔

غلط نہیں ہے اگر ہم اسے کہیں گوہر
ادب کا مہر جبیں، عظمتِ سخن کا چراغ

یوں تو جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے۔ لوگ مرتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں، لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو کسی خاص مقصد کے لیے وقف ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں سے ایک محمود ریاض صاحب ہیں۔ وہ اگرچہ اب

اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن ان کا نام اور کام ہمیشہ اردو کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ وہ ایک باکمال انشاپرداز، ادیب، صحافی ہونے کے علاوہ نہایت شریف النفس وضع دار اور باہمت انسان تھے۔ ان کی وفات ایک بڑا قومی حادثہ ہونے کے علاوہ ان کے جاننے والوں کے لیے ایک عظیم ذاتی نقصان بھی ہے۔ اب زمانے نے جو رنگ بدلا ہے، اسے دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے محمود ریاض صاحب جیسے مخلص جو بیک وقت اتنی خوبیوں کے حامل ہوں، شاید ہی پھر پیدا ہو سکیں۔

کچھ بھی بجز صدا نہ ملا راہ در میں
ہم دور، دور تک تیری آواز پر گئے

✡ ✡ ✡

وہ محفل شبانہ بدستور ہے مگر
طاہرہ ہم جلیس ہمارے کدھر گئے

محمود ریاض صاحب اس دور کی غیر معمولی شخصیتوں میں ممتاز اور اپنی ایک خاص اور الگ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ان کمیاب انسانوں میں سے تھے جو اپنی ذات میں ایک علامت، ایک روایت، ایک ادارہ، ایک مینارہ نور بن جاتے ہیں۔ زمانے کی مسافتیں جن کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں اور تہذیب کی روشنی جن کے نقش قدم ڈھونڈ کر آگے بڑھتی ہے۔ اردو زبان و ادب کے ایک صاحب طرز انشاپرداز اور محسن کی حیثیت سے ان کا کام ہمیشہ زندہ رہے گا اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کی ایک خاص چیز جس نے ان کو خواص و عام میں ایک خاص مقام پر فائز کر دیا تھا، وہ ان کی طبعی ہمدردی تھی۔ قدرت نے ان کو یہ خوبی بڑی فیاضی سے عطا کی تھی۔ وہ شیرینی و ملائمت کی اس سطح پر تھے، جہاں انسان شہد سے زیادہ میٹھا اور برگ گلاب سے زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ ان کی شخصیت میں شفقت و ہمدردی، مروت، عجز و انکساری، قول و کردار کی روشنی کچھ ایسی تھی کہ ذہن ان کی عظمت کے سامنے جھک

انسانوں کے ساتھ رہے گا۔

مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

محمود ریاض صاحب ایک مضبوط شخصیت تھے۔ وہ پاکستان میں خواتین کے لیے ڈائجسٹ کے بانی تھے۔ وہ ایک خوش قسمت انسان تھے کہ ان کی پہلی کیشنز ان کے بیٹے بڑی خوش اسلوبی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔

ایک کتاب وفا تیرہ و تار راہوں میں گم ہو گئی
ایک صحیفہ نہ جانے کہاں کھو گیا
باب در باب لکھی گئی داستان
جس میں تہذیب و دانش کا بھی ذکر تھا
اور جنوں کی حکایات بھی درج تھیں
وہ قلم کار جس کا صحیفہ ہے یہ
آج ہم میں نہیں ہے، یہی رنج ہے

جس انسان کے لیے سینکڑوں دلوں میں صرف پیار ہی پیار ہے۔ اس ایک انسان کے جانے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سینکڑوں انسان چلے گئے ہوں۔ اگر مجھے کوئی محمود ریاض صاحب کی شخصیت کو ایک جملے میں بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گی کہ وہ "عظمت کا روشن مینار" تھے۔

پیار کے کچے دھاگے میں اب کون پروئے گل
آیا جھونکا ٹوٹا دھاگا، بکھر گئی محفل
بچھڑ گئے سب سنگی ساتھی ڈوب گئی منزل

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو عذاب قبر سے محفوظ رکھے، ان کی مغفرت کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ (آمین ثم آمین)

جاتا ہے، ان کے احترام کی بنیاد محبت پر استوار تھی۔ وہ دلوں کے فاتح تھے۔ اگر وہ ایک مشہور شخصیت نہ ہوتے، تب بھی وہ ایک ایسے انسان ضرور تھے کہ جن کا وجود وسیع زندگی کے لیے نعمت و مسرت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

خاک اڑاتی ہے گلستان میں صبا تیرے بعد
چاک کرتے ہیں گل و لالہ قبا تیرے بعد

یہاں کون ہے جو آکر واپس نہیں گیا؟ انسان بہر حال فانی ہے۔ اسے موت سے، اندھیرے میں گم ہو جانے سے، بے نام و نشان ہو جانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی، لیکن انسان کا کردار لافانی ہے اور انسان کی یہی چیز ایسی ہے۔ جس کے سامنے موت بھی عاجز ہو کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔ محمود ریاض صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ جب تک وہ زندہ تھے۔ ان کی موت کا دھڑکا اور تشویش ان کی ذات سے وابستہ تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو فنا کی آغوش میں دے دیا، وہ لافانی بن گئے، ان کا نام نسلوں تک اور ان کا کام ہمیشہ

بندھن

مدیحہ رضوی ہمراہ حسن نعمان

مدیحہ رضوی

مدیحہ رضوی کی اداکاری نے ہمیشہ ہی متاثر کیا اور جب یہ سننے میں آیا کہ یہ معروف فلم اسٹار "دیبا بیگم" کی بیٹی ہیں تو ہمیں یہ اور بھی اچھی لگیں۔

"بندھن" کے سلسلے میں اس بار مدیحہ رضوی سے آپ کی ملاقات ہے مگر اب یہ مدیحہ حسن ہیں۔ ان کی شادی کو چند ہی ماہ ہوئے ہیں۔

مدیحہ رضوی

"جی جناب کیسی ہیں۔ شادی مبارک ہو۔"

"جی میں ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ۔"

"آج کل کیا ہو رہا ہے۔ کیا مصروفیات ہیں؟"

"آن ایر سیریل "میری ماں" تو آپ سب دیکھ ہی رہے ہیں۔ "میرے مہربان" اس انٹرویو کے آنے تک آن ایر ہو چکا ہو گا اور ایک دو اور سیریل ہیں جن کی شوٹ چل رہی ہے۔ مگر زیادہ کچھ نہیں کر رہی۔"

"کیوں۔۔۔ گھر کی مصروفیات ہیں؟"

"جی۔۔۔ کچھ ہی ماہ تو ہوئے ہیں شادی کو تو گھر کو بھی ٹائم دینا ضروری ہے۔ میری شادی 11 جنوری 2014ء کو ہوئی۔"

"کیا نام ہے میاں صاحب کا اور کیا کرتے ہیں؟"

"جی ان کا نام ہے حسن نعمان اور اسی فیلڈ سے ان کا تعلق ہے۔ آج کل ان کے بھی دو سیریلز آن ایر ہیں۔ "محبت صبح کا ستارہ" اور "کھلا ہے دل کا دروانہ۔"
آپ کو ایک بات بتاؤں کہ حسن معروف آرٹسٹ "رشید ناز" صاحب کے بیٹے ہیں۔"

"اچھا گڈ تو آپ دونوں ہی مشہور لوگوں کے بچے ہیں تو یہ سب کچھ کیسا لگ رہا ہے۔لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے اور بہت چینج محسوس کر رہی ہوں شادی سے پہلے تھوڑی کنفیوز تھی کہ کیا ہوگا لیکن شادی کے بعد تو سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔بالکل نارمل لائف ہے۔"

"کیسے ملاقات ہوئی' کس طرح بات چیت آگے بڑھی؟"

"میری اور حسن کی فیملی کے تعلقات تقریباً" آٹھ سال پرانے ہیں۔ہمارے دوستوں کا پورا ایک سرکل تھا اور ہم سب ایک دوسرے کے بیسٹ فرینڈ تھے۔ شادی کے بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا بس ایسے ہی بات ہوئی اور بس ــــ لو میرج والی بات نہیں ہے۔ دونوں فیملیز کی مرضی سے سب کچھ ہوا میں تو اسے ارینج میرج ہی کہتی ہوں۔"

"پہلے تو حسن نے ہی پروپوز کیا ہوگا پھر فیملی تک بات گئی ہوگی ــــ کوئی ظالم سماج؟"

"بالکل جی ــــ حسن نے بات کی اور پھر فیملی کے گوش گزار کیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا اور جب سوچا تو پھر شادی ہوگئی اور ظالم سماج تو بالکل بھی نہیں آیا۔ کیونکہ میری امی کو اور فیملی کے دیگر لوگوں کو حسن ہمیشہ سے ہی بہت پسند تھے۔ اس لیے کسی نے مخالفت نہیں کی۔"

"جوائنٹ فیملی ہے آپ کی؟ سسرال میں کتنے افراد ہیں؟"

"بہت چھوٹا سسرال ہے میرا تین سال پہلے حسن کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ سسر ہیں۔ اللہ ان کی زندگی رکھے۔ ایک نند ہیں جو آسٹریلیا میں رہتی ہیں۔ گھر میں بس میں' میرے میاں اور سسر جی ہوتے ہیں اس لیے اسے جوائنٹ فیملی تو میں کہہ ہی نہیں سکتی۔"

"لڑکیوں کی تو خواہش ہی ہوتی ہے کہ چھوٹی فیملی ہو اپنا گھر ہو' کسی کی مداخلت نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔"

"شکر ہے میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی بلکہ یہی خواہش تھی کہ اچھی فیملی ہو بے شک بڑی ہو۔ ساس سسر ہوں اور محبت ہو اور ابھی بھی میں بہت خوش ہوں کہ میرے سسر ہیں جن کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ گھر میں کوئی بزرگ ہو اس سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔"

"میاں صاحب کا تعلق پٹھان فیملی سے ہے۔ عموماً" اس فیملی کے مرد تو کام کرتے ہیں شوبز میں مگر اپنی بیٹی بہو کو نہیں کرنے دیتے۔ تو آپ کے ساتھ کچھ مسئلہ ہوا؟"

"بالکل بھی نہیں' بلکہ شادی سے پہلے ہی میرے شوہر اور میرے سسر نے کہہ دیا تھا کہ اس فیلڈ میں کام کرنا یا نہ کرنا تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ ہماری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ تم جب تک کام کرنا چاہو تمہاری مرضی ہے اور میرے سسر تو بہت بڑے سپورٹر ہیں میرے۔ پہلے کام کے سلسلے میں رائے اپنی امی سے لیتی تھی اب اپنے سسر سے لیتی ہوں۔"

"شادی سے پہلے ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا ہوتا ہے۔ مگر ماحول کا پتا شادی کے بعد چلتا ہے اور اس فیلڈ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سوشل ہیں آپ؟"

"پہلے بات سوشل ہونے کی کروں گی۔ میں تقریباً" تین سال سے اس فیلڈ میں ہوں لیکن مجھے سوشل لائف پسند نہیں ہے اس لیے بہت زیادہ ملنا ملانا نہیں تھا اور شادی کے بعد تو میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔ اس سے زیادہ ایکٹویٹی مجھے چاہیے بھی نہیں اور جہاں تک ماحول کی بات ہے تو بالکل ایسا ہی ماحول ہے جیسا میرے اپنے گھر کا تھا۔ مجھے بالکل بھی نہیں لگا کہ میں کسی نئی جگہ پہ آگئی ہوں۔"

"زندگی کون سی اچھی ہوتی ہے شادی سے پہلے والی یا شادی کے بعد والی؟"

"شادی کے بعد والی۔ میں تو سب کو کہوں گی کہ لڑکیوں کی شادی وقت پر کردینی چاہیے۔ کیونکہ شادی آپ کی زندگی کا بہت ضروری پارٹ ہے اور شادی کے بعد مجھے اپنا گھر' شوہر مجھے تمام چیزوں سے پہلے لگتے ہیں۔ یعنی میری پہلی ترجیح میرا گھر اور شوہر ہے۔ میرے والدین اور خود میری بھی خواہش تھی کہ میں اپنی لائف میں جلدی سیٹل ہو جاؤں۔"

"رخصتی کے وقت یا جب شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی تو کیا تاثرات تھے؟"

"شادی سے دو مہینے پہلے میری منگنی ہوئی اور چونکہ ان دنوں میں کام بہت کر رہی تھی تو منگنی کا وقت کیسے گزر گیا مجھے پتا ہی نہیں چلا لیکن جب دلہن بننے کے لیے پارلر گئی تو بس ــــ پھر جب اسلام آباد آگئی تو تب احساس ہوا کہ زندگی میں کچھ تبدیلی آرہی ہے۔ سارا وقت روتے ہی گزرا۔ حالانکہ بچپن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقت آنا ہے مگر جب وقت آتا ہے تو پھر احساس ہوتا ہے۔ پھر میں تو اکلوتی بیٹی ہوں۔ امی ابو کے ساتھ میری بہت زیادہ قربت رہی۔"

"والدین بھی چاہتے ہیں لڑکیوں کی شادی جلدی ہو جائے' خود لڑکیاں بھی' مگر شادی کے بعد میکہ نہیں بھلا پاتیں تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"میرا میکہ لاہور میں ہے اور میں کراچی میں ہوں میں خود بھی چاہتی تھی کہ میکے سے دور رہوں کیونکہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ سسرال ہی میرا گھر ہے اور اب مجھے یہیں رہنا ہے اس سلسلے میں مجھے میرے بڑے بھائی نے جو کہ دبئی میں ہوتے ہیں بہت سپورٹ کیا۔ انہوں نے امی کو بھی سمجھایا کہ آپ اسے زیادہ فون بھی نہیں کریں۔ اسے ایڈجسٹ ہونے دیں۔"

"رسمیں کچھ مختلف تھیں شادی کی؟"

"ہم بنیادی طور پر افغانی ہیں۔ بخارا سائیڈ کے۔ میرا ددھیال ایران کا ہے۔ وہ مائیگریٹ ہو کر پشاور آئے ہم مائیگریٹ ہو کر لاہور آئے تو رسم و رواج میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہاں ایک رسم پٹھانوں میں ہے "چور مہندی" میں مایوں میں تھی کہ رات کے تین بجے ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ یہ لوگ۔ مہندی

لے کر آئے تو میں نے اس اچانک آمد کو بہت انجوائے کیا تھا اور ظاہر ہے میری شادی تھی۔ سو میں نے ہر رسم کو انجوائے کیا۔"

"کھانے پینے کے معاملے میں اور کھانے کے ٹیسٹ کے معاملے میں کیا فرق ہے؟"

"میرے سسرال والے ماشاء اللہ کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ میرے سسر بھی اور میرے میاں بھی اور ذائقے میں یہ ہے کہ جس طرح پنجاب کے لوگ بہت زیادہ مسالے والے کھانے کھاتے ہیں اس طرح یہ زیادہ مسالوں کو پسند نہیں کرتے۔ میں جب سے اس فیلڈ میں آئی تو میں نے بھی زیادہ مسالے کم کر دیے تھے تو پھر مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ میرے سسر صاحب کو اور میرے میاں صاحب کو میرے ہی ہاتھ کے پکے کھانے پسند ہیں۔"

"جہیز کی کوئی ڈیمانڈ؟"

"ارے نہیں۔ یہاں یہ بات میں ضرور سب کو بتانا چاہوں گی کہ میرے میاں نے کمرے کی ہر چیز خود بنائی تھی اور انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ تمہارے گھر سے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تمہارے والدین تمہیں دے رہے ہیں اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی قیمتی چیز نہیں ہے اور چونکہ میں بھی اس فیلڈ میں تھی تو میں نے اپنی شادی پہ اپنے والدین پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالا اور حسن نے بھی اپنے والدین پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ میں نے اپنی شادی خود کی ہے اور جو ورکنگ وومن ہیں ان کو اس بارے میں ضرور سوچنا چاہیے کہ اپنے اخراجات خود اٹھائیں۔"

"عروسی جوڑا اپنے میکے کا تھا یا سسرال کا اور بھاری تھا بہت کیا؟"

"بارات کا میکے سے تھا اور ولیمہ کا سسرال سے تھا۔ میں نے عروسی جوڑا بہت بھاری نہیں بنوایا اس نیت سے کہ بعد میں بھی استعمال کرسکوں اور میں نے بعد میں بھی ایک دو بار پہنا بھی ہے۔"

"حسن مزاج کے کیسے ہیں۔ کڑوے کسیلے ہیں یا نرم ہیں کیونکہ شادی کے بعد ہی کھل کر سامنے آتے ہیں۔"

بے ساختہ ہنستے ہوئے "حسن کو تو میں تقریباً" آٹھ سال سے جانتی ہوں۔ اس لحاظ سے وہ میرے بہترین دوست بھی ہیں ویسے ان کی نیچر ایسی نہیں ہے کہ نہ ہی روایتی شوہر ہیں وہ اس بات کو انڈر اسٹینڈ کرتے ہیں کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی پرابلمز کا علم ہونا چاہیے۔ غصے کے وہ بھی تیز ہیں اور میں بھی بہت تیز ہوں مگر ہم دونوں میں اچھی بات یہ ہے کہ وہ بولتے ہیں تو میں چپ کر جاتی ہوں اور میں بولتی ہوں تو وہ چپ کر جاتے ہیں، ویسے حسن، بہت زیادہ کمپرومائزنگ ہیں۔"

"پانچ ماہ ہوئے ہیں شادی کو ابھی تو دعوتیں ہی چل رہی ہوں گی؟"

"نہیں۔ جب میری شوٹ نہیں ہوتی تو میں کوکنگ کرتی ہوں اور جب حسن کی شوٹ نہیں ہوتی تو حسن کوکنگ کرتے ہیں اور حسن کو سب کچھ بہت اچھا پکانا آتا ہے اور جب ہم دونوں گھر سے باہر ہوتے تو بابا کے لیے کھانا پکا کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ نکال کر گرم کرکے کھا لیتے ہیں۔ حسن تو مجھے زیادہ دیر تک کچن میں کھڑے بھی نہیں رہنے دیتے۔"

"ہنی مون کہاں منایا اور منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

"ہنی مون کے لیے کہیں نہیں گئے کہ کام بہت تھا اور منہ دکھائی میں گولڈ کی چین اور بریسلٹ ملا تھا۔"

"آج کل یہ بحث کافی چل رہی ہے کہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے اور چار شادیوں کی اجازت تو پہلے سے ہی ہے ..... تو کیا کہیں گی اس بارے میں۔"

"میں اللہ کی ذات پر بہت زیادہ یقین رکھتی ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ جو ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔ میری شادی میں میری کوئی کوشش نہیں ہے۔ تو اگر ایسا کچھ ہوتا ہے تو میرا خیال ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے اور اللہ نہ کرے اگر خدانخواستہ وہ یہ محسوس کرے کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہ پا رہا ہے تو میں کچھ بھی نہیں کرپاؤں گی۔"

"اچھی بیوی کی طرح کھانے پہ انتظار کرتی ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔ میں بالکل روایتی بیوی کی طرح ہوں جب تک حسن آ نہیں جاتے میں کھانا نہیں کھاتی اور وہ بھی میرا انتظار کرتے ہیں اور میرے سسر بھی ہم دونوں کے بغیر کھانا نہیں کھاتے اور میں حسن کے زیادہ تر کام خود ہی کرتی ہوں۔ مجھے ان کے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"شادی کے فائدے زیادہ ہیں یا نقصانات؟"

"میرا نہیں خیال کہ نقصانات ہوں گے حسن اپنی ماں کے بہت قریب تھے۔ ان کے انتقال کے بعد وہ اپنے آپ کو بہت اکیلا محسوس کرتے تھے تو میرا خیال ہے کہ ایک مرد بیوی میں ایک ماں بھی ڈھونڈتا ہے محبوبہ بھی ڈھونڈتا ہے۔ شادی کے بعد ان کا اکیلا ہونا کافی حد تک دور ہوگیا ہے۔"

"گھر آکر ایک دوسرے کو سارا دن کی روداد بتاتے ہیں یا؟"

"پہلے تو ہم دونوں ایک دوسرے کو سارا دن کی روداد بتاتے ہیں۔ وہ اپنے سیٹ کی اور میں اپنے سیٹ کی۔ پھر ہم کھانا کھاتے ہوئے اپنی باتیں بھی شیئر کرتے ہیں۔ ساری باتیں ڈائننگ ٹیبل پہ ہی ہوتی ہیں۔"

"ابھی تو کم عرصہ ہوا ہے تو تحفے تحائف کا تبادلہ ہوا؟"

"جی ویلنٹائن ڈے ہم نے منایا تھا۔ حسن کی شوٹ تھی۔ میں گھر پہ تھی تو میں نے گھر کو سجایا تھا اور گفٹ بھی لیے تھے اور وہ شوٹ سے آئے تو انہوں نے بھی مجھے سرپرائز گفٹ دیا۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے ایک دوسرے کی پسند کا اور میں تو پانچ چھ گفٹ اکٹھے دے دیتی ہوں کہ کوئی تو اچھا لگے گا۔"

"کوئی شکوہ کوئی شکایت جو آپ ڈائریکٹ نہ کرسکی ہوں اور انٹرویو کے ذریعے کرنا چاہتی ہوں؟"

"نہیں ایسا کوئی شکوہ نہیں اور اگر کوئی چھوٹی موٹی بات ہو بھی جاتی ہے تو ہم ایک دوسرے سے ڈائریکٹ ہی کرلیتے ہیں اور یہ بہت ضروری ہے۔ دل میں کوئی

بات نہیں رکھنی چاہیے۔"

"جن کی شادیاں نہیں ہوتیں ان کے لیے کچھ کہنا چاہوں گی؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ میاں بیوی والا ریلیشن مکمل طور پر خدا کی رضامندی سے ہی وجود میں آتا ہے یا قائم ہوتا ہے کیونکہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں شادی آپ کی ترجیحات میں شامل ہونی چاہیے۔ اس کو اتنا معمولی نہیں لینا چاہیے۔"

"اور آخری سوال کہ کمرے میں آکر حسن نے پہلا جملہ کیا کہا تھا؟"

سوچتے ہوئے۔ "ہاں ۔۔۔ پہلا جملہ یہ کہا تھا کہ ایزی ہو جاؤ، چینج کرلو پھر باتیں کرتے ہیں۔ اتنی ٹینشن میں کیوں بیٹھی ہو۔"

حسن نعمان

"جی آپ کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟"

"جی جیسا کہ مدیحہ نے آپ کو بتایا ہی ہو گا کہ میرا نام حسن نعمان ہے۔ پشاور سے میرا تعلق ہے۔ میری

ایک بہن ہے، جو آسٹریلیا میں رہتی ہے اور میں اکلوتا بیٹا ہوں۔"

"آپ کے والد بھی معروف آرٹسٹ، بیگم بھی اور آپ خود بھی۔ سب کچھ کیسا لگتا ہے؟"

"بہت اچھا۔۔۔ مگر گھر میں ہم آرٹسٹ نہیں ہوتے بلکہ عام لوگوں کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی اور ایک ہی شہر میں ہوئی؟"

"جی دھوم دھام سے ہوئی، کیونکہ اکلوتا بیٹا ہوں' 11 جنوری 2014ء کو شادی ہوئی اور ہماری مہندی بارات لاہور میں اور ولیمہ اسلام آباد میں پھر رخصت ہو کر پشاور لے گیا کیونکہ ہمارے زیادہ تر رشتے دار پشاور میں ہوتے ہیں، پھر ایک ہفتہ کے بعد ہم کراچی آ گئے۔"

"ہنی مون پہ گئے؟"

"نہیں گئے، کیونکہ ہم نے شادی کی تیاری کے لیے پہلے ہی چھٹیاں لے لی تھیں تو پھر مزید کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے کراچی آتے ہی اپنے کام پہ واپس آ گئے تھے۔ ان شاء اللہ ہنی مون پہ بھی جائیں گے۔"

"کام کی بات ہو رہی ہے تو کیا بیوی کو بھی کمانا چاہیے؟"

"میں ضروری نہیں سمجھتا لیکن اگر بیوی پڑھی لکھی ہے اور اس کو کام کا شوق ہے تو وہ ضرور کام کرے، ضرور کمائے، مدیحہ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔"

"شادی ضروری ہے۔۔۔ یا کچھ نقصانات بھی ہیں؟"

"میرا نہیں خیال کہ شادی کے کچھ نقصانات ہیں، بلکہ یہ تو شرعی فریضہ ہے، ضرور کرنی چاہیے۔ لائف سیٹل ہو جاتی ہے۔ فیملی بن جاتی ہے۔ اکیلے رہنے سے بہتر ہے کہ آپ کا کوئی لائف پارٹنر ہو، ایک گھر ہو، جہاں آپ کو آکر سکون ملے، کوئی آپ کا انتظار کرے، کوئی آپ کا خیال رکھے۔"

"ڈرامے میں جب مدیحہ رومانٹک رول کرتی ہیں یا کسی کا ہاتھ پکڑتی ہیں تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

"اس وقت وہ میری بیوی نہیں ہوتی بلکہ ڈرامے کا ایک کردار ہوتی ہے اور میری بیوی کو پتا ہے کہ اس کی کیا حدود ہیں۔ اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا میرے لیے۔"

"مدیحہ کس روپ میں اچھی لگتی ہے اور کیا بیوی کا خوب صورت ہونا ضروری ہے؟"

"خوب صورتی ایک ایکسٹرا کوالٹی ہے۔ لیکن میں اندر کی سیرت کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ لڑکی خوب سیرت ہو گی تو وہ ریلیشن شپ کا بھی خیال رکھے گی اور گھر کو بھی بنا کر رکھے گی۔ رہی روپ کی بات تو مجھے مدیحہ میک اپ کے بغیر اور گھر کے عام لباس میں اچھی لگتی ہے۔"

"آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے پکارتے ہیں اور اگر مدیحہ روٹھ کر میکے چلی جائے تو کیا ری ایکشن ہو گا آپ کا؟"

"ہم دونوں ایک دوسرے کو نام لے کر ہی بلاتے ہیں اور اول تو مدیحہ روٹھ کر میکے جائے گی ہی نہیں اور اگر چلی گئی تو میں فوراً"منالوں گا اور اسے لینے چلا جاؤں گا۔"

"مدیحہ کی کوئی اچھی عادت بتائیں؟"

"بہت سی اچھی باتوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مدیحہ جھوٹ نہیں بولتی۔ صاف گو ہے۔ جو شکوے شکایت ہوتے ہیں، منہ پر بول دیتی ہے اور مجھے اس کی اس عادت نے ہی اس سے شادی کرنے پر مجبور کیا۔"

"محبت صبح کا ستارہ" اور "دل کا دروازہ" میں کون سا کردار اپنی شخصیت کے قریب دیکھتے ہیں۔"

"کوئی بھی نہیں۔ دونوں نیگیٹو رول ہیں جبکہ میں ایک شریف انسان ہوں۔" قہقہہ

اس کے ساتھ ہی ہم نے اس نئے جوڑے سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

مائرہ خان

"کیا حال ہیں جی؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"اسکرین سے غائب ہو؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں۔ تھوڑا بہت گیپ تو آ ہی جاتا ہے اور ایسا نہیں کہ بالکل غائب ہوں، کسی نہ کسی چینل پہ نظر آ ہی رہی ہوتی ہوں۔"

"جیسے گزشتہ دنوں مارننگ شو میں نظر آئیں۔"

"جی جی بالکل۔۔۔ شائستہ لودھی کے پروگرام میں۔"

"کیسے لگتے ہیں مارننگ شوز تم خود بھی تو مارننگ شوز کر چکی ہو؟"

"جی میں خود بھی مارننگ شو کر چکی ہوں اور سچ پوچھیں تو مارننگ شو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ صبح صبح اٹھنا، تیار ہونا پھر پروگرام کرنا۔۔۔ مگر اچھا بھی لگتا تھا۔ اسی طرح دوسروں کو بھی مشکل ہوتی ہو گی مگر کچھ بھی ہو، بندہ صبح صبح فریش ہو جاتا تھا۔"

"تم رونے کے سین بہت اچھے کرتی ہو، کیا سچ مچ رونا آتا ہے یا گلسرین کا کمال ہوتا ہے؟"

"ارے نہیں، میرا دل بہت چھوٹا ہے۔ بہت جلدی جذباتی ہو جاتی ہوں اور جو زندگی میں کچھ سہتے ہیں، ان کے دل چھوٹے ہوتے ہی ہیں۔ گلسرین کا استعمال ذرا کم ہی کرتی ہوں۔"

"زندگی میں دھوکے کھائے یا دھوکا؟"

"دھوکے کھائے۔۔۔ اور دھوکے تو انسان ساری زندگی کھاتا ہے۔ تب ہی کندن بنتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ گڈ۔۔۔ مگر کیا یہ چیز انسان کو زندگی سے بد دل نہیں کر دیتی؟"

"ہاں۔۔۔ انسان بد دل تو ہو جاتا ہے۔ مگر زندگی میں تکالیف سہہ کر ہی انسان کچھ سیکھتا ہے۔ میں نے بھی زندگی کا بہت تلخ دور دیکھا ہے لیکن ان تجربات نے مجھے بہت کچھ سکھایا بلکہ جینا سکھایا۔"

"اب مطمئن ہیں اپنے زندگی سے؟"

"الحمدللہ۔۔۔ میری زندگی میں اب اطمینان اور سکون ہے۔"

"اور غصہ کچھ کم ہوا۔۔۔؟"

ہنستے ہوئے "جی جی۔۔۔ غصہ پہلے بھی زیادہ نہیں تھا"

اب بھی نہیں ہے۔ بس مجھ میں ایک خاص بات ہے کہ جھوٹ برداشت نہیں کر سکتی اور اس وقت تو اور بھی زیادہ غصہ آتا ہے جب کوئی میرے منہ پر جھوٹ بولے..... جھوٹ بولنے والا سمجھتا ہے کہ جیسے سامنے والا بےوقوف ہے۔"

"پھر ان شاء اللہ بات کریں گے جب آپ کا کوئی نیا سیریل آئے گا۔"

"جی ضرور۔"

اشیتا محمود

اشیتا کو آپ ایک عرصے سے اسکرین پہ دیکھ رہے ہیں۔ مگر ہم آج تک ان کا انٹرویو نہیں کر پائے۔ کیونکہ یہ مصروف بہت رہتی ہیں۔ مگر یوں ہی تھوڑی بات ہو ہی جاتی ہے۔

"آپ بہت اچھی پرفارمر ہیں۔ کس سے سیکھا آپ نے؟"

"ارے نہیں، میں نہیں سمجھتی کہ ٹریننگ لینے سے کوئی انسان فنکار بنتا ہے۔ میرا اپنا نظریہ تو یہ ہے کہ فنکار پیدائشی ہوتا ہے اور میں اپنے لیے بھی یہی کہوں گی کہ میں ایک بورن آرٹسٹ ہوں اور اس کے لیے میں اپنے رب کی بڑی شکر گزار ہوں۔"

"اور اگر یہ صلاحیت نہ ہوتی تو آپ آج کیا ہوتیں؟"

"تو پھر شاید میں انٹیریر ڈیزائنر ہوتی، کیونکہ میرا مائنڈ بہت کری ایٹو ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کرداروں کے لیے میں عموماً" اپنے ذہن سے ہی سوچتی ہوں۔"

"ہوں..... نوجوان لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ لیڈنگ رول کریں۔ مگر آپ کبھی لیڈ رول میں تو کبھی سیکنڈ لیڈ رول میں۔ جیسے امیرزادی میں آئی تھیں..... ایسا کیوں؟"

"میں کردار کو اہمیت دیتی ہوں، فرسٹ یا سیکنڈ کو نہیں۔ میں نے اپنی جگہ بنانے کے لیے ابتدا میں چھوٹے رول بھی کیے، کیونکہ میں سیکھنے کے عمل سے گزر رہی تھی اور میں نے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ اس لیے آج کامیاب ہوں۔"

"بہت کم اسکرین پہ نظر آتی ہیں۔ کیا کچھ دیگر مصروفیات بھی ہیں آپ کی؟"

"بالکل جی! دیگر مصروفیات بھی ہیں۔ فلم بھی کر رہی ہوں اور اسکرین پہ اس لیے ذرا کم نظر آتی ہوں کہ میرے لیے ضروری ہے کہ اسکرپٹ جان دار ہو، میرا رول اچھا ہو اور جس کے ساتھ کام کر رہی ہوں وہ ٹیم اچھی ہو تب ہی کام کرنے کا مزا بھی آتا ہے۔"

"کس فلم میں کام کر رہی ہیں، کچھ بتائیں گی؟"

"فلم کا نام مور ہے۔ قدیم بنگالی کہانی ہے۔ ان کے لائف اسٹائل پہ..... کہانی میں سسپنس بہت ہے اور پرفارمنس کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ ان شاء اللہ یہ فلم میرے کیریر کو مزید آگے لے کر جائے گی اور ناظرین بھی اسے پسند کریں گے۔"

"پھر مزید آفرز آئیں تو کوئی ڈیمانڈ ہوگی؟"

"پھر مزید آفرز آئیں تو وہی ڈیمانڈز ہوں گی جو ڈراموں کے لیے ہوتی ہیں کہ اچھا اسکرپٹ، اچھا کردار۔"

"جب ایک ہی ڈرامے میں دو تین ہم عمر فنکارائیں کام کر رہی ہوں تو کیسا لگتا ہے؟"

"اچھا لگتا ہے۔ اگر آپ اداکاری کے لحاظ سے بات کر رہی ہیں تو پھر مقابلے کی فضا بڑھ جاتی ہے اور مقابلہ میرے خیال سے ایک صحت مند رجحان ہے تو بس اچھا بھی لگتا ہے اور یہ بھی دل چاہتا ہے کہ ہم سب سے بہتر کہلائیں۔ ایسے موقع پر ہماری دوستیاں بھی مزید پکی ہو جاتی ہیں۔"

"ایک دوسرے کی خوبیاں خامیاں بتاتی ہیں یا چلنے دیتی ہیں، جیسا چل رہا ہوتا ہے۔"

"نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو مشورہ بھی دیتی ہیں کہ اس طرح نہیں اس طرح ہونا چاہیے۔ اگر مشورہ پسند آئے تو اچھا لگتا ہے ورنہ کوئی بات نہیں۔"

"قسمت پر یقین ہے؟"

"سو فیصد..... میرا ایمان ہے کہ مقدر سے زیادہ کچھ نہیں ملتا انسان کو۔ جتنا نصیب میں لکھا جا چکا ہے اتنا ہی ملے گا نہ کم نہ زیادہ..... بس ایمان پختہ ہونا چاہیے۔"

"حلقہ یاراں زیادہ ہے یا حلقہ احباب زیادہ ہے؟"

"حلقہ احباب تو زیادہ ہے ہی حلقہ یاراں ذرا سوچ سمجھ کر بناتی ہوں کہ کم دوست ہوں مگر اچھے اور مخلص ہوں۔ وہی بات ہے نا کہ ایک ہو پر نیک ہو۔"

"اس فیلڈ میں مرد حضرات سے پالا پڑتا رہتا ہے، کوئی بات جو کہنا چاہیں؟"

"ہوں..... یہ اچھا سوال کیا آپ نے..... میں یہی کہنا چاہوں گی کہ عورت کی عزت کریں..... یہ نہیں کہ خوب صورت خواتین کے ساتھ آپ کا رویہ کچھ اور ہو اور نارمل خواتین کے ساتھ کچھ اور....."

عائشہ خان (جونیئر)

"کیا حال ہیں؟ "شک" میں بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں۔ آپ کو کیا رسپانس مل رہا ہے۔"

"جی حال ٹھیک ہے۔۔۔ اور واقعی "شک" بہت اچھا سیریل ہے اور رسپانس بھی بہت اچھا مل رہا ہے۔ بس اب تو اس کی اینڈنگ چل رہی ہے۔"

"کیا ہوگا انجام؟"

"چھوڑیے یہ کیوں بتاؤں۔ پھر تو سارا سسپنس ہی ختم ہو جائے گا اور ویسے بھی جب اتنی ساری اقساط دیکھ لی ہیں تو دو چار اور سہی۔"

"کس سیریل میں اپنا رول مشکل اور چیلنجنگ لگا؟"

سوچتے ہوئے۔۔۔ "ہاں مجھے یاد آیا ڈرامہ سیریل "خاموشیاں" میں میں نے ایک نفسیاتی عورت کا رول کیا تھا اور وہ واقعی ایک مشکل رول تھا جس کو کرتے وقت مجھے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔"

"اور باقی دیگر؟"

"میرے سارے ہی سیریل بہت کامیاب گئے۔ "شک" آپ دیکھ رہی ہیں "مجھے خدا پہ یقین ہے" میں بھی میرا رول بہت مختلف تھا اور کئی روپ لیے ہوئے تھا۔"

"کینیڈا سے واپس آکر آپ کو امید تھی کہ آپ کو ویلکم کیا جائے گا۔"

"بس ایک امید تھی، یقین نہیں تھا' کیونکہ میں دیکھتی تھی کہ کافی نئی لڑکیاں آچکی ہیں اور اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔ بہت اچھا کام بھی کر رہی ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ جب میں آئی تو مجھے وارم ویلکم ملا اور ایک سے ایک اچھی آفرز آنے لگیں۔"

"بس جب اوپر والا مہربان ہو تو سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ اب تک کیے گئے کاموں میں اپنے کام سے مطمئن ہیں؟"

"وہ بڑے کہتے ہیں ناکہ مطمئن ہونا فنکار کی موت ہے تو میں ابھی اس فیلڈ میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اور ہر بار پہلے سے زیادہ محنت کرتی ہوں تاکہ کام مزید اچھا ہو۔"

"اور دیگر مصروفیات کیا ہیں؟"

"ابھی کچھ بتا نہیں سکتی۔ آن ایر آئیں گے سیریلز تو سب کو پتا چل جائے گا۔"

تصحیح

پچھلے ماہ افسانہ "دائرہ" کی مصنفہ کا نام سہواً "یمنیٰ رضا" شائع ہوگیا۔ جبکہ یہ کہانی اہمل رضا نے تحریر کی تھی قارئین تصحیح کرلیں۔

ممتاز قریشی سے ملاقات

شاہین رشید

اچھے رشتوں کا حصول ہر زمانے میں ایک دشوار ترین امر رہا ہے۔ چندے آفتاب' چندے ماہتاب ڈھونڈنے میں محاورتاً نہیں حقیقتاً "جوتیاں گھس جایا کرتی تھیں۔ تاہم میرج بیورو کے قیام نے اس پریشانی میں خاطر خواہ کمی کی ہے۔ خدمت خلق کے ایسے ہی ایک ادارے کی سربراہ سے ہم آج آپ کا تعارف کروا رہے ہیں۔

"کیسی ہیں آپ اور کیا مصروفیات ہیں' سارا دن کیسا گزرتا ہے آپ کا؟"

"بس جی اللہ کا شکر ہے اور دن تو سارا وقت کام کرتے ہی گزر جاتا ہے۔ سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔"

"آپ کے ادارے کا کیا نام ہے' کام کیا ہے اور آپ یہاں کس عہدے پر فائز ہیں؟"

"ہمارے ادارے کا نام کلفٹن وومن ویلفیئر سوسائٹی ہے اور اس کا قیام 1982ء میں عمل میں آیا۔ میں اس ادارے کی صدر بھی ہوں اور چیئرپرسن بھی۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ خواتین کی ویلفیئر کا ادارہ ہے۔"

"کیسے خیال آیا اس ادارے کے قیام کا؟"

"مجھے ہمیشہ سے ہی شوق رہا ہے خواتین کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کا اور اس ادارے کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا۔ اصل مقصد "میرج بیورو" کے قیام کا بھی تھا۔ بہت مسائل میں دیکھتی تھی لڑکیوں کی شادی کے سلسلے میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کوئی ایسا ادارہ نہیں جو اس قسم کے کام کر رہا ہو تو پھر میں نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا اور ساتھ ہی اس کام کا بھی کہ اگر ملک میں کوئی کرائسسز آتے ہیں' جیسے سیلاب' زلزلہ اور طوفان وغیرہ۔۔۔ تو ہم بروقت اپنے لوگوں کی مدد کر سکیں۔ پھر غریب لڑکیاں جن کو جہیز کے مسائل ہیں یا جن کے بچے پڑھنا چاہتے ہیں' ان کے لیے بھی ہم کام کرتے ہیں۔ نہ صرف پڑھائی کے سلسلے میں بلکہ روزگار کے سلسلے میں بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ ہم نے بھکر میں پرائمری لیول پہ بیس سال سے ایک اسکول کھولا ہوا ہے جہاں غریبوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔"

"اپنا ادارہ اسٹیبلش کرنے میں آپ کو کتنے سال لگے؟ اور میرج بیورو کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟"

"جس دن ادارے کا قیام عمل میں آیا' اس کی رجسٹریشن ہوئی' اسی دن اسٹیبلش ہونا شروع ہوگیا۔ ویسے ہمارا بنیادی کام میرج بیورو ہی ہے اور یہ کام ہم ویلفیئر کے طور پر ہی کرتے ہیں۔ پہلے رجسٹریشن کرانا پڑتی ہے جس کی فیس انتہائی کم ہوتی ہے اور اس فیس کو بھی اگر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا تو ہم اور کم کر دیتے ہیں اور بعض اوقات فری بھی کر دیتے ہیں۔ پہلا آفس کلفٹن میں کھولا چار سال کے بعد گلشن اقبال میں بھی اپنے ادارے کی ایک شاخ کھول لی اور یوں کلفٹن میں ہمیں اکتیس سال ہو گئے ہیں اور گلشن میں تقریباً اٹھائیس سال۔"

"رجسٹریشن فیس کیا ہے آپ کی اور شادی کے بعد کتنا لیتی ہیں؟"

"کلفٹن میں ہماری رجسٹریشن فیس پچیس سو ہے

جبکہ گلشن اقبال میں دو ہزار ہے۔ شادی کے بعد کوئی فیس نہیں ہے۔ اگر کوئی خوشی سے دینا چاہے تو پھر وہ ہماری ویلفیئر کو دے دیتا ہے لوگ ڈونیشن بھی دیتے ہیں۔ لوگ خوش ہو کر کپڑے یا دیگر چیزیں بھی دے جاتے ہیں۔ میرے فارم کی حتمی میعاد چھ ماہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر اندر کام ہو جائے تو ٹھیک ورنہ پھر دوبارہ رجسٹریشن کرانی پڑتی ہے۔"

"آپ گارنٹی دیتی ہیں اس بات کی کہ آپ نے رجسٹریشن کروائی ہے تو آپ کے بیٹے یا بیٹی کی شادی لازمی ہو جائے گی؟"

"نہیں ہم گارنٹی کسی کو بھی نہیں دیتے۔ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ ہم اپنی پوری کوشش کریں گے۔ آگے آپ کا نصیب۔"

"لوگ مطمئن ہیں آپ کے کام سے؟ کبھی کسی نے کوئی شکایت کی آپ سے یا آپ کے ادارے سے؟"

"مجھ سے پوچھیں گے تو میں تو یہی کہوں گی کہ لوگ سو فیصد مطمئن نظر آتے ہیں اور اگر کسی کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو ہم ان کو کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آپ اپنی فیس واپس لے لیں اور ہمیں معاف کر دیں۔ مگر ایسے کیس ذرا کم ہی ہوتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ آتے ہیں اور بڑی عزت سے بات کرتے ہیں۔"

"کچھ یاد ہے' جب پہلی شادی آپ نے کرائی تھی تو وہ ابھی تک کامیاب چل رہی ہے اور لوگ شادی کے بعد بھی آپ سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"اتفاق سے میرے جو پہلے کلائنٹ تھے۔ ان کی ماشاءاللہ تین بیٹیاں ہیں۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی ہیں ایسا سات آٹھ سال سے ہو رہا ہے کہ جن کی شادیاں میں نے کرائی تھیں' ان کے بچوں کی شادیاں بھی میں ہی کروا رہی ہوں۔"

"لوگوں کو میرج بیورو کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے' کیا خاندان میں رشتے نہیں ہوتے یا اچھے رشتے نہیں آتے؟"

"پہلے میرج بیورو نہیں ہوتے تھے۔ محلے کی یا خاندان کی کچھ عورتیں رشتے کرانے کے کام کرتی تھیں۔ اب کوئی کسی کے لیے پریشان نہیں ہوتا۔ کوئی کسی کے لیے کوشش نہیں کرتا باتیں ضرور بناتے ہیں مگر آگے بڑھ کر کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ایسے میں میرج بیورو کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"عموماً" لڑکے اور لڑکی کے گھر والے آتے ہیں تو ان کی کیا ڈیمانڈ ہوتی ہے؟"

"دونوں کی ڈیمانڈز عموماً" اچھی تعلیم ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ لڑکی گھریلو ہو۔ لڑکے والے تو اپنے اسٹینڈرڈ سے اونچا اسٹینڈرڈ چاہتے ہیں اور خوب صورت لڑکی تو ہر ایک کو چاہیے ہوتی ہے میں بڑی حیران ہوتی ہوں کہ اکثر ایسی ماں بہنیں جو خود تو نارمل شکل کی ہوتی ہیں مگر ان کی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ ہمیں اپنے بیٹے کے لیے خوب صورت لڑکی چاہیے اور اونچے قد کی بھی بہت ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ لوگ کم عمر لڑکی بھی مانگتے ہیں۔"

"ایک رشتہ کرانے میں عموماً" کتنا ٹائم لگ جاتا ہے؟"

"ٹائم کی کوئی لمٹ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ایک ہفتے میں بھی رشتہ پکا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات چار سے پانچ سال بھی لگ جاتے ہیں۔ پھر انہیں بار بار رجسٹریشن کرانی پڑتی ہے۔ سب نصیب سے ہوتا ہے انسان کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ میں اکثر اخباروں میں رشتوں کے اشتہار پڑھتی ہوں' جس میں لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اس طرح کے کوئی اشتہار نہیں دیتی۔ مجھ پر اور میرے ادارے پر اللہ کا بڑا کرم ہے۔ میرے اشتہارات مشہور اخباروں میں آتے ہیں۔ میں کسی کو جھوٹی امید نہیں دلاتی کہ ہمارے پاس بے شمار رشتے ہیں اور ہم دنوں میں رشتہ کرا دیں گے۔ جو لڑکی اٹھائیس سے تیس سال کی ہوتی ہے' ان کے والدین سے صاف کہہ دیتی ہوں کہ اس عمر کی لڑکی کے لیے رشتے بہت کم ہوتے ہیں۔ میں عموماً" پچیس سال کے اندر اندر عمر والی لڑکیوں کو رجسٹرڈ کرتی ہوں۔"

"کیا بات ہے کہ جو لڑکیاں تیس سال یا اس سے اوپر کی ہوتی ہیں ان کے لیے رشتوں کی مشکل ہوتی ہے اور ایک چالیس پینتالیس سال کے مرد کے لیے رشتے آسانی سے مل جاتے ہیں؟"

"اس کی مثال آپ کو یوں دوں گی کہ ایک چھوٹا مکان ہوتا ہے اس کے کرائے دار بہت مل جاتے ہیں اور جو بڑا ہوتا ہے اس کے کم اور جو اور بڑا ہوتا ہے اس کے مزید کم ہو جاتے ہیں۔ عمر کا بھی وہی حساب ہے۔ چھوٹی لڑکیوں کے لیے رشتے جلدی مل جاتے ہیں۔"

"جہیز کی ڈیمانڈ کرتے ہیں لڑکے والے؟"

"جہیز کی ڈیمانڈ کھلے لفظوں میں تو نہیں کرتے' لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ ہمارا لڑکا چاہتا ہے کہ چونکہ میں اچھی پوسٹ پر ہوں تو اچھے گھر میں اور اچھے لوکیشن والے علاقے کی لڑکی ہو۔ تو ایک لحاظ سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر بڑے اور اچھے خاندان کی لڑکی ہوگی تو جہیز میں بھی کچھ نہ کچھ لے کر آئے گی۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے دو گھروں کو متعارف کروایا اور پھر انہوں نے رشتہ بھی طے کر لیا مگر آپ کو نہیں بتایا؟"

"کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ رشتہ طے ہو جاتا ہے اور بتاتے نہیں۔ دیکھو! میرا کوئی اسٹیٹ ایجنسی والا کام تو ہے نہیں کہ مکان کرائے پر چڑھایا تو کمیشن بھی چاہیے' تو میں نے جب شادی طے ہونے کے بعد پیسے لینے ہی نہیں ہوتے تو میں کیوں شکوہ کروں۔ اگر وہ بتا دیتے ہیں تو یہ ان کا بڑا پن ہوتا ہے اور جو نہیں بتاتے تو ان سے کچھ نہیں کہتی۔"

"اس فیلڈ میں پیسہ ہے؟"

"اس فیلڈ میں بہت پیسہ ہے' لوگ دھوکے بازی سے بہت کماتے ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پیسے کے لالچ میں کام کرتے ہیں۔ لوگ لڑکی والوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور بہت پیسہ کماتے ہیں۔"

"کیا لڑکے اور لڑکیاں خود بھی آتے ہیں کہ ہماری شادی کرا دیں؟"

"میں عموماً" ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی کیونکہ اگر کل کو خدانخواستہ کوئی اسکینڈل بن گیا تو پھر مجھ پر بھی الزام آئے گا۔ لیکن اگر کوئی بڑی عمر کی لڑکی ہے' وہ بیوہ ہے یا طلاق یافتہ ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ سب کچھ ہینڈل کر سکتی ہے تو پھر میں اس کے ساتھ تعاون کرتی ہوں ورنہ اکیلے آنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔"

"کچھ یاد ہے کہ اب تک کتنے لڑکے اور لڑکیوں کے رشتے کرا چکی ہیں' کتنی کامیاب ہوئیں اور کتنی ناکام؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل بھی یاد نہیں ہے اور ہزاروں شادیاں کرا چکی ہوں۔ خود سوچیں کہ بیس سال ہو گئے اس کام کو تو کتنی شادیاں ہو چکی ہوں گی اور کامیابی کا جو ریشو آج کل چل رہا ہے۔ اسی حساب سے کامیابیاں ہوتی ہیں اور میں تو کامیابی کی گارنٹی نہیں لیتی کیونکہ میں تو دو گھروں کا تعارف کرا دیتی ہوں۔ باقی کام ان کا ہوتا ہے۔"

"آج کل طلاق کا ریشو بہت بڑھ گیا ہے۔ کبھی ناکام شادی شدہ جوڑا بھی آیا جس کی شادی آپ کی وجہ سے ہوئی تھی؟"

"جی ہاں ناکام والے بھی آتے ہیں کہ دوبارہ شادی کرا دیں۔"

"اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"جب میری شادی ہوئی میں نے انٹر کیا ہوا تھا۔ شادی کے بعد گریجویشن کیا اور پھر پرائیویٹ ایم اے جرنلزم کیا۔ میرے شوہر جرنلسٹ ہیں۔ ان کا نام فضل قریشی ہے اور وہ پی پی آئی نیوز ایجنسی کے منیجنگ ڈائریکٹر رہ چکے ہیں چیف ایڈیٹر بھی رہے ہیں اور نیوز ویک کے بھی نمائندے رہے ہیں۔ میری شادی 1963ء میں ہوئی تھی۔ پچاس سال ہو گئے ہیں میری شادی کو

میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا عامر قریشی امریکا میں انجینئر ہے۔ اس کی بیگم بھی پڑھی لکھی ہے اور کام کرتی ہے۔ اور دوسرا بیٹا عمران قریشی ہے۔ اس نے ایم بی اے کیا ہے۔ آئی سی آئی کمپنی میں بزنس منیجر ہے۔ لاہور میں رہتا ہے ــــ امریکہ کے شہر کیلی فورنیا میں میری بہن بھی یہی کام کرتی ہے تو ہمارا ایک آفس وہاں بھی ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں اور کیا فارغ وقت آپ کو مل جاتا ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے فارغ وقت مل جاتا ہے اور فارغ وقت میں گھر کی ذمہ داریاں پوری کرتی ہوں۔ کچھ اپنے ویلفیئر کے کام میں مصروف رہتی ہوں اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ بس اللہ تعالیٰ میری کاوشوں کو قبول کرنے والا ہے۔"

"کھانا وغیرہ کھانے گھر سے باہر جاتی ہیں اور فضول خرچ ہیں؟"

"ہاں بالکل جاتی ہوں اور جب کبھی کھانے کا بل تین ہزار آجائے تو سوچتی ہوں کہ اس میں تو ایک غریب آدمی کا راشن آسکتا ہے۔ میں فضول خرچی سے بہت گھبراتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ نہ کروں مگر بعض اوقات فضول خرچی کرنی پڑتی ہے ــــ میں جب شہر سے باہر یا ملک سے باہر جاتی ہوں تو لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ بزنس کلاس میں جایا کریں۔ آپ نے کیا کرنا ہے پیسہ جوڑ کر تو میں کہتی ہوں کہ جو پیسہ میں نے بزنس کلاس میں لگانا ہے' وہی پیسہ میں کسی کی مدد کے لیے نہ لگادوں۔ اگر پانچ چھ گھنٹے میں نے تکلیف میں گزار کر سفر کرلیا تو کیا ہوا۔ وہی پچاس ساٹھ ہزار میں کسی ضرورت مند کو دے دوں تو اس کا کتنا فائدہ ہو جائے گا ــــ بس میں تو اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ میرے رزق حلال میں برکت دے اور رزق حلال کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرما۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی آپ اس انٹرویو کے ذریعے؟"

"سب سے درخواست کروں گی کہ خدا کے لیے شادی کے موقع پر بے جا اصراف نہ کیا کریں۔ یہی پیسہ جو آپ نے فضول رسموں میں لگانا ہے۔ اس میں کسی غریب لڑکی کی مدد کردیجئے اور یہ صبح کے وقت مارننگ شوز میں جو رسومات دکھائی جاتی ہیں' جو فیشن دکھایا جاتا ہے خدارا یہ نہ دکھایا کریں۔ اس سے غریب گھرانے کی لڑکیاں ڈپریشن کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کا بھی دل چاہتا ہے کہ ان کے پاس اتنا پیسہ ہو اور وہ بھی یہ سب کچھ کریں۔ مقابلے بازی میں لوگوں نے اپنے اخراجات بڑھا لیے ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"اور ایک شادی شدہ جوڑے کی بار بار شادی کرانے سے تو بہتر ہے کہ مارننگ شو میں کسی ضرورت مند کی سچ مچ شادی کرادی جائے؟"

"بالکل ایسا ہونا چاہیے۔ مگر کیا کریں کہ شو بازی سے یہ لوگ باز ہی نہیں آتے۔ ہمارا ملک غریب ہے اور ملک کے جو حالات ہیں' ہمیں ان کو دیکھ کر آگے چلنا چاہیے اور ہمیں اپنے پروگراموں میں بھی اس بات کو اجاگر کرنا چاہیے تاکہ لوگوں میں احساس کمتری نہ ہو۔"

"سیاست سے دلچسپی ہے آپ کو؟"

"بہت زیادہ۔ مسلم لیگ نون کے لیے بہت کام کیا میں نے۔ مسلم لیگ نون ونگ کی صدر بھی رہ چکی ہوں اور ابھی بھی میں ان کے ساتھ ہوں لیکن میں نے کوئی عہدہ نہیں لیا کیونکہ نہ اب اتنا ٹائم ہے اور نہ ہی اتنی انرجی رہی ہے کہ میں بھاگ دوڑ کرسکوں۔ جب نواز شریف صاحب سعودی عرب میں تھے تو میں ان کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے مجھے کھانے پر بلایا تھا اور بہت عزت کی۔ بہت اچھے انسان ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے مسز ممتاز قریشی صاحبہ سے اجازت چاہی۔

رُخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے،جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے فوزیہ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بالآخر وہ احسن کمال سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے اور سادگی سے دو گھنٹے کے اندر نکاح بھی ہو جاتا ہے۔ عاصمہ اس جادوگر عورت کو نکالنے کے بعد اپنا مکان دوبارہ کرائے پر نہیں دیتی بلکہ پڑوس میں رہنے والی سعدیہ کے ساتھ کوچنگ سینٹر کھول لیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے مشورے پر بی اے کے پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری شروع کر دیتی ہے۔

پندرہویں قسط

بہت ٹھہرا ہوا، جامد ساکن سا منظر تھا۔

اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، صرف بشریٰ کے سڈول جسم سے لپٹی قرمزی ساڑھی کا اڑتا پلو جس کی سرسراہٹ جیسے اس کے کانوں کے پاس کہیں ہو رہی تھی اور اس کا مسکراتا، خوش باش چہرہ۔

بشریٰ کے پہلو میں کھڑا مضبوط توانا وجیہہ مرد جس کی رفاقت کسی بھی عورت کا فخر ہو سکتی ہے۔ وہ اچٹتی نظر سے یوں عدیل کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت معمولی شے ہو۔

عدیل کو عجیب سی ہزیمت کا احساس ہوا تھا۔

اس کے دل کے بہت قریب کوئی کانٹا سا چبھا تھا۔ کانٹا تو شاید بہت دنوں سے گڑا ہوا تھا مگر جس کی چبھن آج ہوئی تھی، اسے لگا اس کا دل یہیں کھڑے کھڑے خون کے لوتھڑوں میں بدل جائے گا۔

بشریٰ اور احسن کمال کا ساتھ ساتھ کھڑے ہونا اس کی شکست پر گویا آخری مہر تھی۔ اب کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا نہ دیکھنے کو نہ سوچنے کو، وہ شکست خوردہ سا مڑ کر کھلے گیٹ سے باہر جانے لگا۔

"ایک منٹ مسٹر عدیل! رکیے پلیز!" اسے یہ پکار احسن کمال کی طرف سے سنائی دیتی تو شاید اتنی حیرت نہ ہوتی۔ اتنے ٹھوس اور واضح لہجے میں اسے مسٹر عدیل کہہ کر پکارنے والی کوئی اور نہیں بشریٰ تھی۔ وہ لمحہ بھر کو ان ہی قدموں پر ساکت کھڑا رہ گیا۔

مثال کو یوں لگا جیسے اس پکار میں ماضی کی کوئی گونج تھی شاید۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کو اس کے پرانے "منصب" پر بحال کرنے کا کوئی عندیہ دیا ہو۔ وہ اندھا دھند آکر باپ سے لپٹ کر اسے کھینچنے لگی۔

"پاپا! چلیں نا، ماما نے آپ کو بلایا ہے۔ انہیں آپ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، شاید وہ ہمارے ساتھ گھر چلنے کے لیے ریڈی ہیں۔ پاپا! آپ پلیز ماما کی بات مان لیجیے گا۔ ابھی ہم صرف ماما کو ساتھ لے کر چلتے ہیں بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مما آپ سے جو کہیں۔ جیسی بھی بات آپ مان لیجیے گا۔ پلیز پاپا!"

مثال بظاہر سرگوشیوں میں مگر خوشی بھرے لہجے میں تیز تیز باپ سے کہتی چلی جا رہی تھی۔

عدیل مغموم نظروں سے اپنی لاڈلی کے خوش فہم چہرے کو دیکھتا جا رہا تھا۔

کاش ان دونوں نے مثال کے بچپن کو اس دھوکے سے آشنا نہیں کیا ہوتا۔ جس سے وہ فریب مسلسل میں جلا نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ بس اسے دکھ سے دیکھ کر رہ گیا۔

"مثال! تم سنی کے ساتھ اندر جاؤ۔ مجھے تمہارے فادر سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ پلیز گو اوے۔" بشریٰ اس کے ذرا پاس آکر بے حد سنجیدہ مگر قدرے درشت لہجے میں بولی۔

مثال جو عدیل کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی یونہی کھڑی رہ گئی۔

"تم نے سنا ہے نا جو میں نے کہا ہے۔" وہ اسے جتانے والے انداز میں اس سے پھر کہہ گئی۔

مثال کی بھوری آنکھوں میں آنسو بھر گئے مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی کل ہی تو پاپا نے اسے سمجھایا تھا کہ "مثال بیٹا! حالات کیسے بھی ہوں آپ کو کتنا بھی رونا آرہا ہو آپ نے کسی کے سامنے نہیں رونا۔ بھلے اکیلے میں خوب رو لینا مگر کسی کے سامنے رو کر خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا۔ یو آر مائی بریو ڈاٹر۔" انہوں نے بظاہر اسے حوصلہ مند بنانا چاہا تھا۔ مگر وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ نہ رونا، رونے سے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ اگر آپ کو اپنے آنسوؤں کو بہت دیر تک روکنا پڑے اور اکیلے ہونے کا انتظار کرنا پڑے۔

مگر اس نے باپ سے کچھ بھی نہیں کہا اور اب بھی آنسو بھری آنکھوں کو بغیر جھپکے عدیل کے ہاتھ آہستگی سے اپنے ننھے ہاتھوں سے آزاد کرتی خاموشی سے سر جھکائے اندر کی طرف چلی گئی۔

"کیا بات رہ گئی ہے اب کرنے کے لیے؟" وہ اس طرح رخ پھیرے بے رخی سے بولا۔

”مشال کے بارے میں..... ہمیں بات کرنا ہوگی۔“ بشریٰ بہت پر اعتماد لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ یوں جیسے وہ روز آفس جاتے ہوئے عدیل کا رستہ روک کر اس سے آج کے مینیو کے بارے میں پورے اعتماد سے پوچھا کرتی تھی۔ عدیل نے ذرا سی نظر اٹھا کر اسے دیکھا مگر وہ تادیر دیکھ نہیں سکا۔

”بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ آنٹی کو بھی بلا لو بشریٰ! اس معاملے کو سیٹل کرلیا جائے۔“ احسن کمال آہستگی سے بشریٰ کے پہلو میں پھر سے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کے کندھے پہ استحقاق بھرے انداز میں ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

”بالکل، میرا بھی یہی خیال ہے۔ پلیز آپ کو تھوڑا سا ٹائم دینا ہوگا کہ بعد میں یہ ایشو ہمارے لیے کوئی ٹینشن کری ایٹ نہ کرے۔ ہم دونوں کی فیملیز یہ بات افورڈ نہیں کرے گی کہ ہم اس مسئلے کو کورٹ میں لے کر جائیں۔ ہمیں ٹیبل ٹاک کے ذریعے اس کو سولو کرلینا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر عدیل؟“ احسن کمال کے استحقاق بھرے ساتھ نے اس کے اعتماد کو کچھ اور بھی بڑھاوا دیا تھا۔

عدیل آہستہ سے سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اندر کی طرف چل پڑے وہ ان کی طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور پھر ان کے پیچھے ان کے قدموں پہ چلتا آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے چاروں بچے بہت پرسکون گہری نیند سو رہے تھے۔ بچپن کی میٹھی بے فکر نیند! وہ یک ٹک ان کو دیکھتی رہی۔

یہی تو اس کا کل اثاثہ تھے اور وہ اب تک، جو موت سے مشکل مرحلوں سے، بہت آرام سے تو نہیں مگر گزرتی چلی آئی تھی، صرف ان چاروں کے لیے۔ اور شاید ان ہی کی وجہ سے قدرت نے بہت سی بلائیں اور مصیبتیں اس کے اوپر سے کم کی تھیں کہ ان چاروں کا آسرا بھی خدا کے بعد اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ عفان اگر زندہ ہوتے تو دیکھتے ہم ان کے بغیر کیسی مشکل زندگی گزار رہے ہیں تو شاید برداشت نہ کرپاتے۔

مگر نہیں عفان۔ میرے اللہ کا وعدہ سچا۔ مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ اپنے آگے بی اے کے کورس کی کتابیں پھیلا کر بیٹھی تھی۔ باہر ابھی فجر کی نماز کے بعد صبح کا ہلکا سا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ عاصمہ کو دن میں بچوں کے سامنے کتابیں کھولتے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ پھر اس کے دل میں ناکامی کا بھی خوف تھا۔ اگر وہ فیل ہوگئی۔ وہ بہت سالوں کے بعد اس طرح کے امتحان کا سامنا کر رہی تھی۔

وہ کبھی بھی اچھی اسٹوڈنٹ نہیں رہی۔ تھی بس رو دھو کر پاس ہوجایا کرتی تھی۔ انٹر میں تو وہ اتنی مشکل سے پاس ہوئی تھی کہ اس نے اپنی سند کبھی کسی کو دکھائی بھی نہیں تھی۔ مارکس شیٹ عفان سے بھی چھپاتی رہی تھی اور اس روز جب داخلہ فارم کے ساتھ اسے مارکس شیٹ لگانے کے لیے فوٹو کاپی کرنے کے لیے سعدیہ کو دی تھی تو وہ بہت شرمندہ شرمندہ سی تھی۔

”ارے آپا! اس زمانے میں جب آپ نے انٹر کیا تھا یہ نمبرز بھی بہت اچھے سمجھے جاتے تھے اور سچ بتاؤں آپ کو‘ انٹر میں تو میرا اس سے بھی ردی حال تھا۔ وہ تو میں نے گریجویشن میں محنت کی تو سر اٹھانے کے قابل ہوسکی ہوں۔ آپ بھی محنت کیجئے گا۔ ڈگری گریجویشن پر ملتی ہے۔ انٹر پر نہیں۔“

سعدیہ معلوم نہیں اس کا دل رکھنے کو کہہ رہی تھی یا واقعی اس کی بات میں کوئی وزن تھا‘ عاصمہ نے جیسے یہ بات پلو سے باندھ لی کہ کم از کم ڈگری دکھانے کے قابل ہونی چاہیے۔

وہ بچوں سے چھپ چھپ کر واقعی بہت محنت کر رہی تھی۔ صرف اس خیال سے کہ جب اس کا رزلٹ آئے تو اسے مارکس شیٹ کسی سے چھپانی نہیں پڑے۔ واثق ماں کی بہت حوصلہ افزائی کرتا۔ اسے بہت اچھا لگتا جب وہ اسے سبق سناتے ہوئے جھجکتی ہوئی اٹک جاتی‘ بھول جاتی تو وہ پکا سامنہ بنا کر بہت سنجیدگی سے عاصمہ کو نوٹس واپس کرتے ہوئے کہتا۔

”مما! ابھی آپ کو اور پڑھنا چاہیے۔ کم از کم تین سے پانچ بار مزید پکا کریں۔“

عاصمہ کچھ شرمندہ ہوتی اور کچھ نادم بھی۔ مگر اب اس کا شوق دن بدن بڑھتا جارہا تھا۔ ٹیوشن والے بچوں کو پڑھانے کے دوران بھی جو ٹائم فارغ ہوتا وہ اپنی کتاب نکال کر پڑھنا شروع کردیتی۔ ٹیوشن سے ملنے والی آمدنی کافی کم تھی۔ مگر عاصمہ بہت طریقے سے خرچ کرتے ہوئے گزارہ کر رہی تھی۔ اس کے لیے یہی بات باعث سکون تھی کہ وہ اپنے گھر میں محفوظ رہ کر اپنے بچوں کی روزی کا انتظام کر رہی ہے۔ فارغ وقت میں‘ جواب بہت کم ہوتا جارہا تھا۔ وہ کوشش کرکے سلائی یا کڑھائی کا بھی کچھ کام کرتی۔ اکثر سعدیہ بھی اس کی مدد کردیتی۔ اس لڑکی کے لیے عاصمہ کے دل سے بہت دعائیں نکلتیں۔

یقیناً ”جب ارادہ مضبوط ہوجائے‘ کسی مشکل پر قابو پانے کا تو خدا اپنی رحمت کے وسیلے بنا ہی دیا کرتا ہے۔“ حمیدہ خالہ نے بعد میں دو‘ تین اچھی فیملیز کرائے کے لیے بھی بتائیں۔ الیاس بھی کچھ لوگوں کو لے کر آیا مگر عاصمہ نے مناسب الفاظ میں فی الحال منع کردیا۔ وہ اپنے ایگزام تک اس سلسلے کو بھی اسی طرح چلانا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

”کیا؟“ عدیل پریشان سا ہو کر بشریٰ اور احسن کمال کی شکلیں دیکھنے لگا۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔ اس نے بہرحال یہ نہیں سوچا تھا۔

”وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ جانتے ہیں مسٹر عدیل۔“ وہ بار بار اسے مسٹر عدیل کہہ کر اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلے کو جتائے جارہی تھی۔ اس اب غصہ آرہا تھا اس کے اس انداز تخاطب پہ۔ بہرحال کچھ بھی تھا وہ اس کی بچی کا باپ تو تھا۔ اور کبھی اس کا بھی بہت کچھ.....

لیکن اب ان باتوں کو دل میں بھی دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”وہ میرے بغیر بھی نہیں رہ سکتی اور یہ قطعی ممکن نہیں کہ میں اگلے پانچ سالوں تک اسے آپ لوگوں کے پاس چھوڑ دوں۔“ نرمی سے بات کرتے کرتے بھی اسے غصہ سا آگیا۔

”لیکن آپ اس سے مل سکتے ہیں۔“ بشریٰ نے بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔

”شکریہ..... اس سخاوت کا۔ ملنے سے تو مجھے اپنی بیٹی سے کوئی بھی نہیں روک سکتا‘ لیکن اس کے باوجود میں اسے آپ کے پاس خود سے دور کرکے ——— پانچ سال تک نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ اپنے ازلی حتمی ضدی لہجے میں واضح کرتے ہوئے بولا۔

بشریٰ اور احسن کمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ذکیہ نے تو بہانے سے بیچ میں بیٹھنے سے منع کردیا تھا۔ عمران بھی اپنے کسی کام سے گھر سے غائب تھا۔

”اگر آپ دونوں کو ناگوار نہ گزرے تو میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟“ احسن کمال نے بڑے مہذب انداز میں دونوں کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”ہاں..... ضرور احسن!“ بشریٰ فریفتہ ہونے والے انداز میں بولی۔ عدیل کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

”کیونکہ مشال ابھی بچی ہے اور وہ آپ دونوں کے درمیان ہونے والی اس سپریشن کو ابھی ٹھیک طرح سے سمجھ بھی نہیں پا رہی تو اسے ایک دم سے صرف ایک کے پاس ٹھہرانا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کا ذہن اس بات کو

قبول نہیں کرے گا۔ بہر حال وہ آپ دونوں سے ہی بہت اٹیچ ہے۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ بشریٰ کو اس کی بات اچھی نہیں لگی۔ بے شک مثال دونوں سے اٹیچ تھی، مگر وہ اب دونوں کے ساتھ تو کسی طور پر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ احسن کو یہ بات سمجھنی چاہیے۔ وہ دل میں تلملائی۔

"وہ ابھی چھوٹی ہے۔ اسے صرف میرے پاس رہنا چاہیے۔ کم از کم اگلے پانچ سال تک ضرور۔۔۔ میں اسے خود سے دور نہیں کر سکتی۔" وہ اسی ہٹ دھرم لہجے میں بولی۔

عدیل تیزی سے کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

"لیکن وہ تمہارے ساتھ بھی پوری طرح خوش نہیں رہ سکتی۔ یہ بات تم لکھ لو بشریٰ۔" احسن نرمی سے بولا۔

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ وہ کچھ دن پریشان ہوگی۔ نیچرل سی بات ہے۔ مگر یہ سب کچھ دنوں کے لیے ہوگا۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔ مجھے اپنی مامتا پر، اپنی محبت پر بھروسا ہے۔ میری بیٹی مجھے اور میں اس کو خوب سمجھتی ہوں۔ جو بھی مسئلہ ہوگا۔۔۔ میں ہینڈل کر لوں گی۔" وہ بھرپور اعتماد سے بولی۔

"تو میں یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہوں۔۔۔ اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میں مثال ہمیشہ کے لیے تمہیں بخش دوں۔" عدیل بھی بے لحاظ ہو کر بولا۔

"ہمیشہ کے لیے نہیں۔۔۔ صرف پانچ سال کے لیے۔" وہ زور دینے والے انداز میں دہرا کر بولی۔

"کیا میری یہاں کچھ ضرورت ہے۔ میرے خیال میں آپ دونوں کی اجازت سے میں کچھ کہہ رہا تھا۔" احسن کمال اتنے جتا دینے والے انداز میں بولا کہ بشریٰ بے اختیار ٹھٹک کر خاموش ہو گئی۔

"وہ بچی آپ دونوں کے پاس رہ سکتی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بہت ڈرامائی انداز میں بولا۔

"کیا مطلب۔ ایٹ اے ٹائم۔۔۔ ہم دونوں کے پاس۔۔۔ کیسے؟" بشریٰ اچنبھے سے بول اٹھی۔ عدیل بھی منتظر نظروں سے احسن کو دیکھنے لگا۔

"مہینے میں تیس دن ہوتے ہیں، آپ دونوں ایک ہی شہر میں ہیں۔ پندرہ دن بچی کو بشریٰ رکھ لے اور اگلے پندرہ دن مسٹر عدیل۔" وہ سرپرائز دینے والے لہجے میں بولا۔

دونوں الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"کیا آپ دونوں کو میری تجویز پسند نہیں آئی؟"

"یہ کیسے ممکن ہے، نہیں۔" بشریٰ قطعیت سے بولی۔

"اس بات کا بشریٰ! صرف ایک مطلب ہے کہ تم اس بات کو کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچانا چاہتیں۔" احسن کچھ خفگی سے بولا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ میں اپنی بیٹی کی دشمن نہیں کہ اتنی سی عمر میں اسے دنوں کے چکر میں پھنسا دوں۔ وہ میرے پاس رہے تو محض دن گنے، باپ کے پاس جائے تو بھی دن گنے۔ نہیں احسن! یہ ٹھیک نہیں۔ اس کی نفسیات بری طرح خراب ہو جائے گی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں۔۔۔" وہ رک رک کر ٹھوس لہجے میں بولی۔ احسن کمال ایک لمحہ کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔

"میرے خیال میں احسن صاحب کا یہ پروپوزل برا نہیں مثال آہستہ آہستہ سچویشن کو سمجھ لے گی تو اسے دونوں کے پاس رہنا آسان لگنے لگے گا۔" عدیل کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"مرد ہو نا، ایک مرد کی ایسی بھونڈی تجویز کو ضرور پسند کرو گے۔" بشریٰ۔۔۔ وہ یکدم ہی جارحانہ انداز میں بولی۔ احسن کمال کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

"سوری۔۔۔ مگر مجھے یہ سب مثال کے لیے ٹھیک نہیں لگ رہا۔" وہ فوراً ہی اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"او کے۔۔۔ تو پھر یہ آپ دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ دونوں اسے جس طرح سے ہینڈل کرنا چاہیں میں بیچ میں دخل نہیں دوں گا۔" وہ خشک لہجے میں کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور بشریٰ! اگر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے تو دس منٹ میں آ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں لنچ آور میں لینے آجاؤں گا۔ اس پرابلم کو اتنے ٹائم میں ساٹ آؤٹ کر لینا۔"

"احسن! میں آرہی ہوں تھوڑی دیر میں۔۔۔ لیکن آپ رکیں تو ہم بات کر رہے ہیں۔" وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

"نہیں۔۔۔ میں آل ریڈی لیٹ ہو رہا ہوں اور یوں بھی میرے خیال میں یہ معاملہ آپ دونوں کا خالصتاً" آپس کا معاملہ ہے۔ میں اس میں دخل نہیں دوں تو بہتر ہوگا۔ چلتا ہوں میں تم ایک بجے تک ریڈی رہنا۔ میں آ کر لے جاؤں گا، اللہ حافظ۔" کہہ کر وہ رکا نہیں۔ تیزی سے چلا گیا۔

بشریٰ اسے پکارنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ کمرے میں معنی خیز خاموشی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تڑاخ۔" کی تیز آواز گونجی۔ وہ سخت حیرت زدہ سا اس تھپڑ کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی خود کو گرنے سے نہیں بچا سکا۔

وہ زمین پر اوندھا گرتے ہوئے بھی پلٹ کر وحشت زدہ سا مڑ کر دیکھنے لگا۔

عاصمہ کی حالت اس کو تھپڑ مارنے کے بعد اس سے بھی زیادہ بری تھی، وہ کھڑے کھڑے کپکپا رہی تھی۔ اس نے واثق کو پہلے کبھی ایسے نہیں مارا تھا۔ مگر اس وقت غصے اور رنج سے اس آنکھوں میں پانی بھی تھا اور دکھ بھی۔

"مما۔۔۔ میں نے صرف آپ کے لیے، اس گھر کے لیے۔" وہ خود کو سنبھلتے ہوئے بمشکل بول سکا۔

"کس دن۔۔۔ کس دن میں نے تم سے ایسا کہا تھا واثق! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم یہ۔۔۔ کرو گے۔ اگر آج تمہارے اسکول سے فون نہیں آتا۔۔۔ مگر نہیں، اس فون کا بھی کیا فائدہ۔۔۔ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔ انہوں نے تمہیں اسکول ہی سے نکال دیا۔ مسلسل ایک مہینے سے تم اسکول سے غیر حاضر رہے ہو تو کون تمہیں وہاں رہنے دیتا۔۔۔ میرے خدا۔۔۔" وہ سر پکڑ کر رونے ہی لگی۔

"تم نے کس طرح مجھے دھوکا دیا۔۔۔ وہ بھی تم نے۔۔۔ تم جو میری امید۔۔۔ میرے اچھے دنوں کی آس۔۔۔ واثق! تم تو میرا سب کچھ تھے اور تم نے۔۔۔ میرے پاس بچا ہی کیا ہے، سب کچھ تو لٹ چکا۔۔۔ برباد ہو چکا۔ اب تم بھی۔۔۔ ان رستوں پر چل پڑے ہو جن کا انجام صرف اور صرف بربادی اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ اب بھی روئے جارہی تھی۔

واثق کے چہرے پر ماں کو روتے دیکھ کر سخت بے چارگی اور دکھ تھا۔

"پلیز مما! ایسے نہیں روئیں۔" وہ ماں کے پاس آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر گلوگیر لہجے میں بولا۔

"جن ماؤں کے تم جیسے بیٹے ہوں، وہ ساری زندگی روتی ہیں۔" وہ زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر تیز لہجے میں بولی۔

"پلیز مما۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ صرف ایک سال ڈراپ کر کے اگر میں الیکٹریشن کا کام سیکھ جاتا ہوں تو پھر آمدنی کا مستقل ذریعہ۔۔۔" وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔ عاصمہ دوسری بار ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گئی۔

"تو یوں کہو نا۔ تمہارے باپ کے ساتھ تمہاری ماں بھی مر گئی ہے۔"

وہ تڑپ ہی تو اٹھا۔ "پلیز مما! ایسا نہیں کہیں۔۔۔ میں مر کر بھی ایسا نہیں سوچ سکتا اور آپ تو میرا سب کچھ ہیں۔۔۔ میں۔۔۔" وہ لاچار سا ہو کر رو ہی دیا۔

"سوچ تو تم بہت کچھ سکتے ہو، اپنے قد اور عمر سے بہت آگے کی بڑی بڑی باتیں۔ تم خود کو کیا سمجھنے لگے ہو؟ ابھی تم ہو کیا واثق! اور تم خود سے اتنے بڑے بڑے فیصلے کرو گے اور مجھے بتانے کی بھی زحمت نہیں کرو گے تو کیا میں تم سے بہت خوش ہوں گی۔" وہ اب اپنے آنسوؤں پہ قابو پا چکی تھی کہ یہ مسئلہ بلکہ کوئی بھی مسئلہ رونے دھونے یا آنسو بہانے سے حل نہیں ہوتا' وہ جان چکی تھی۔

"میں آپ کو بتانے ہی والا تھا مما!"

"جب تمہارا اسکول سے نام کٹ گیا اس کے بعد۔" وہ طنز سے بولی۔

واثق سر جھکا کر کھڑا رہ گیا۔ عاصمہ دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتا رہ گئی۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی رہی۔

"بیٹھو ادھر آکر میرے پاس۔" بہت دیر بعد وہ خود پر' اپنے جذبات پر قابو پاکر گہرا سانس لے کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھاتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولی۔

واثق خاموشی سے ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو نا' تعلیم کی کیا اہمیت ہے۔ اگر مجھے تمہارے ذریعے ذریعہ آمدنی پیدا کرنا تھا واثق! تو پھر میں خود اتنے جتن کیوں کرتی؟"

واثق اسی طرح سر جھکا کر بیٹھا رہا۔

"میری نہیں تمہارے باپ کی اور سب سے بڑھ کر تمہارے دادا مرحوم کی شدید خواہش تھی کہ ان کے پوتے' پوتیاں خوب بہت سا پڑھیں۔۔۔ علم حاصل کریں۔ زندگی کے ہر میدان میں کامیابی حاصل کریں۔ مگر صرف علم کے ذریعے۔"

"ہنر سیکھنا بری بات نہیں اور یہ بہت سے حالات میں علم سے زیادہ کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ تمہارے دل میں اگر ایسی کوئی بات تھی تو تمہیں پہلے مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ اسکول کو' اپنی تعلیم کو یوں نظر انداز کر کے تم کچھ بھی نہیں سیکھ سکتے۔"

"مما۔۔۔ میں جاتا رہا تھا اسکول مگر الیکٹریشن کا کام سیکھنے کے لیے زیادہ ٹائم کی ضرورت تھی۔ پھر شام میں مجھے آپ کے ٹیوشن سینٹر میں بھی آپ کے ساتھ۔۔۔"

"بس کرو واثق! کیوں اپنی ماں کو اور ذلیل کر رہے ہو۔" وہ دکھ سے بولی۔ واثق اور بھی پریشان ہو گیا۔

وہ تو دل میں خوش تھا کہ جب وہ ماں کو بتائے گا کہ وہ ایک اچھا الیکٹریشن بن چکا ہے اور سکس کلاس تو وہ اگلے سال بھی پاس کر سکتا ہے۔ مگر اس کے ذریعے وہ ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ پیدا کر چکا ہے تو اس کی ماں کتنی خوش ہوگی۔ مگر مما تو اور بھی خفا اور بھی ناراض ہوئے جا رہی تھیں۔

"میں تم سے یہ۔۔۔ کچھ نہیں چاہتی واثق! اور آج سے تم ٹیوشن سینٹر بھی نہیں آؤ گے ہماری ہیلپ کرنے۔" وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔

"مما۔۔۔ پلیز۔۔۔"

"اب تم کچھ نہیں بولو گے صرف اس پر عمل کرو گے جو میں کہوں گی۔" وہ اسی سختی سے بولی۔

"مما صرف تین ماہ بعد میں ایک الیکٹریشن۔۔۔" وہ منمنایا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا کورس۔ میں خود جا کر بات کروں گی جہاں تم کورس کر رہے ہو کہ ایگزام کے بعد تم سیکھو گے ایسی کوئی بھی skill اور کل تم میرے ساتھ اسکول چلو گے۔ پرنسپل صاحب کو میں سب کچھ بتا کر ان سے تمہارے دوبارہ داخلے کی درخواست کروں گی۔"

"مما۔۔۔ پلیز۔۔۔ کچھ دن تو رہ گئے ہیں۔۔۔ ایگزام میں۔۔۔ اور میری تیاری تھرڈ ٹرم کی تو بالکل بھی نہیں ہے۔

میں۔۔۔ رہ جاؤں گا اس کلاس میں۔ کلیر نہیں کر پاؤں گا۔" عاصمہ نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اسے اپنی عقل اور اندھے اعتماد پر رونا آیا۔ اس نے کیسے کبھی بھی واثق سے اس کی پڑھائی کے بارے میں نہیں پوچھا۔ شاید چھ یا آٹھ ماہ پہلے آخری ٹیسٹ اس کا دیکھا تھا۔ وہ شام میں ٹیوشن کے دوران رسمی طور پر اپنا بیگ پاس رکھتا تھا۔ کتاب بھی کوئی نہ کوئی گود میں ہوتی تھی اور اکثر سرسری نظر سے پڑھتا بھی نظر آیا تھا عاصمہ کو۔ مگر وہ پڑھائی میں اتنا پیچھے رہ چکا ہے اور ایک طرح سے پڑھائی سے بھاگ چکا ہے۔ عاصمہ کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔

"اب اس پر کوئی بحث نہیں ہوگی کہ تم کامیاب ہوتے ہو یا نہیں' تمہیں ری ایڈمٹ ہونا ہے اور جی جان سے محنت بھی کرنا ہے۔ واثق میں اب تمہارے معاملے میں کوئی غفلت افورڈ نہیں کر سکتی۔ تمہیں آگے چل کر مجھ سے زیادہ اپنی بہنوں کا ہی سہارا بننا ہے اور مجھے تمہارا الیکٹریشن کورس کا ڈپلوما نہیں ایک لائق انجینئر کی ڈگری چاہیے۔ تم صرف یہ ذہن میں رکھو گے آج کے بعد۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی چلی گئی۔

واثق کچھ شرمندہ اور پشیمان سا ماں کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر لجاجت سے ماں کے ہاتھ پکڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

"سوری مما! آپ کو میری وجہ سے اتنا دکھ ہوا' مگر رئیلی۔ میرا یقین کریں میں اگلے سال ضرور امتحان دوں گا۔ مگر اس سال میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔۔۔ میں۔۔۔"

"کل صبح ہم تمہارے اسکول چل رہے ہیں۔ تم جلدی اٹھ جانا' جو بھی مشکل ہوگی میں تمہاری ٹیچرز سے بات کروں گی۔ سعدیہ تمہاری ہیلپ کر دے گی' مگر تمہیں جس طرح بھی سہی' اسی سال ایگزام دینا ہوگا۔ یاد رکھنا! میں روٹیاں ڈالنے جا رہی ہوں۔ آجاؤ جلدی سے۔" کہہ کر باہر نکل گئی۔ واثق پریشان سا بیٹھا رہ گیا۔

اتنے مہینوں کی پڑھائی سے دوری کے بعد اس کا جی بالکل اچاٹ ہو چکا تھا پڑھائی سے۔

وہ اب یہ سلسلہ پھر سے کیسے شروع کرے گا۔ اسے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ گم صم سا اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆
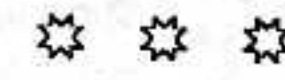
"لیکن یہ مجھے قبول نہیں۔" بشریٰ بے لچک لہجے میں بولی۔ عدیل تیز نظروں سے اسے محض دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ کے گھر میں یوں بھی اب مثال کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ آپ کی والدہ بمشکل گھر کے کام کر لیں تو بڑی بات ہے اور مثال کو ابھی بہرحال مکمل دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اسے صبح اسکول جانے کے لیے تیار کرنا' لنچ تیار کرنا' اس کا یونیفارم' ہوم ورک کی تیاری اور دوسرے بہت سے کام جو آپ نہیں کر سکتے۔" وہ جتانے والے انداز میں بولی۔ عدیل کے خون میں غصے کی لہر اٹھی' مگر وہ پی گیا۔

"یہ تمہارا دردسر نہیں ہونا چاہیے۔ میں اگر مثال کو اپنے پاس رکھنے کی بات کر رہا ہوں تو اس کی دیکھ بھال کا بندوبست بھی کر سکتا ہوں۔ مثال صرف تمہاری نہیں میری بھی کچھ لگتی ہے۔" وہ پھر سے ہزار بار کا دہرایا جملہ کہہ گیا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے کہ وہ چند سال میرے پاس رہے کہ صرف میں ہی اس کی ٹھیک کیئر کر سکتی ہوں۔ جبکہ۔۔۔"

"لیکن میرے خیال میں اس وقت تمہاری توجہ کا مرکز مثال سے زیادہ تمہارا دوسرا شوہر اور اس کا بچہ ہوگا اور ان دونوں کو نظر انداز کرنے کا مطلب۔۔۔ ہو سکتا ہے' مستقبل قریب میں کہیں دوسری بار بھی تمہیں اپنے گھر کی تباہی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔" وہ زہر خند لہجے میں کہتا چلا گیا۔ بشریٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"شٹ اپ مسٹر عدیل! آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آپ مجھے اس طرح بددعائیں دیں۔"

"صرف حقیقت بیان کر رہا ہوں' بلکہ سادہ لفظوں میں کہوں گا کہ تم کو خبردار کر رہا ہوں۔ اگر دوسری بار اس طرح کی ذلت سے بچنا چاہتی ہو تو اپنی توجہ ساری کی ساری اس نئی زندگی کے تقاضوں کی طرف کر لو۔ زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ مشال میرے پاس رہے' لیکن میں جانتا ہوں' تم صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس پہ اپنا حق جتاتے ہوئے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتیں' ورنہ یہ ضروری تھا۔"

"اگر آپ اپنی بات مکمل کر چکے تو آپ جا سکتے ہیں کہ مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ سخت' روکھے لہجے میں بولی۔

"او کے۔۔۔ میں چلتا ہوں' ٹھیک پندرہ دن بعد میں مشال کو لینے کے لیے آؤں گا۔ امید ہے تمہیں میری بات سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ خدا حافظ۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر تیز قدموں سے چلتا ہوا پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

اور باہر دروازے سے لگی کھڑی مشال کو دیکھ کر بے اختیار ٹھٹک کر رک گیا۔ مشال کے چہرے پر خوف اور سخت پریشانی تھی۔

وہ جھک کر اس کے پاس دو زانو بیٹھ گیا۔ نرمی سے اس کے رخساروں کو چھو کر اسے پیار کرنے لگا۔

"اداس ہو میری جان!" وہ اس کی طرف یک ٹک دیکھتے ہوئے بولا' وہ نہیں بولی۔

"مشال! اب وہ پہلے والے دن' جب تمہارے پاپا اور مما اکٹھے رہتے تھے۔ کبھی بھی لوٹ کر نہیں آ سکتے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔" وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ باپ کو دیکھتی رہی۔

"اب تم ففٹین ڈیز اپنی ماما کے پاس رہا کرو گی اور نیکسٹ ففٹین ڈیز میرے پاس۔ یہ اچھی بات ہو گی نا۔ آپ کسی سے بھی دور نہیں ہو گی۔ ہم دونوں ہی آپ سے بہت پیار کرتے ہیں اور آپ کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ آپ بھی ہم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں تو میرے خیال میں یہ ایک بہترین حل ہے' اس مسئلے کا کہ بجائے آپ کو بہت سارے سال' ہم دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر رہنا پڑتا' ہے نا۔" مشال پھر کچھ نہیں بول پائی۔

"مشال! آپ کو یہ بات اچھی لگی یا بری۔ مجھے بتائیں کچھ؟" وہ اس کے ننھے ننھے ہاتھ اپنے مضبوط بڑے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے بولا۔

"مما۔۔۔ اب کس گھر میں رہیں گی پاپا؟" اس نے بہت دیر بعد عدیل کی توقع سے بالکل مختلف سوال کیا۔ فوری طور پر عدیل اس کا جواب نہیں دے سکا۔

"وہ ادھر نانو کے ساتھ رہیں گی نا؟" وہ پھر سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ شاید۔" عدیل مبہم سے انداز میں بولا۔

مشال باپ کو دیکھتی رہی۔ پھر فوری نفی میں سر ہلا کر جیسے سرگوشی میں بولی تھی۔

"وہ یہاں نہیں رہیں گی۔۔۔ میں جانتی ہوں۔"

عدیل کو پہلی بار اپنی چھوٹی سی بیٹی کی بے بسی پر رونا سا آ گیا۔ اس معصوم کو اب ایک تیسری جگہ جا کر ایڈجسٹ ہونے کا خوف تھا۔

"حسن انکل آپ کو پیار تو کرتے ہیں نا؟"

"آپ جتنا تو نہیں کر سکتے نا!" وہ بہت مدبرانہ انداز میں بولی۔ عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ بے اختیار اس کو گلے لگا کر پیار کرنے لگا۔

"میری جان! میں ہمیشہ آپ کے پاس ہوں' آپ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ ہمیشہ اپنی بیٹی کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھوں گا۔ جب آپ تھوڑی بڑی ہو جاؤ گی تو پھر آپ' ہم دونوں میں سے' جس کے پاس رہنا چاہو گی' وہیں رہ لینا۔۔۔ اور پریشان نہیں ہونا۔ احسن انکل اچھے ہیں' پھر آپ کی ماما بھی تو ہیں۔۔۔ وہ آپ کا بہت خیال رکھیں گی۔"

وہ اسے ساتھ لگائے تھپکتے ہوئے تسلی دے رہا تھا۔

"میرا سیل نمبر ہے نا آپ کے پاس۔ آپ کو جب بھی' جس چیز کی ضرورت ہو' کوئی پریشانی ہو' کچھ چاہیے ہو' آپ مجھے فوراً" فون کیجئے گا۔ آپ کے پاپا دوڑے چلے آئیں گے آپ کے پاس' پرامس۔" اسے سامنے کرتے ہوئے' وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر بولا۔

"پاپا۔۔۔" وہ باپ کو نظریں جمائے دیکھے جا رہی تھی۔

"جی پاپا کی جان!" وہ فریفتہ ہونے والے انداز میں بولا۔

"پاپا! میری ٹیچر کہتی ہیں' وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا' یہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے' ایسا ہی ہے نا پاپا؟"

"ہاں میری جان۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"اور یہ وقت ہمیں بھی بدل جاتا ہے نا پاپا۔" وہ پھر سے بڑے پن سے بولی۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہو میری گڑیا؟" وہ اس کی بات کچھ تو سمجھ گیا تھا اور کچھ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

"پاپا! ایک وعدہ کیجئے۔" وہ عدیل کو ایک دم سے اپنی عمر سے بہت بڑی لگنے لگی تھی۔ وہ کچھ ڈر سا گیا۔

"آپ ہمیشہ اپنا یہ والا فون نمبر۔۔۔ یہی رکھیے گا۔ کبھی اسے بدلیے گا نہیں پاپا۔"

"مشال۔۔۔ میری گڑیا!"

"معلوم نہیں پاپا! مجھے کب آپ کی ضرورت پڑ جائے اور آپ نے اپنا نمبر چینج کر لیا ہو۔۔۔ اور آپ مجھے انفارم کرنا بھی بھول چکے ہوں تو۔۔۔ پھر میں کیسے آپ کو بلاؤں گی؟" اس کے لہجے میں' اس کے لفظوں میں کون سا دکھ نہیں رو رہا تھا۔ عدیل کا دل جیسے پھٹ سا گیا۔

"نہیں میری پیاری بیٹی! میں کبھی اپنا نمبر چینج نہیں کروں گا۔ تمہیں بتائے بغیر تو بالکل بھی نہیں۔" وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر رو ہی پڑا۔

"اور پاپا! ہماری مس کہتی ہیں' لوگ جیسے جیسے اولڈ ہوتے جاتے ہیں۔ وہ باتوں کو' چیزوں کو' لوگوں کو اور اپنے وعدوں کو جلدی جلدی بھولنے لگتے ہیں۔

is it True Papa? (کیا یہ سچ ہے پاپا؟) وہ بالکل بھی نہیں رو رہی تھی۔ باپ کے گلے سے الگ ہو کر بڑی خوف ناک سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور عدیل کو لگا۔ وہ اب اس کے کسی سوال کا بھی جواب نہیں دے پائے گا۔ وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے سامنے لاجواب ہو گیا تھا۔ اپنی چھوٹی سی کم سن بیٹی کے سامنے۔

وہ تیزی سے اسے چھوڑ کر بھاگتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مشال خشک آنکھوں سے دور جاتے اور ایک ہیولہ بنتے باپ کو پلکیں جھپکائے بغیر دور تک دیکھتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

صبح سے شام ہو گئی' واثق گھر نہیں آیا تھا۔

عاصمہ تین بار باہر جا کر اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ چکی تھی' مگر اس کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔

وہ صبح فجر کی نماز کے بعد یوں ہی ذرا ستانے کو لیٹی تھی اور جب بچوں کو اسکول بھیجنے کے خیال سے عجلت میں اٹھی تو دھک سے رہ گئی کہ واثق اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ دونوں بچیوں کو اسکول بھیجنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ پہلے اسے شدید غصہ تھا۔ دوپہر تک یہ غصہ تشویش اور پریشانی میں بدل چکا

تھا اور اب تو شام ہونے کو آئی تھی۔

اس نے ٹیوشن والے بچوں کو بھی آج چھٹی دے دی تھی۔ سعدیہ اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ واثق کا کہاں جا کر پتا کرے۔ اس سے کیسی بھول ہوئی کہ کل اس سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں الیکٹریشن کا کام سیکھنے جاتا ہے' وہاں جا کر پتا ہی کر آتی۔

حمیدہ خالہ دوپہر میں اس کے بلانے پر آئی تھیں۔ وہ بھی پریشان ہوئیں۔ مگر پھر ان کے گھر سے کسی فوتگی کا بلاوا آگیا تو وہ وہاں چلی گئیں اور کسی سے عاصمہ کی اتنی جان پہچان نہیں تھی۔

"مما! بھائی کب آئے گا گھر؟" اریبہ اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر اس کے پاس آکر بولی۔ عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آگئے۔

"مما! بھائی کہاں چلا گیا ہے؟" وہاں کی خاموشی پر پھر سے اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

"میرے خیال میں مجھے الیاس بھائی کی دکان پر جا کر ان سے کہنا چاہیے کہ وہ کہیں اسے تلاش کریں یا کسی کو بھیج دیں میرے ساتھ۔" وہ خود ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

"میری چادر لے آؤ اریبہ! اندر کمرے سے جا کر۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"ایسے تو کبھی نہیں ہوا کہ وہ اتنی دیر تک باہر رہے۔ اگر وہ ناراض بھی تھا تو بھی اسے یوں بغیر بتائے تو نہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ سوچتی جا رہی تھی اور پریشان ہوتی جا رہی تھی۔

"پہلے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے کون سا مجھ سے پوچھا تھا جو اب ایسا کرے گا۔" وہ مایوس سی ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے عاصمہ بہن! کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہو' میرا مطلب ہے جو اسے راہ سے بھٹکا رہا ہو۔" الیاس بھائی کی بات نے ایک دم سے اسے چونکا دیا۔

اس نے تو یہ بات کل سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچی تھی اور واثق تو ایسا کبھی بھی نہیں رہا تھا کہ ایسے خود سے فیصلے کرتا پھرے۔ دوسرے وہ تو خود پڑھائی کا بہت دیوانہ تھا۔

"کتابیں' اسکول ان سب سے تو اسے عشق تھا' پھر ایک دم سے اندر ہی اندر ایسا کیا ہو گیا کہ اس نے اسکول ہی جانا چھوڑ دیا۔ ایسا کون ہو سکتا ہے۔" وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

"اس عمر کے لڑکے ضرور کسی نہ کسی بری کمپنی میں پڑ کر اس طرح پڑھائی سے بھاگتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا۔۔۔" وہ کچھ مزید بولتے ہوئے جھجک کر رک سا گیا۔

"کیا۔۔۔ ہو سکتا ہے اور الیاس بھائی؟" وہ اور بھی ڈر سی گئی تھی۔

"کبھی۔۔۔ آپ کو کچھ ایسا لگا ہو۔ مطلب۔۔۔ کچھ ایسا محسوس کیا ہو آپ نے۔۔۔ کہ وہ کسی نشے وغیرہ میں یا کسی اور غلط کام میں۔۔۔ مبتلا ہوا ہو۔" وہ رک رک کر بولا۔ تو عاصمہ کی سانس جیسے وہیں تھم سی گئی۔ ایسا تو اس نے ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اس پر کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا۔

ہاں اب سوچنے پر اسے یاد آیا کہ وہ کچھ دنوں سے اسے پہلے سے کمزور ضرور لگا تھا۔ مگر اس نے خود ہی کہہ کر سر جھٹک دیا تھا کہ وہ آج کل پڑھائی میں شاید محنت زیادہ کر رہا ہے تو اس لیے کمزور لگ رہا ہے۔ مگر اس کمزوری کی وجہ۔۔۔ نشہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔ اس کا دل کانپ سا گیا۔

"یہ تو بہن جی! آج کل ایک عام سی بات ہو چکی ہے' پھر آپ کے بچے پہ تو نہ باپ کا سایہ ہے' نہ کسی بڑے کا ڈر' باہر نکلنے والا' اس کے پیچھے جانے والا کوئی مرد بھی نہیں تو ایسے لڑکوں کے ہاتھوں سے نکلنے کا زیادہ ڈر ہوتا ہے۔" وہ

مزید کہتا چلا گیا۔

"آپ تو الیاس بھائی! مجھے بہت ڈرا رہے ہیں۔ سچی بات ہے۔ مجھ میں تو اب مزید کوئی دکھ جھیلنے کی سکت نہیں اور اس کی رکھوالی کرنے کی تو ہمت بھی نہیں۔ میں تو بہت کمزور اور بے بس ہوں۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا تھا۔

"خدانخواستہ میرا مقصد آپ کو کوئی تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ سب میرا' آپ کا وہم ہو' واثق ایسی کسی کمپنی میں نہ انوالو ہوا ہو۔ بہرحال آپ گھر جائیں' میں خود جاتا ہوں اس کا پتا کرنے اور اسے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہوگا۔ آپ زیادہ پریشان نہیں ہوں۔" وہ اس کی حالت دیکھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

"الیاس بھائی! شام بہت ہو گئی ہے' میرا دل بیٹھا جا رہا ہے' ایسا کبھی بھی نہیں ہوا اور میں نے کل شاید اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کر دی تھی تو شاید اس سے خائف ہو کر وہ کہیں گھر سے بھاگ تو نہیں گیا۔" وہ ڈر ڈر کر خود ہی بولی۔

الیاس لمحہ بھر کو خاموش سا ہو گیا۔

"یہ بات بھی ہو سکتی ہے اور بہن ایسے بچوں پر سختی اکثر الٹا کام ہی کرتی ہے' آپ گھر جا کر ایک بار تسلی سے ہر چیز کی تلاشی لیتا ہو گی کہ کہیں وہ جاتے ہوئے اپنے کچھ کپڑے اور کچھ پیسے یا کوئی قیمتی شے تو ساتھ نہیں لے گیا' اگر گھر سے ایسا کچھ غائب ہے تو پھر واقعی۔۔۔ وہ کہیں چلا نہ گیا ہو۔"

"میرے خدا!" عاصمہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اور اب تو شام ہو چکی' اگر ایسا کچھ اس کا ارادہ تھا تو اب تک وہ شہر سے باہر کہیں دور نکل گیا ہو گا۔"

اور عاصمہ کی آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے چکراتے سر کو تھامنے لگی۔

☼ ☼ ☼
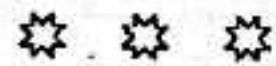
"یہ کیا ہے؟" عدیل حیران سامان کی طرف دیکھنے لگا۔ نسیم نے کچھ ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تینوں تصویریں اچھے گھر کی لڑکیوں کی ہیں' ان میں سے یہ نیلے سوٹ والی کی صرف چار ماہ ہی شادی۔ اس کے بعد ساس' نندوں نے ظلم ستم کر کے طلاق دلوا دی اور یہ گلابی کپڑوں والی ذرا سی عمر کی زیادہ ہے' مگر ابھی شادی نہیں ہوئی اس کی۔ خوب لمبا چوڑا جہیز اور پیسہ بھی دے رہے ہیں اماں باوا شادی میں۔۔۔ اور یہ تیسری سفید کپڑوں والی بچی میرے دل کو تو یہ بھائی ہے' عفت نام ہے اس کا۔ شکل کی بھی معصوم بھولی بھالی اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ ماں' باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ ان کی محرومی دیکھ رکھی ہے اس نے۔ چچا' چچی نے پالا ہے۔ بھلے جیسا بھی پالا ہو گا۔ ماں' باپ جیسا پیار تو نہیں دے سکتے نا۔"

نسیم سب کا بائیوڈیٹا بتاتے ہوئے سانس لینے کو رکیں۔

عدیل نے اکتا کر اس دوران تصویریں میز پر الٹا دیں۔ اس کے چہرے پر سوائے کوفت اور بے زاری کے اور کچھ نہیں تھا۔

نسیم باتوں کے دوران اس کا چہرہ بھی دیکھتی جا رہی تھیں۔

"پڑھی لکھی بی اے پاس ہے' سلائی کڑھائی میں ماہر' کھانا پکانا سب کچھ جانتی ہے۔ بہت فرماں بردار' ادب آداب والی بچی ہے۔ اپنی مثال کو ماں کا پیار بھی ملے گا اور اس کا خیال بھی رکھے گی۔" نسیم نے آخری لالچ دیا جس کے دھوکے میں عدیل آسکتا تھا۔

عدیل نے کچھ سوچتی نظر سے ماں کو دیکھا اور پھر ان تینوں تصویروں کے سب سے اوپر پڑی سفید کپڑوں والی عفت کو دیکھا۔

بے حد عام سی شکل' بے تاثر آنکھیں' عدیل کی نظروں کے سامنے بے اختیار بشریٰ کا خوب صورت چہرہ' اس کا سڈول فگر اور شان دار پہناوا آگیا۔

وہ اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

"بے شک عام شکل کی ہے' چہرے سے ہی مسکینی ٹپکتی ہے۔ پر میرے بچے! اچھا پہنے اوڑھے گی' خوش رہے گی محبت پیار ملے گا تو دیکھنا دنوں میں کیسے اس کا کملایا ہوا چہرہ کھلتا ہے۔"

"فار گاڈ سیک امی! میں نے کہا نا میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا بالکل بھی۔" اسے بشریٰ کے چہرے کے یاد آتے ہی اپنی اس ہتک کا احساس ستانے لگا جو اس نے احسن کمال سے شادی کر کے عدیل کے چہرے پر سجائی تھی۔

اے مسٹر عدیل.... مسٹر عدیل کہہ کر جتانے والا انداز بہت کچھ کہہ رہا تھا کہ دیکھو مجھے تم سے بہت بہتر اور شان دار مرد مل گیا ہے۔ وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بچے! میرے دم کا بھروسا نہیں۔ اب کچھ ہی اور چند سال ہوں' پھر تیری فکر کون کرے گا۔ بہن تو بیاہ کر چلی گئی باہر' بچی کے پیچھے ساری دنیا کو بھلائے بیٹھا ہے۔ اسی بچی کی بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔" وہ اس کو جاتے دیکھ کر پیچھے سے بولیں۔

"اس کی بہتری کا پہلے تو آپ کو کبھی خیال نہیں آیا۔ ایک غیر عورت اس کا بھلا کیا خیال رکھے گی۔ چھوڑ دیں امی! یہ خواب دکھانا مجھے' میری زندگی اب جیسے گزر رہی ہے گزر جانے دیں۔ میرے دل میں اب کچھ بھی نہیں۔ میں کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ اندر سے خالی ہو گیا ہوں بالکل۔" وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ماں صدقے.... خدا نہ کرے ایسا کچھ ہو میرے بیٹے! اللہ تمہاری زندگی دراز کرے' عمر لمبی ہو اپنی بچی کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈولی میں بٹھاؤ' اس کی خوشیاں دیکھو اور عدیل! بشریٰ سے تمہاری جدائی لکھی ہوئی تھی تقدیر میں اگر مجھے اس کی وجہ سمجھتے ہو تو میں اس پر تم سے معافی مانگ سکتی ہوں پر اللہ نے اس چیز کو یونہی لکھ رکھا تھا' وہ عورت تیرے ساتھ رہنے والی نہیں تھی۔ وجہ میں یا فوزیہ نہ بنتے کوئی اور بن جاتا مگر تقدیر کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یہ بات مانتا ہے نا تو؟" وہ آج سب کچھ مانتے ہوئے بہت سے اعتراف کر گئیں مگر یہ سب اب لاحاصل تھا۔

عدیل پلٹ کر کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

"بابا! یہ روم میرا ہے۔ پلیز' اس مثال کو کوئی اور کمرہ دیں یہاں مجھے رہنا ہے۔" سیفی' احسن کمال گھر میں داخل ہوتے ہی حکمیہ انداز میں باپ کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ مثال جو بشریٰ کے ساتھ کھڑی تھی۔ کچھ سہم سی گئی۔

"کیا ہوا بھئی۔ سائی سن' کوئی مسئلہ ہے ڈیر؟" احسن ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

"بابا! آپ لوگوں کے بیڈ روم کے ساتھ والا کمرہ مجھے پسند ہے سوات از مائن۔"

"تو تم لے لو۔ اس میں ناراضی کی کیا بات ہے' بھئی بشریٰ! میرا بیٹا جو کہتا ہے وہ ہونا چاہیے' میں اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ اوکے۔" احسن بظاہر نرم لہجے میں بہت کچھ جتاتے ہوئے بشریٰ سے بولا۔

ایکچوئلی احسن! مثال ابھی چھوٹی ہے' اسے رات میں اکیلے میں سونے کی عادت نہیں۔ ہمارے ساتھ والے روم میں ہو گی تو اسے اتنا خوف نہیں ہو گا جبکہ سیفی تو تھوڑا بڑا ہے اور میں نے اسے جو کمرہ دیا ہے۔ وہ اس کی

اسکوئنگ کے لحاظ سے.... مطلب کافی بڑا ہے' اس کی سب چیزیں اس میں با آسانی۔" بشریٰ پہلے وضاحت دینے والے انداز میں پھر سیفی کو دیکھ کر پیار سے کہنے لگی۔

"تھینکس بشریٰ! مام! مگر مجھے جو چیز پسند آتی ہے میں اس کو کسی کے بھی کہنے پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اس کمرے میں اپنا سامان سیٹ کروا رہا ہوں آپ اپنی ڈرپوک بیٹی کو اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر سُلا لیں۔ وہاں یہ بالکل بے خوف ہو کر سوئے گی۔" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں کہہ کر چلا گیا۔ بشریٰ کچھ شرمندہ سی کھڑی رہ گئی۔

"بہت Determinate ہے میرا بیٹا جس چیز پہ اڑ جاتا ہے پھر اسے کوئی پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ مجھے اس کی یہی بات پسند ہے۔ تم پلیز مثال کے لیے کوئی اور کمرہ دیکھ لو۔ یوں بھی اس کو یہاں اونلی ففٹین ڈیز تو رہنا ہے' یہ ایڈجسٹ کر لے گی۔ آفٹر دیٹ اسے اپنے فادر کے گھر جانا ہو گا۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں بچوں کو اتنا بیہودہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ رات کو اپنے بیڈ روم میں سو نہیں سکیں' مثال اب اتنی بڑی ہو چکی ہے کہ اسے اکیلے سونے کی عادت ہونی چاہیے۔ کیوں مثال؟" وہ مثال کو بہت سرسری انداز میں پچکار کر بولا۔

مثال صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔ بول کچھ بھی نہیں سکی۔ اس کے دماغ میں صرف احسن کی یہی بات گونج رہی تھی کہ اسے یہاں صرف پندرہ دن تو رہنا ہے۔ پندرہ دن بعد پاپا کے پاس۔ اس اتنے بڑے گھر میں امید کا ٹمٹماتا جگنو۔

بے اختیار وہ یونہی مسکرا کر سر ہلا گئی۔

"دیکھا۔ مثال بھی میری بات سے ایگری کر رہی ہے تو اسے کوئی اور روم دے دو۔" وہ مثال کے سر پہ ہلکا سا ہاتھ رکھ کر جانے لگا۔

"لیکن احسن! نیچے والے پورشن میں بیڈ رومز تو صرف دو ہیں' مطلب ماسٹر بیڈ روم اور ساتھ میں بچوں کے لیے ایک کمرہ' باقی بیڈ روم اوپر ہیں۔" بشریٰ کی پریشانی جیسے اس کی بات سے بڑھ سی گئی۔

"کم آن۔ تم کیا بچوں کو پریشان کر رہی ہو یار! اوپر والا بیڈ روم کون سا دوسرے ملک میں ہے' چند سیڑھیاں تو ہیں یہ وہاں رہ لے گی۔ اپنی بیٹی کو بہادر بناؤ یار! اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا چھوڑ دو اور یوں بھی صرف رات میں ہی تو سونے کے لیے اوپر جانا ہو گا۔ دن میں تو یہ یہیں نیچے تمہارے پاس ہوا کرے گی۔ اوکے۔" وہ کہہ کر رکا نہیں۔ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

بشریٰ مثال کے پریشان چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"مما! میں نانو کے پاس بھی تو رہ سکتی ہوں نا!" وہ آہستگی سے بولی۔

"دیکھو بھئی۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں تو اتنا دم نہیں کہ میں اس عمر میں ایک بچے کی ذمہ داری اٹھا سکوں ورنہ سو بار اسے اپنے پاس رکھ لیتی یوں بھی بچے تو اپنے ماں باپ کی نظروں کے سامنے ہی اچھے رہتے ہیں۔ مثال کو کب عادت ہے تمہارے بغیر رہنے کی۔" ذکیہ نے تو بشریٰ کے کہنے سے پہلے ہی یہ بات منہ پر کہہ دی تھی۔

"لیکن جان! آپ میرے پاس رہو گی' اپنی ماما کے پاس۔ نانو کے پاس کیوں؟" وہ اسے ساتھ لگا کر پیار سے بولی۔

"مگر ماما.... میں اوپر اکیلی نہیں رہوں گی۔ یہ نیا گھر ہے میں ڈر جاؤں گی۔" وہ سہم کر بولی۔

"جانو! میں اپنی گڑیا کے ساتھ سویا کروں گی نا۔" وہ اس کے خوف زدہ چہرے کو پیار سے تھپتھپا کر بولی۔

مثال اس کی بات پہ اور بھی پریشان ہو گئی۔

"ماما.... میں پاپا' دادو کے پاس بھی تو جا سکتی ہوں نا۔ آپ سے ملنے آجایا کروں گی۔" وہ کچھ دیر بعد ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مثال! تم اتنا ناپسند کرنے لگی ہو مجھے تو جاؤ ابھی چلی جاؤ۔ گیٹ کھلا ہے گھر کا۔ جاؤ اپنے باپ کو فون کرو' آکر

لے جائے تمہیں۔ امی ٹھیک کہتی ہیں میں تم پر ناحق اپنی محبت ضائع کر رہی ہوں۔ تم پھر بھی میری نہیں ہونے والی۔" بشریٰ کو ایک دم سے غصہ آگیا۔

"نن۔۔۔ نہیں مما! بالکل بھی نہیں۔ میں تو آپ کے پاس ہی رہنا چاہتی ہوں۔" وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔ مما نے ابھی اسے گھر سے نکال دیا تو۔۔۔ اسے تو اس نئے علاقے کے کسی بھی راستے کا پتا نہیں اور پاپا اگر اسے لینے نہیں آئے تو۔۔۔ وہ ڈر گئی تھی۔

بشریٰ اسے خود سے الگ کرتی اندر احسن کمال کے پاس جا چکی تھی اور مثال سہمی ہوئی اس شاندار لاؤنج میں اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سوری مما! وعدہ پرامس۔ آپ کو آئندہ کبھی یوں تنگ نہیں کروں گا وعدہ کرتا ہوں۔ میں آج صرف جاوید انکل کو بتانے گیا تھا کہ میں کل سے نہیں آسکوں گا مگر انہوں نے اپنے آدمی کے ساتھ مجھے شہر سے باہر کسی کوٹھی میں بجلی کا کام کرنے بھیج دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا بھی۔۔۔ مگر۔۔۔ پلیز مما! نہیں روئیں۔ میں اب کبھی آپ کی اجازت کے بغیر۔ آپ سے پوچھے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلوں گا۔"

وہ ماں کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگا تھا مگر اس کو اپنے آنسوؤں پہ بہت کنٹرول تھا۔

الیاس کے آنے سے پہلے وہ گھر واپس آگیا تھا مگر عاصمہ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

بار بار ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا مگر عاصمہ تو روئے جا رہی تھی۔

"میں کل سے اسکول بھی جاؤں گا اور پوری لگن سے محنت کروں گا۔ آپ کی ہر بات مانوں گا۔ ان شاء اللہ پاس بھی ہو جاؤں گا۔ پلیز اب تو نہ روئیں۔" وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے منت سے بولا تو عاصمہ نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

اس کی شرمندگی، اس کی معذرت میں بہت سچائی تھی۔ عاصمہ کو اپنے بیٹے پر دل سے یقین آگیا۔ واثق نہ جھوٹا تھا اور نہ کسی ایسی ویسی کمپنی میں مبتلا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا۔

اگلے ہی دن وہ اس کے اسکول جا کر پرنسپل کی منت کر کے اسے ری ایڈمٹ کروا آئی تھی۔

ٹیچرز نے بھی واثق کے پچھلے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے ہر طرح کی مدد تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

عاصمہ نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ اسے لگا واثق بہت دور جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔

اللہ نے اس پہ بہت رحم کیا تھا۔ اس کے اثاثے کو بچالیا تھا ورنہ الیاس بھائی نے جس طرح کا نقشہ کھینچا تھا۔ وہ تو اندر تک ہل کر رہ گئی تھی۔

واثق اگلے دن باقاعدگی سے اسکول جانے لگا۔ عاصمہ کو پھر سے اس کے ساتھ کچھ بھی کرنا نہیں پڑا تھا۔ اللہ نے اس آزمائش کے بعد اس کے راستے سیدھے کر دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

اندھیرے میں وہ بہت خوفناک چہرہ تھا۔ بہت لمبی سرخ زبان تھی اس کی اور سفید ابلی ہوئی آنکھیں۔ کالا سیاہ داغ دار چہرہ اور سیاہ جسم اس کے ہاتھوں کے نوکیلے لمبے ناخن اس کے چہرے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

مثال کی نیند سے جاگی آنکھیں خوف سے بند ہونے لگیں۔ دوسرے لمحے وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے چیختی چلی گئی۔

یکایک گھپ اندھیرے میں بے تحاشا روشنی ہو گئی تھی۔ بشریٰ اسے ساتھ لگائے چمٹائے اسے سنبھالنے کی

کوشش کر رہی تھی مگر وہ آنکھیں بند کیے چیخے جا رہی تھی۔

"چپ کر جاؤ لڑکی! بس کرو۔" احسن کمال کی دھاڑ نے اس کی چیخیں تو کیا اس کی سانسیں بھی جیسے بند کر دیں وہ شاکڈ سی دیکھتی رہ گئی۔

احسن کمال نائٹ ڈریس میں اس گھوسٹ سے مشابہ لگ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے اس کا خون پینے لگا تھا۔

"احسن۔۔۔ وہ ڈری ہوئی ہے، اس طرح تو نہ چیخیں۔" بشریٰ کو بہت برا لگا۔

"یار! حد ہے۔ کیا ہے ادھر ایسا جس سے یہ ڈری ہے اور اب ہم ہیں اس کے پاس اور یہ چیخے جا رہی ہے۔ سوری بشریٰ مگر میں تمہیں صاف بتا رہا ہوں۔ تمہاری بیٹی از این ایکٹریس۔" وہ سخت ناگواری سے کچھ بھی نہ چھپاتے ہوئے بولا۔

"واٹ!" بشریٰ جیسے غصے میں اچھل ہی پڑی ۔۔۔۔ "تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو، وہ ابھی بھی خوف سے کانپ رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو یہ ایکٹنگ کر رہی ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"اچھا اب تم اس کا خوف دور کرو۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ آدھی رات کو سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ یہی تربیت ہے تمہاری۔" ہونہہ! اس نے چند دنوں میں نہیں چند گھنٹوں میں روپ بدلا تھا۔ "جلدی آجانا میں انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔"

بشریٰ کو یک بیک اپنی خود کردہ غلطی کا احساس ہوا تھا۔

اسے شوہر مل گیا تھا مگر اس کی بیٹی کا باپ چھن گیا تھا۔ اور اب شاید ماں بھی چھن جائے۔

اور وہ جاتے ہوئے اس سے جو کہہ کر گیا تھا اگر وہ اس کے پیچھے نہیں جاتی تو۔ دوسری بار اس کا گھر۔ عدیل کی بات ٹھیک تھی۔ مثال کی وجہ سے اس کا گھر۔۔۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میں اپنی بیٹی کو کبھی خود سے دور نہیں کر سکتی۔" وہ سر جھٹک کر خود سے بولی۔

☼ ☼ ☼

سیفی کا رویہ بھی اس سے بہت بدل چکا تھا۔ وہ اس سے یوں بات کرتا جیسے وہ کوئی ملازمہ ہو۔ اور تو اور بشریٰ بھی مثال سے سیفی کی بات ماننے کو کہتی تو اسے اور بھی دکھ ہوتا۔

اسے تو یوں لگ رہا تھا، اس کی ماں اس نئے گھر میں آکر بالکل کوئی اور عورت بن گئی ہے، اس بشریٰ سے بہت مختلف جو عدیل کے گھر میں تھی یا جو نانو کے گھر میں تھی۔

وہ اس کا یونیفارم دھلوانا بھول جاتی۔ یونیفارم دھلا ہوتا تو استری نہیں ہوتا تھا، وہ کتابیں پیچھے لے کر پھرتی رہتی۔ بشریٰ کو اور بہت سے کام اس کو پڑھانے سے زیادہ اہم لگتے۔

آہستہ آہستہ مثال اپنی ماں کی زندگی سے جیسے خارج ہوتی جا رہی تھی۔ صرف خارج ہی ہوتی تو اسے اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ وہ اب اس سے بالکل اجنبیوں جیسا سلوک کرنے لگی تھی۔ مثال رونا چاہتی اور کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ کس سے گلہ کرتی۔ نانو کی طرف جاتی تو وہ بھی اس سے غیروں کی طرح ملتیں۔ زیادہ پذیرائی دونوں گھروں میں سیفی کی ہوتی تھی۔ اور پھر اس کے کانوں میں یہ بھی پڑا کہ سیفی کی بہن یا بھائی آنے والا ہے اور اس کا معصوم دماغ بہت سارے دن اس گتھی کو بھی نہیں سلجھا سکا۔

پاپا کے گھر صورت حال اور بھی عجیب تھی۔ دادو اس کو دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگتیں۔ ان کے حساب سے مثال کے آتے ہی گھر کے کام بہت بڑھ جاتے تھے۔

پہلے تو وہ باسی کھانے یا ہوٹل سے منگوا کر گزارہ کرلیتی تھیں مگر مثال کے آتے ہی۔ عدیل مختلف فرمائشی پروگرام جاری کردیتا جنہیں پورا کرنے میں نسیم کی حالت خراب ہوجاتی۔

عدیل ہاتھوں سے نہ نکل جائے' وہ ہر بات بلا چوں چرا مان لیتیں مگر عدیل کی غیر حاضری میں وہ مثال کو اس کی ماں کو خوب سناتیں۔ اور پاپا کے گھر تو اسے اکثر ہی گندے یونیفارم کے ساتھ اسکول جانا پڑتا۔ وہ پڑھائی میں بھی بہت عجیب ہوتی جارہی تھی۔

ٹیچرز کے بلانے پر بھی بشریٰ اس کے اسکول جانے کا ٹائم نہیں نکال پاتی تھی۔ عدیل دو ایک بار گیا مگر پھر اس کے بھی آفس کے کچھ ایسے ٹرپ نکل آئے جو شہر سے باہر تھے۔

مثال کے لیے ماں باپ ہی نہیں ہر چیز بدل گئی تھی۔

نسیم تو اب باقاعدہ مثال سے جھاڑو اور برتن دھلوانے کا کام عدیل کی غیر موجودگی میں لینے لگی تھیں۔ مسلسل بازار کے کھانے کھانے سے مثال کو ڈائریا ہوگیا اور اس کے بعد بخار جو بگڑ کر ملیریا بن گیا۔ بشریٰ اسے اپنے گھر بلوانا بھول گئی۔ مثال کی حالت دیکھ کر پہلی بار عدیل کو احساس ہوا کہ بچی کو سنبھالنے کے لیے گھر میں کسی عورت کا وجود کتنا ضروری ہے۔

"میں تیار ہوں امی! شادی کے لیے' آپ جہاں کہیں گی جس سے کہیں گی میں کرلوں گا۔ میری شرط صرف یہی ہے کہ وہ مثال کا بہت خیال رکھے گی' اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھے گی۔"

اور نسیم کو تو جیسے شادی مرگ ہوگیا تھا۔

اگلے ہی ہفتے وہ عام سی شکل والی مرنجان مرنج عفت' مثال کی نئی ماما بن کر آگئی۔ نسیم اور عدیل کی ہدایت کے عین مطابق اس نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی مثال کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

اس دوران بشریٰ کے گھر ایک اور گڑیا آچکی تھی جو سیفی کی لاڈلی بہن اور احسن کمال کی آنکھ کا تارا تھی۔

اور بشریٰ کے لیے احسن کمال کی زندگی میں قدم جمانے کی باقاعدہ سند۔ مثال تو ان بہت سارے دنوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

عفت نے اسے اتنی محبت' اتنی توجہ دی کہ وہ بشریٰ کو واقعی جیسے بھول چلی تھی۔

"ہاں میں بھجوا رہا ہوں مثال کو تھوڑی دیر میں۔" عدیل فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

"عفت! مثال کا بیگ تیار کردو' اسے اس کی ماما کے پاس جانا ہے۔" مثال صدمہ سے باپ کی طرف دیکھتی چلی گئی۔

"پاپا۔ میں نے… مجھے ابھی نہیں جانا۔ کہیں بھی۔ میں آپ کے پاس۔ عفت ماما کے پاس رکوں گی۔ یہیں۔" وہ بہت مشکل سے آس بھرے لہجے میں بولی تھی۔

ماں کی طرف سے تو وہ بہت مایوس ہوچکی تھی۔ اب وہ بشریٰ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی مگر عدیل کی طرف ابھی اس کے دل میں بہت سی امیدیں تھیں۔

"میری بیٹی!" عدیل نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ اور پیچھے کھڑی بنی سنوری عفت پہ نظر ڈالی جو چند دن کے لیے اپنے چچا کے گھر جانے والی تھی۔

اور نسیم کا کہا سچ ہوا تھا۔ عام سی شکل والی سادہ سی عفت پہ شادی کے چند دنوں میں ایسا غضب ناک رنگ و روپ آیا تھا اور اس کا سوکھا سڑا جسم ایسا بھرا بھرا ہوگیا تھا کہ بہت سارے دنوں سے عدیل نے ایک بار بھی بشریٰ کو یاد نہیں کیا تھا۔ اور ابھی بھی عفت کی شرمگیں نگاہیں اور دمکتا روپ اس سے بہت کچھ کہہ رہا تھا جسے وہ نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔

"نہیں میری جان! آپ کی ماما کو آپ کا انتظار ہے۔ ان کے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز بھی ہے۔ آپ جاؤ گی تو خوش ہوجاؤ گی۔ پندرہ دن بعد تمہیں لینے آجاؤں گا۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی اوکے میری جان۔ کچھ چاہیے تو نہیں۔"

اور مثال تو دم بخود سی رہ گئی۔ عدیل نے کس طریقے سے اسے خود سے ہٹا کر عفت کی طرف اپنی توجہ کی۔

"یار! سامان پیک کرو مثال کا۔ اس کی ماں کا ڈرائیور لینے آرہا ہے اسے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت سے محبت بھرے پیغام چھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور میری پیکنگ… مجھے بھی تو جانا ہے چچا جان کی طرف۔ وہ بھی تو کرلوں نا!" عفت ادا سے پلکیں جھکا کر بولی۔ "مجھے بھی وہاں رہنے جانا ہے۔"

"تمہیں تو میں اچھی طرح جانے دوں گا۔ کہیں نہیں جارہی ہو تم۔ ملنے جانا ہے تو آدھے گھنٹے کے لیے ملوا لاؤں گا۔ رات رہنے کا تو سوچنا بھی نہیں۔" عدیل پیار بھری سرگوشی میں چھیڑ چھاڑ کرتے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔ باہر بشریٰ کا ڈرائیور مثال کو لینے آچکا تھا۔

مگر یہ تو بہت شروع کی باتیں تھیں جب دونوں طرف سے اسے لینے ڈرائیور آیا کرتے تھے' اور کوئی اس کا منتظر ہوا کرتا تھا۔

زوردار چھناکے سے جیسے بہت سے کانچ کے برتن ایک ساتھ ٹوٹے تھے' اور اندر باتیں کرتے سب ہی لوگ بے اختیار ٹھٹک کر ادھر دیکھنے لگے جدھر سے آواز آئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کچھری بجی تھی۔ چارپائیوں پر مرد بیٹھے تھے اور ان سے ذرا دور زمین پر عورتوں کا گروہ تھا۔ اس میں ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ وہ سب زمین پر بیٹھی تھیں۔ کچھ بہت بڈھیوں نے چہرے کھول رکھے تھے۔ ان کے بیٹھنے کا مخصوص انداز تھا۔ گھٹنے سامنے کھڑے رکھ کر ان پر کہنیاں ٹکالیتیں اور ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا کر آپس میں جوڑ لیتیں۔ گفتگو اگر سنی نہ بھی جا رہی ہو تو دور کھڑے کسی بھی شخص کو ہاتھوں کی حرکت سے موضوع معلوم ہو سکتا تھا۔ کبھی تاسف سے ہاتھ ملتیں، کبھی وہی جڑے ہاتھ ماتھے سے ٹکالیتیں اور سر گھٹنوں میں دے دیتیں۔ کبھی سر اوپر آسمان کی سمت

سائرہ رضا

اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھر کے اوپر والے سے رحم مانگ لیتیں۔ بے نتیجہ او طاق جب ختم ہوتی تو ان ہی ہاتھوں کو جھاڑ کر اپنی راہ لیتیں۔

اب بھی بڈھیوں کے چہرے اوپر تھے اور وہ نیم وا ہونٹوں سے مردوں کی کچھری سن رہی تھیں۔ جوان عورتوں کے چہرے گھونگھٹ میں چھپے تھے۔ بول کچھ نہ رہی تھیں، سن سب رہی تھیں۔ پاس ہی ننگ دھڑنگ کمزور سوکھے بچے کھیل رہے تھے۔ ماؤں کے اس گروہ کے گرد طواف کرتے تھے۔ آپس کی لڑائی ذرا سنگینی اختیار کرلیتی تو جھٹ اپنی اپنی ماؤں سے لپٹ جاتے۔ مائیں کبھی چمکار لیتیں، کبھی دھتکار دیتیں۔

سر پر تپتا بے رحم سورج۔۔۔ اور ریت پر اس بے فکری سے بیٹھی تھیں جیسے کسی ایرانی غالیچے پر براجمان ہوں مگر وہ سب تپش آشنا تھیں۔۔۔ یہ تو معمول کی بات تھی۔ اس میں کیا نیا۔

صحرا کی ریت اپنے مزاج میں انوکھی تھی۔ دن کو گرم ترین اور رات کو ٹھنڈی ٹھار۔

ماؤں کی چھاتیوں کو چوستے بچے سیری حاصل نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ پوری جان لگا کر دودھ کھینچتے مگر کہاں۔۔۔ ماؤں کے پیٹ بھرتے تو دودھ تیار ہوتا نا۔ یہاں پیٹ بھر سیری تو دور سوکھے حلق میں قطرے ٹپکانے جتنا پانی بھی نایاب ہو رہا تھا۔

ناکامی پر لاغر بچے جیسے جنونی ہو جاتے۔ وہ بعض دفعہ بہت زور سے ماں کی چھاتی کو اپنے ایک، دو دانتوں سے چبا ڈالتے۔ یا پھر اپنا سر زور، زور سے بغل میں مارنے لگتے۔ مگر ان میں سے کچھ اتنے نحیف ہو چکے تھے کہ وہ اس طرح کا ردعمل بھی نہ دے پاتے۔ ان کے لیے رونا بھی محال تھا۔ بلی کے بچے جیسی چیاؤں کی سی آواز میں احتجاج کرتے تو بہت غور سے کچھری سنتی ماں چونکتی اور بچے کا رخ بدل کر اسے دوسری چھاتی سے لگا دیتی کہ ادھر اگر کچھ قطرے ہوں۔۔۔ بچہ کو کچھ تو میسر آئے۔

اب تو گائے بکریوں کے تھن بھی سوکھ گئے تھے۔ دودھ کہاں سے آتا۔ سوکھی جھاڑیاں اور ڈنٹھل تک ختم ہو گئے تھے۔ ذخیرہ کیا ہوا، سوکھا چارہ بھی بس خاتمے پر تھا۔ معصوم صورت بھولے بھالے یہ جانور اپنے

پرانے ساتھیوں کے پنجر کے پاس سے نظر چرائے گزرتے تھے کہ کل کو وہ.... بھی.... تو.... آہ۔

اللہ کا انتظام اللہ ہی جانے۔ تھر کی ریت پر انسان اور جانور بھوک پیاس سے نڈھال تھے۔ وہیں گدھوں، چیلوں، کوؤں کی سیری کا یہ عالم تھا کہ بھرے پیٹ کی غنودگی سے اونگھتے۔ سرحد پار سے اڑ اڑ کر آتے۔ جگہ جگہ ان گنت مردہ جانور ان کی خوراک تھے۔

ہر سو سوکھا پڑا تھا۔ ہونٹ، زبان، آنکھیں۔ کھیت، کھالے۔ کنویں، پنڈت نند داس کی دی جانے والی اطلاع نے بھگتوں کے دل جلائے تھے۔ اب کچھ دن سے نہ تو پرساد چڑھا۔ اور نہ اب دیا جلانے کو تیل رہا۔ صرف گھنٹی بجا کر دیوی کے آگے ہاتھ باندھ کر وہ کتنی ہی دیر کھڑے رہے۔ پراتھنا کے لیے بہت کچھ تھا، مگر ہونٹوں سے ایک شبد بھی نہ نکلا۔

یعنی اب مندر میں دیا بھی نہ جلا۔

بھوکے پیاسے انسانوں کے دل پر آرے چل گئے۔ ایسی بدحالی۔ آہ۔ دیے کا کیا۔ دیا جلانے والے مرنے کو ہو گئے تھے۔

بے حد دکھ بھرے ان پلوں میں ہنسی کی قل قل پر سب ہی چونکے تھے۔ شوخ رنگوں کے گھاگھرے پر لمبا گھونگھٹ گرائے سر پر مٹکے اٹھا کر آتی لڑکیاں۔

سب مرد و زن کی نگاہیں واپس پلٹیں اور مایوسی سے جھک گئیں۔ بڑے دنوں سے خبر تھی پانی کا ذخیرہ بس اختتام کو ہے۔ لیکن ابھی۔ آج سب نے لڑکیوں کی چال ہی سے بھانپ لیا تھا۔ صرف ایک مٹکے میں پانی تھا۔

اتنی بدحالی کے زمانے میں بھی یہاں آپا دھاپی نہیں تھی کہ چھینا جھپٹی کرتے اپنے تینوں مٹکے بھر کے اپنا گھر پورا کرتے۔ سب نے کسی کی بھی ہدایت کے بغیر تنبیہہ کے بنا ایک ایک مٹکا بھرا تھا۔ آج کا دن اس پر گزارا کرتے۔ کل کے لیے ایک اور لے آتے۔ اگر ابھی ہی وہ بھر لاتیں تو کل کیا کرتیں۔

لڑکیاں چندیل کے لیے کچہری کے آگے رک کر اپنی جھونپڑیوں کی جانب چلی گئی تھیں اور ان سب میں امر کلا نہیں تھی۔

امر کلا کی ماں لمبا گھونگھٹ نہیں نکالتی تھی۔ وہ دوپٹے کا ایک کونا دانت میں داب کر پردہ کرتی۔ اس کی پیشانی چھپی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے کسی کی بھی نگاہوں میں آئے بغیر رام چند کو دیکھا کہ اس کی لاڈلی اسی کے لاڈ پیار کے کارن من مانیاں کرتی ہے۔ ماں کی حد نگاہ ٹیلے تک تھی اور پانی کا کھالا ٹیلے کے پیچھے تھا۔ وہ آجاتی تو ماں کچھ پکانے کا بندوبست کرتی۔ وہ کیونکر پیچھے رہ گئی۔ ماں کے اندازے صد فی صد درست نہیں تھے۔ مگر بہت سارے امکانات موجود تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ سب چھوکریوں کے ساتھ ہی نکلی تھی۔ سب کے قدموں میں اب پہلی سی تیزی اور ترنگ نہیں رہی تھی۔ پانی بھرنے کے لیے جانا ایک سماجی رابطہ تھا جیسے۔ وہ میلوں دور ننگے پیر چلتی جاتیں۔ کبھی کسی نے اس کام کے لیے نہ تو تھکاوٹ کا اظہار کیا تھا نہ بیزاری کا۔ یوں جاتیں جیسے مذہبی ارکان پورے کرنے ہوں۔

بغیر تھکے۔ شاداں فرحاں نپے تلے قدم اٹھاتیں۔ سر پر مٹکے، نہ کمر لچکتی، نہ پیر اکھڑنے دیتیں کہ مٹکا گر کے پھوٹے اور پانی جیسی انمول نعمت۔ بانجھ ریت کی ہوس کا شکار ہو جائے۔ ریت پانی کو پلک جھپکنے میں اپنے اندر سمو لیتی تھی۔ نشان بھی نہ چھوڑتی اور پانی کوئی گرانے کی چیز ہے۔ توبہ۔ توبہ۔

راند کیشن چھوریاں جیسے گونگی ہونے لگی تھیں۔ سوکھے کے زمانے میں اور ہریالی کے زمانے میں بڑا فرق تھا۔ نہ تو وہ ایک دوسرے پر پانی اچھالتیں، نہ کوئی تھری لوک گیت گاتیں۔ ایک سناٹے کی سی کیفیت میں گھری دن بدن کم ہوتے پانی کو تکتیں۔ جہاں سے اب مٹکے بھرتی تھیں۔ جہاں کھڑی ہوتی تھیں۔ وہ جگہ کبھی

واڑ کا عین درمیانی حصہ تھا۔ سوکھے کا یہی حال رہتا تو کچھ دن بعد یہ جگہ بھی راستہ بن جاتی اور کوئی نہ مانتا کہ کبھی پانی کا بہت بڑا ذخیرہ رہا تھا۔ ایسا ہی کرتی تھی تھر کی یہ ریت۔ نام و نشان تک مٹا ڈالتی۔

واڑ پر آج ویسے ہی خاموشی اور سناٹے کا ماحول رہا۔ سب کی سب بہت صدمانی کیفیت میں گھری پانی کے اس ذخیرے کو دیکھتی تھیں۔ جواب شاید چند روز تک ہی۔ سوکھا تو ہر سال ہی پڑتا تھا۔ تھر کی زندگی کا معمول تھا مگر اس بار۔

تھری منہ اٹھا کر آسمان کو تکتے رہے جہاں سورج سینہ تانے آب و تاب سے چمکتا تھا۔ روشن چمک دار دن۔ نیلا شفاف آسمان۔ تھر کی زمین چٹخ گئی اور تھریوں کی جلد بھی۔

وتھار خالی پڑے تھے۔ دھراڑ (چرواہے) واندو (فارغ) ڈھور ڈھنگو پکی پکھو (جانور، پرندے) پیاس پیاس چلانے لگے تھے، مرنے لگے تھے۔

بارو بکھ بکھ کرتے۔

اب میلوں دور جا کر بھی پانی نہیں تھا۔ کنویں تھے ہی نہیں، جو تھے وہ سوکھ گئے۔ یہ آخری ذخیرہ تھا جو بس اپنے اختتام کو تھا آج یا کل۔ بس۔

چھوکریاں بہت نامراد و اداس لوٹی تھیں۔ باتیں بھی کرتی آئی تھیں اور ہنسی بھی تھیں۔ مگر وہ ترنگ نہیں تھی۔ باتیں مایوس اور ہنسی زخمی زخمی سی۔ اسی ایک مٹکے سے سارا دن گزارنا تھا اور گزارے کا مطلب صرف کھانا بنانا اور پانی پینا۔

امر کلا کو بھی ماں نے جلد آنے کی ہدایت کی تھی مگر ہدایات بھول کر اپنی مرضی سے چلنا اس کی فطرت تھی۔ ماں کی لاکھ پھٹکاریں بھی اسے بدلنے سے قاصر تھیں۔ ماں کے اپنے مسائل تھے تو امر کلا کے اپنے۔

وہ لاپروا تھی، منہ پھٹ بھی۔ نصیحتیں اس پر اثر نہیں کرتی تھیں۔ باپ کی لاڈلی تھی۔ وہ ماں کی مار کے بیچ آہنی دیوار بن جاتا۔ بچپن سے لمبی تھی، ساتھ کی سکھی سہیلیوں سے بڑی دکھائی دیتی۔ اب چودھویں کے سن میں آ کر دور سے آتی ایک بیاہتا عورت دکھائی دیتی۔

وہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم عمروں سے یکدم کٹ گئی۔ کچھ فطرتاً "سب سے الگ تھی۔ باقی لڑکیاں اسے چھوٹا سمجھ کر منہ نہ لگاتیں۔ مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کی اپنی ہی دلچسپیاں تھیں۔ جو دوسروں کے لیے قطعاً "احمقانہ پن تھا۔

اب بھی وہ چھوکریوں کے جلو میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے رکنے پر باقیوں نے اسے پکارا تھا۔ وہ متوجہ ہی نہیں تھی۔ مٹکے اتار کر زمین پر رکھے اور خود ریت پر جھک گئی۔ تب باقی کی لڑکیاں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اس کے چری (جھلی) ہونے کا کہہ کر آگے بڑھنے لگیں کہ اب وہ اپنی مرضی ہی کرے گی۔ پہلے سے اس کی ماں چولہے کے پاس سر پر ہاتھ رکھے اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

مگر امر کلا کوئی ایسے ہی تو نہیں رکی تھی۔ کتنے دنوں بعد یہ منظر دیکھا تھا اس نے۔ وہ ریت پر بیٹھے بیٹھے ہی دور تک دیکھنے لگی۔ وہ کچھ ٹٹول رہی تھی نظروں ہی نظروں میں۔ یہ پنجوں کے نشان تھے۔ مور کے پیروں کے نشان۔ امر کلا نے پہلی نگاہ ہی میں بھانپ لیا تھا۔ یہاں سے تین مور گزرے ہوں گے۔ اس کے ہاتھ میں مور کا کھمب تھا۔

تھر کی خشک سالی سب کو کھا گئی تھی۔ جانداروں کو ان کی ہنسی کو، خوشیوں کو گنگناہٹ کو اور رقص کو۔ موروں نے کب سے ناچنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے ہی وبا سے وہ آدھے سے بھی کم رہ گئے تھے۔ جو باقی ماندہ تھے۔ وہ نجانے کہاں چھپ کر جا بیٹھے تھے۔ صحرا کا حسن مور۔ صحرا کی تھرک مور۔ صحرا کا رنگ مور۔ اور مور۔ مر رہے تھے۔ مر چکے تھے۔

اب تو ناچتے ہی نہیں تھے بھول گئے تھے۔ مگر جب بھی کھمب پھیلا کر جھومتے تھے، بے خود ہوتے تھے۔ تب رقص کے جنوں کے عالم میں۔ کھمب چھڑ جاتے۔ تھر کے باسی کسی بھی ویرانے میں کسی جگہ

پر جب کھمب گرے دیکھتے تو سمجھ جاتے 'یہاں موروں نے محفل سجائی تھی۔ یہاں جھومے تھے' مدہوش ہوئے تھے۔

اور یہی کھمب اگر پنجوں کے نشان کے ساتھ کسی راستے پر پڑے دکھائی دیتے تو تھرواسی جان لیتے 'یہاں سے مور گزرے ہوں گے۔ صحرا کی خاکستری ریت پر بہار کے دنوں میں جگہ جگہ یہ کھمب پڑے دکھائی دیتے تھے۔ انہیں چُن لیا جاتا اور مندروں' مزاروں میں ان سے جھاڑو بنا کر پھیری جاتی اور کتنا عرصہ ہوا مور نہ رقص کرتے تھے' نہ کہیں آتے جاتے۔۔۔ نجانے کہاں منہ چھپا کر پڑے تھے۔

امر کلا کو وہی کھمب ملا تھا اور ساتھ پنجوں کے نشان۔۔۔ سبز کاسنی نیلا سیاہ سنہرا پر۔۔۔ اس نے ان نشانوں کو دور تک جانچا اور پھر دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی نقش پا پر چلتی گئی۔ مٹکے دور پڑے تھے اور وہ آگے بڑھتی گئی۔

ایک اور کھمب۔۔۔ کچھ قدم اور دو مزید۔۔۔ مٹکے بہت دور رہ گئے۔ اس کے ہاتھوں میں کھمب بڑھتے جا رہے تھے۔ امر کے چہرے پر ایک خوشی اور جوش بھی بڑھتا جاتا تھا۔ اتنا آگے آنے کے بعد اب نشان ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ یعنی مور یہیں کہیں تھے اور وہ اسے نظر بھی آ گئے۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ یہ تین مور تھے۔ دو ڈیل (مورنی) اور ایک مور ڈیل چونچ مار کے نجانے سخت چٹخنی زمین سے کچھ نکالنا چاہ رہی تھی۔ مور سر گھما کر اپنی گردن پر مسلسل ٹھونگے مار رہا تھا۔

ان سے پرے ہو کر بیٹھی ایک ڈیل کبھی چونچ سے اور کبھی پنجوں سے اپنا جسم کھجلاتی تھی۔ وہ کسی بیماری کا شکار ہو کر نیم جان لگتی تھی۔

گھنے رنگین پر جو برسات کے دنوں میں پشت پر کسی چادر کی طرح تن جاتے تھے۔ کسی تاج کی طرح کھر جاتے تھے۔ کسی شان سے بچ جاتے تھے۔ زمین پر ان کے پیچھے اب گھسٹتے تھے۔ جیسے مور اب ان کا بوجھ سہار نہ پاتے۔

امر کلا کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کچھ پر اس کے پیروں پر گرے تو وہ چونکی۔ اس کا دل بھر آیا۔ رونے کی خواہش ابھری' مگر یہ بھی کہاں ممکن تھا۔ تھرواسیوں کے بھی تو آنسو خشک ہو چکے تھے۔ وہ پیروں کے بل بیٹھ کر کتنی ہی دیر موروں کو دیکھتی رہی' جنہیں اس کی موجودگی سے فرق نہ پڑا تھا۔

نجانے کتنی دیر بیٹھی رہتی۔ ٹن ٹن کی آواز پر چونکی یہ ڈھنگے گاڈیں کی آواز تھی۔ لگتا تھا کوئی شہر سے آ رہا تھا۔ وہ چونکی۔ جب آئی تو پھری بجی تھی۔ ساتھ ہی ماں بھی یاد آ گئی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے نڈھال سی اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہت صابر تھے تھرواسی۔۔۔ بہت شاکر تھے۔ مگر امر کلا کی ماں نے جب اسے' بہت طویل انتظار کے بعد خراماں خراماں آتے دیکھا اور ہاتھ میں مور کھمب۔۔۔ سارا منظر آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

وہ اتنی دیر سے آنے کے بعد۔۔۔ ماں کو خود کا منتظر پا کر بھی مجال تھی' جو ذرا بھی تیز ہوئی ہو۔ مٹکا چولہے کے پاس رکھ کے جھونپڑے کے اندر چلی گئی۔

"ارے۔۔۔" ماں کو پتنگے لگ گئے۔ اندر گھسی ہی کیوں۔۔۔ اور نکلی کیوں نہ اب تک۔

"او چھوکری۔۔۔ اری او چلولی" اس کی آواز باٹ دار تھی۔ جواب نہ ملنے پر وہ بکتی جھکتی اندر گھس گئی۔ وہ کھمب بہت احتیاط سے سنبھال رہی تھی۔ جہاں بہت سے پر پہلے ہی رکھے تھے۔

"منھنجو نالو امر کلا اے ماں!"

"ہاں ہاں دیکھی تیری کلائیں۔ (فنکاریاں) باپ نے نام تو رکھا ریڈیو سے سن سن کر۔ نام کا اثر آ گیو۔ چھوکری پورا ریڈیو بن گئی۔ تو ادھر واثر پر گانا گاری تھی۔"

امر کلا نے لب بھینچ لیے۔

"گانا نہیں تھا ماں' پر اتنا تھی کہ اے ٹھاکر جی! اب تو مینہ برسے۔"

وہ واقعی لوک گیت گا رہی تھی' جس میں تھر کی پیتا کا ذکر تھا۔ دکھ۔۔۔ آنسو۔۔۔ انتظار۔۔۔

امر کلا کا باپ ریڈیو کا شوقین تھا۔ بغل میں داب کر رکھتا۔ یہاں سگنل بڑی مشکل سے ملتے تھے۔ وہ اپنے شوق کی خاطر ٹیلے پر چڑھ کر سنتا۔

ماں کو جتنی چڑ تھی اس شوق سے۔۔۔ آگے وہی کے اندر بھی آ گیا۔ بچپن کی تو خیر تھی' پر اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ مگر عقل تلوے سے بندھی تھی۔

ماں گھونگھٹ نکالنے کو کہنے لگی تھی۔ اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ وہ کھلے منہ سے پھرتی۔ جہاں ماں کو نظر آ جاتا۔ وہ گھونگھٹ نیچے کھینچ دیتی۔ ماں ادھر ادھر ہوتی گھونگھٹ پلٹ دیتی۔ رسی کو دتی۔ اندھا دھند بھاگنے ٹکرانے کا تو ثانی نہیں۔ سب سے بڑھ کر جو قابل گرفت بات تھی۔ وہ ماں کا ہاتھ نہ بٹاتی تھی۔

ماں سگھڑ زال (سلیقہ مند) تھی۔ اس کا سلیقہ قابل دید تھا۔ سینے' کڑھائی کرنے میں ماہر تھی۔

اور وہی۔۔۔ امر کلا جیسی نکمی۔۔۔ ماں اسے کبھی نام سے نہ پکارتی۔ اس نے اپنی مرضی کے بہت سے نام رکھ چھوڑے تھے۔ جس وقت جی چاہتا اسی سے پکارتی۔

"تو کھمب جوڑتی رہی۔" ماں کا لہجہ آج ٹوٹا سا تھا۔ "پتا تھا میں پانی بنانے کو انتظار میں تھی۔"

"ماں! اتنے دنوں بعد تو پکھی دیکھے۔ دل نہ رہا ماں۔۔۔ ڈھور مرنے کو ہو گئے' پکھی نجانے کدھر کو اڑ گئے۔ بس دیکھا تو دل کیا دیکھتی رہ جاؤں۔"

"اور اب تو نجانے کتنا وقت لگ جائے گا پکھی کو چھوڑ گھر سنسار کو دیکھنے کے لیے بھی۔" ماں کا لہجہ بھی کھویا کھویا سا ہو گیا۔

"کیا مطلب ہے ماں؟"

"گوتم آیا بیٹھا ہے' اس نے سب کو۔۔۔" ماں کا گلا رندھ گیا۔ وہ آگے بول ہی نہ سکی۔ امر کلا کی سب سمجھ میں آ گیا۔ گوتم کے آنے پر سب ایسے ہی افسردہ ہو جاتے تھے۔ وہ بات ہی ایسی کرتا تھا جو کسی کو قابل قبول نہ تھی۔

"تو آنے دے ماں۔۔۔ ہر بار ہی آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ یہاں کون ہے جو اس کی سنتا ہے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر بے پروائی سے کہا۔ "بس سب اور ای بیٹھے رہیں گے' مرتے رہیں گے۔ ابھی پکھی ڈھور مرے ہیں۔ ابھی کچھ دن بعد میں اور تم بھی مریں گے گوتم کا کیا ہے۔"

"اری چری۔۔۔" ماں تڑپی اور دو ہتڑ رسید کر کے اسے بھی تڑپا دیا۔

"جانے لگے ہیں سب اور ذلت کروانے۔۔۔ ابھی پانی کا بندوبست کرنے کے بعد باندھنے لگے ہیں سب سامان۔ ایسی سنجائی (مفلسی) اوپر والا کسی کو نہ دے۔ جھونپڑے کے رہا کو کیسے گھر سنسار چھوڑ کر جائیں' مگر اب جانا پڑے گا۔ کب تک پارو کو مرتا دیکھیں۔ آف۔۔۔"

وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ آنسوؤں نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

"ایں۔۔۔ ماں۔۔۔" امر کلا نے ماں کی ادھوری بات کو پورا کا پورا سنا اور جب سمجھا تو اچھل پڑی۔

"ایں ماں سچ۔۔۔ اسیں مٹھی وینداں؟ سچی ماں۔۔۔"

حیرت کی چیخ خوشی میں بدل گئی۔ وہ بے ساختہ ماں سے لپٹ گئی۔ ماں رونا بھول گئی۔ لمحے کا قصہ تھا۔ ماں سمجھ گئی اور پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کی دونوں چوٹیاں جکڑ لیں۔

"اری چھوکری۔۔۔ او چلولی۔۔۔ اے ٹھاکر جی!"

امر کلا پٹ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

پانی' دھوپ' گرمی' تپش' جھلساتی ریت' بیماریاں' بنیادی انسانی ضروریات کی عدم دستیابی۔ یہ تھرواسیوں کے عام مسائل تھے اور یہ مسائل بہت سے مسئلوں کا کارن تھے۔ جو زندگی کو مشکل ترین بنا دیتے تھے مگر ان

تمام سے پرے۔

غریب صورت۔۔۔ فقیر حالت والے ان انسانوں کا ایک اور سب سے اہم مسئلہ ان کی خودداری 'انا' عزت نفس اور قناعت پسندی تھا۔ وہ صابر و شاکر انسان تھے۔ تھوڑے پر گزارہ کرتے اور توکل سے بارش کا انتظار کرتے۔ اپنی پونجی پر اکتفا کرتے۔ لیکن شاید یہ قانع و صابر انسان اللہ کو بہت پیارے تھے۔ سو ان پر ہر پل آزمائش کے در کھلتے رہتے اور وہ ہر بار اس پل سے گزر جایا کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھار ایسا وقت بھی آتا جب گزرنا جھیلنا ناممکن ہو جاتا جیسے کہ اس بار۔

سوکھا ہر سال پڑتا تھا۔ عادی تھے تھر کے مکین۔۔۔ تیاریاں کر کے رکھتے۔ غذا ذخیرہ رکھتے۔ ایک دانہ ان بھی ضائع نہ کیا جاتا۔

وہ موسیٰ کی قوم تھی۔ جس نے من و سلویٰ ٹھکرا کر لہسن' پیاز اور مسور مانگی۔ لہسن' پیاز میں برائی نہیں۔۔۔ مگر من و سلویٰ کو کون ٹھکراتا ہے۔ یعنی کفران نعمت۔

مگر تھر کے مکین نعمتوں کو سنبھالنا جانتے تھے۔ ہریالی کے زمانے میں بھی ان کے ہاتھوں میں کبھی سوراخ نہ ہوا' نپے تلے قدم' نپے تلے ہاتھ۔۔۔

سبزیاں سکھا لیتے۔۔۔ برسات کے دنوں میں جب واڑ بھرے ہوتے اور انسان اور جانور زمین سب ہری بھری ہوتی۔ تب جانوروں کے پاس چرنے کے لیے بہت چارہ ہوتا۔ جب پیٹ بھر کے چارہ کھاتے تو خود بھی صحت مند گھومتے اور دودھ بھی مٹکے بھر بھر ملتا۔

دودھ بیچا جاتا کہ رقم ہاتھ آئے اور دیگر ضروریات پوری کی جاسکیں۔ ادھار اتاریں جائے۔ فصلیں گھڑی کی جائیں۔ شادیاں کی جائیں۔ سوکھے کے زمانے کے سارے خواب سبزے میں پورے کیے جاتے۔

دودھ بیچنے کے بعد بھی بچ رہتا (بڑی بڑی ٹیٹرا پیک کمپنیز کے نمائندے بڑا ٹرک لے کر آتے تھے اور دودھ خرید کر لے جاتے۔)

عورتیں گھروں میں دہی جماتیں۔ مکھن' لسی اور گھی۔۔۔ دہی کو ململ کے کپڑے میں باندھ کر لٹکا دیتیں۔ ہر جھونپڑی کے باہر یہ پوٹلیاں صاف دکھائی دیتیں۔ دہی کا پانی ٹپک جاتا اور ایک سفید گولا سا پاس رہ جاتا۔ اسے سکھا لیتیں۔ سوکھ جاتا تو سنبھال کر رکھ لیتیں۔ سوکھے کے زمانے میں ذخیرہ کیے گولے باہر نکال لیتیں۔ پتیلی میں پانی کے ساتھ گولے کو گرم کرتیں۔ دہی دوبارہ تیار۔۔۔ اس کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کر اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

مرچیں سکھا لیتے۔ کونڈی میں رگڑ کر روٹی کے ساتھ شکم سیری۔۔۔ ڈھیروں ڈھیر شکر گزاری۔

روٹی پر نمک رکھ کر سیر ہو کر کھاتے۔ نعمت پر اتنے ممنون ہوتے کہ ایک ٹانگ پر کھڑے رہ کر الحمد اللہ بولیں۔۔۔ کہو تو ساری رات۔۔۔

تعلیم نہیں تھی۔ دنیاوی تو پتا نہیں۔۔۔ دینی بھی بہت کم۔ قرآن پڑھنے والے موجود تھے' سمجھنے والے کم۔

مگر کبھی کسی نے نعمتوں کو جھٹلایا نہیں۔ مسلم ہوں یا ہندو۔۔۔ تھرواسی ناشکرے نہیں تھے۔

قناعت پسندی گھٹی میں پڑی تھی۔ شکر گزاری فطرت۔ مگر بھوک سے بلکتے بچوں کو کب تک دیکھتے پچکارتے' بہلاتے۔۔۔ تھوڑے ڈھیٹ بھی تھے۔ یہ مشکل مرحلہ بھی سر کر لیتے۔

مگر بھوک سے مرتے بچوں کو دیکھنا۔ اب ناممکن ہو گیا تھا۔

بھوک سے 'بیماری سے۔ جھگڑتے بچے اور اب تو بیماریوں نے ہر کس و ناکس پر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا ذخیرہ کی گئی اجناس کسی حد تک موجود نہیں۔ مگر خوراک تیار کرنے کے لیے پانی ختم ہو چکا تھا۔ پانی زندگی کی پہلی ضرورت ہے۔ پانی درحقیقت زندگی ہے۔

مٹھی شہر کے آگے اور پیچھے دونوں جانب دو تین سو دیہات تھے۔ کچھ میں بارش ہو گئی تھی۔ وہاں اتنی بدحالی نہیں۔۔۔ مگر جہاں نہیں ہوئی تھی۔ دو' تین برس سے وہاں کا حال۔۔۔ اف۔۔۔

امر کلا کا گوٹھ بہت پرے تھا۔ گاؤں بھی کیا تھا۔ سرحد سے کچھ پہلے جھونپڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا کسی ٹیلے سے چڑھ کر دیکھتے تو یوں لگتا جیسے کسی نے کٹوروں کو اوندھا کر دیا ہو۔

حکومت کی طرف سے جب امدادی کارروائیاں شروع ہوئیں۔ تب اس میں بھی چھینا جھپٹی تھی۔ آپا دھاپی۔۔۔ کسی کو ایک بھی نہ ملتی' کسی کو ضرورت سے زیادہ' بدنظمی سی بدنظمی۔۔۔ امداد ہر کسی کے لیے تھی یکساں مگر یہاں بھی اقربا پروری ہو جاتی۔ پہلے حکومت کی امداد پہنچی اور فوج آ گئی' پھر مختلف این جی اوز۔۔۔ سیاسی تنظیمیں ادارے فعال ہو گئے۔ میڈیا چلانے لگا۔

اب اتنا ڈھیر لگ گیا تھا اور سب کے لیے آنے والوں کا کہ کتنی مشکل۔۔۔ مگر ان کا بھی ایک مسئلہ تھا۔ یہ مٹھی شہر کے نزدیک رہتے۔ وہاں نہ جاتے جہاں بجلی نہ ملے اور جہاں موبائل کے سگنل کام نہ کریں۔ وہیں تک جاتے جہاں تک سڑک جاتی۔ اور سڑک وہاں تک جاتی جہاں تک ٹھیکے دار اور وڈیرے کی نظر اور جیب جاتی' بھلے سے نہر میں جائے۔۔۔ یا بھاڑ میں۔

امر کلا کے گوٹھ تک کوئی سڑک نہیں جاتی تھی۔

اس نے خشک سالی اور بدحالی کے قصے اپنے بڑوں سے۔۔۔ سن رکھے تھے لیکن اپنی چودہ برس تک کی زندگی میں کبھی ایسے عالم کو جھیلا نہیں تھا۔ مگر اس بار یہ سب بہت ہولناک تھا۔ اس نے کبھی شہر بھی نہیں دیکھا تھا۔ شہر کی باتیں ضرور سنی تھی۔ بدین شہر اور مٹھی شہر اور کراچی۔۔۔

منھنجا مولا۔۔۔ کراچی تو قسمت والوں کو دیکھنے کو ملتا تھا۔

وہ اتنی نصیب والی کب' مگر بس مٹھی ہی دیکھ لے۔ اور بجلی بھی ہے اور ریڈیو جیسا بجنے اور چلنے والا ٹی وی' ریڈیو سے تو صرف آواز آتی ہے۔

اِی وطن! تنھنجا چمن شل پیا وسن
گل تڑن پونر امرن' میلا مچن
ترین' (؟) ترائین' سبزا چمن
سا گئین جا سپ لھن' رنج و محن

(اے وطن تیرے چمن ہمیشہ آباد ہوں' پھول کھلیں بھنور جمع ہوں۔ میلے لگتے رہیں' ریگستان تر ہوں' ٹھنڈے ہوں' سبزے اگتے رہیں' دیہاتیوں کے ختم ہوں سب رنج و الم)

گوتم جب بھی آتا تو ایسی مٹھی گولی لاتا جو امر کلا تو امر کلا اس کے ماں' بابا نے بھی کبھی نہیں کھائی تھیں۔ گوتم امر کلا کے دور کا رشتہ دار تھا۔ اس نے مٹھی میں رہنے والے ماما کے گھر رہ کر پڑھائی کی اور شہر میں ملازم ہو گیا۔

وہ اس بار کے سوکھے میں پچھلے سال بھی جب بارش نہ برسی تھی سب کو کہتا رہا کہ اس کے ساتھ چلیں۔۔۔ امداد ملتی ہے تو سوکھا گزار لیں۔۔۔ پھر بارش کے بعد لوٹ جائیں۔ مگر سوکھے کے خوف سے کوئی' گھر سنسار چھوڑتا ہے؟ گوتم تو چریا ہے چریا' مگر اب موت کے خوف سے گوتم کی اس بار کی پیشکش ٹھکرانا بے وقوفی تھی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بچہ۔۔۔ مر رہا تھا۔

قحط زدہ۔ خراب پانی مسلسل پینے سے دانت زرد رنگ کے۔ کھال جیسے کسی نے سکھانے کے لیے تیز دھوپ میں ڈال دی ہو' اکڑی' چٹختی پھٹتی۔

سب سوچتے امداد کیسے ملے گی۔ کیا قطار میں کھڑا ہونا پڑے؟ باری لگنے کے لیے۔۔۔ وہ لوگ خود سے آکر کیوں نہ دے جاتے۔ ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ اگر کسی نے جھڑک دیا تو۔۔۔ یا فقیر سمجھ لیا تو؟

سرپنچ نے سوچا۔۔۔ وہ گوٹھ کا سب سے بڑا ہے۔ ٹیلے پر کھڑا ہو کر دائیں جانب جو ساری زمین ہے' وہ اس کی ہے۔ کوئی کیا کہے گا کہ وہ امداد لینے والوں کی قطار میں ہے۔ اتنی زمین کا مالک۔

امر کلا کا تاؤ سوچ رہا تھا۔ جوانی کے زمانے میں ایک بار سوکھا پڑا تھا تو مجبوراً جانا پڑا گندم کے گودام پر امداد

کے لیے۔ رش کے باعث دھکا لگا تو گر گیا۔ رنگین پگڑ زمین پر گر گیا۔ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ مگر اس لمحے کی یاد آج اتنے برس بعد گالوں کو دہکا دیتی تھی۔ لیکن تاؤ اب ٹانگوں سے معذور ہو گیا تھا۔

لڈی (نقل مکانی) کے وقت اسے اس کے پوتے نے کندھوں پر اٹھالیا۔ سرپنچ کبھی اجازت نہ دیتا۔ اس کی پوتی مر چکی تھی اور اکلوتا پوتا شدید بیمار تھا۔ علاج مل جاتا تو اس کی نسل بچ جاتی۔ نام لیوا کہ بیٹا مرے تو دو سال گزرے۔

☼ ☼ ☼

اونٹ گاڑی، بیل گاڑی اور پیدل سفر۔۔۔

مٹھی شہر پہنچنا اتنا مشکل تھا اتنا لمبا سفر۔۔۔ تھکے ہارے اجڑے پجڑے پیاسے بیمار لوگ۔۔۔ کچھ گھبرائے نظریں چرائے۔۔۔ آس نراس میں گھرے یہاں پہنچ کر ڈھارس بندھی۔۔۔ اتنے لوگ۔۔۔ اگلے ہی پل دل گھبرا گیا۔ کیا انہیں وہ سب مل سکے گا، جس کے لیے گوتم انہیں لے آیا ہے۔ مگر گوتم ادھر بڑی چیز تھا۔

بیماروں کو اسپتال میں بھرتی کر لیا گیا۔ ایک بستر پر تین تین کو جگہ ملی۔

دکھی پریشان حال انسان پیٹ بھر کھانا کتنے دونوں بعد ملا۔ یہاں کھانے کے لیے بعض جگہ ہنگامہ بھی ہو گیا۔ مگر گوتم نے انہیں ایک پکی عمارت میں ٹھہرایا تھا۔ ایک اسکول تھا، پکے کمرے۔۔۔ پنکھے، فرنیچر۔۔۔ گراؤنڈ۔۔۔ سب سہولیات۔۔۔ مگر نہ استاد۔۔۔ نہ شاگرد۔۔۔ تنخواہیں ہر ماہ بینک سے ملتی تھیں نا۔

یہ گوتم کے اپنے گوٹھ واسی تھے، رشتے دار تھے۔ وہ انہیں سب کچھ دلا دینا چاہتا تھا۔ بدنظمی تو تھی۔ بعض اوقات چیز بعضوں کو بہت زیادہ مل جاتی۔ بعض یہاں بھی ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ سب سے بڑا مسئلہ خودداری تھا۔ اٹھ کر جا کر ہاتھ آگے کر کے زبان سے مانگنا ضمیر پر کوڑوں کی مار جیسا تھا۔ اب اتنی آپا دھاپی میں کون ڈھونڈ کر بصد احترام اشیا دیتا۔

مگر گوتم کے تعلقات کی وجہ سے تین ٹائم کا کھانا خود بخود پہنچ جاتا اور آنے والی ہر امداد فوراً مل جاتی۔ یہاں تنگی نہیں تھی۔

وہ سب اسکول میں رہتے تھے۔ مگر گوتم کے گھر بھی گئے۔ گوتم کی پتنی سوہاسی امید سے تھی۔ شادی کے بارہ سال بعد۔۔۔ گوتم کے ہاتھ کا چھالا بنی ہوئی تھی۔ وہ امر کلا و دیگر کی طرح گھاگھرا نہیں پہنتی تھی۔ شلوار قمیص اور اوڑھنی لینے کا انداز بھی جدا تھا۔ نہ اس نے شانوں تک بھر بھر چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ شہرن تھی، وہ پکی شہرن۔۔۔ اس کے باقی زیورات بھی بہت نازک اور کم تھے۔ ناک میں کوکا تو تھا ہی نہیں۔ کھڑے ہو کر کھانا بناتی تھی، کپڑے دھونے کی مشین کا ٹین رکھا تھا۔ پلاسٹک کا ڈبا۔ بیچ میں لگی چرخی گھومتی تھی اور کپڑے لش لش۔۔۔

صاف ستھری لیٹرین۔ ٹونٹی میں آتا پانی۔۔۔ گوتم کی بیوی رسوئی گھر میں کھڑی ہوتی کھانا پکائی جاتی، برتن دھوتی جاتی، واہ کیا عیش تھے۔

گھر کی سجاوٹ شہری تھی، رنگین کرسیاں صوفے۔ امر کلا ہر شے کو تحیر سے دیکھتی ڈرتے ڈرتے چھوتی۔ وہ سب فقط ملنے گئے تھے اور امر کلا کا واپس آنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ ایسا گھر اور طرز زندگی تو اس نے دیکھا ہی نہ تھا۔ سورگ جیسی دنیا۔۔۔ وہ گوتم کی بیوی کے ہاتھ پیر دیکھتی، جو بہت ملائم لگتے۔

اسے گوتم کا گھر بہت اچھا لگا۔ بہت۔۔۔ زیادہ اچھا۔

اور اسے گوتم بھی اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ اس کی پتنی سوہاسی زہر لگنے لگی۔ وہ پینٹ شرٹ پہنتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو فون بھی ہوتا تھا۔ وہ اس میں باتیں کرتا تھا اور اس میں فوٹو بھی بنتی تھی۔

گوتم کا بڑا نام تھا ادھر اور وہ اپنے گوٹھ واسیوں کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے بھاگا پھرتا۔۔۔ امداد کی تقسیم میں بھی لاٹھی اور بھینس والا معاملہ ہو گیا تھا۔

وہ جائز ناجائز سب کام کرتا۔ امر کلا کے لیے یہ نئی دنیا تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس ویران دنیا سے ایک نئی آباد دنیا کی طرف نکلی تھی۔ مٹھی شہر کے رنگ آسائشیں، سہولتیں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔

آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

اگر جو لندن، امریکا، دبئی یا کراچی نکل آتی تو چٹ سے گر کے پٹ سے مر جاتی۔ ہاتھ جھاڑو کہانی ختم۔ مگر۔ امر کلا زندہ تھی اور کہانی کے بہت سے پنے ابھی پلٹنے کو باقی تھے۔ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

بدحالی بڑھتی جا رہی تھی اور بحالی کی تمام کوششیں اونٹ کے منہ میں زیرہ تھیں۔ پہلے ان سب کو یہاں آنے کی فکر تھی کہ جائیں کہ نہ جائیں۔ اب یہ انتظار کہ گھر کب لوٹیں گے۔ ایسے آخر کب تک رہا جا سکتا تھا۔

یہاں جو کچھ مل رہا تھا۔ وہ روزمرہ کی بنیاد پر تھا۔ خوراک اور علاج مگر مستقل حل کوئی نہیں، مستقل حل سیاست کی نذر ہو جاتا۔ ووٹ بینک جیسے ادارے کی فائلوں میں دب جاتا اور امداد کے نام پر خلوص ہو یا چال بازی ڈھکوسلہ سب چند دنوں کا مہمان تھا۔ انسان تو نکمے ثابت ہوئے تھے، رہنما دھوکے باز۔۔۔ اور اوپر والا شاید خفا تھا، آزما رہا تھا، مینہ برس جاتا تو سارے مسئلے حل ہو جاتے۔

یہاں سب مل رہا تھا، تھوڑا یا زیادہ، خوراک، پانی، دوا۔۔۔ مگر مٹی کی نمک حلالی بے چین رکھتی، واپس کب جائیں گے۔ دن گزر رہے تھے، گھر یاد آنے لگا تھا۔ مگر امر کلا جیسے سکھ کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔

اس نئی دنیا کے سب رنگ انوکھے تھے۔۔۔ ہر پہلو نیا تھا، حیران کرتا۔

سب کو منرل واٹر کی بوتل لا زما" دی جاتی۔ جیسے ہی امداد کی نئی کھیپ آتی۔ امر کلا نے جب بوتل سے پانی کا پہلا گھونٹ بھرا۔ وہ بری طرح چونکی۔ اس نے چونکنے انداز میں اگلا گھونٹ لیا، آنکھیں نچائیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور چلائی۔

"اس میں شہد گھول رکھا ہے۔"

اس نے زندگی میں پہلی بار پینے کا سادہ میٹھا پانی پیا تھا۔ ہاں بارش کے وہ قطرے اس پانی سے مشابہ تھے۔ جب برسات میں وہ منہ کھول کر زبان نکال کر آسمان کی

جانب چرو کرلیتی تھی۔ ان کا ذائقہ... کچھ ایسا تھا۔ وہ بوتل کو بار دیکھتی تھی۔

پہلی بار بوتل ملی تو شروع کے دو گھونٹ کے بعد بوتل سنبھال لی۔ اگر ختم ہو گئی تو... لیکن جب روز ہی ملنے لگی تو خدشہ ختم ہو گیا۔ سیر ہو کر پیتی پہلے کھمب سینت کر رکھتی تھی۔ اب بوتلیں سنبھالنے لگی۔ واپس جاکر پیا کرے گی۔ واپسی کے خیال سے اب دل بند ہوتا تھا اور وجوہات بہت سی۔

یہاں بسکٹ ملتے تھے اور چاکلیٹ یہ نام اور ذائقہ بھی پہلی بار چکھا۔

وہ لمبے لمبے سفید موٹے دھاگے بھی کھائے۔ جنہیں منہ کے اندر کھینچنا پڑتا تھا۔ شڑنگ کی آواز کے ساتھ سانس اندر لے کر۔

ایسا کھٹا میٹھا شربت بھی پیا' جو گتے کے ڈبے میں بند ہوتا تھا اور اس میں پتلا سا پائپ گھسانا پڑتا تھا۔ اسی شکل میں دودھ بھی ملتا تھا۔ مگر سب ذائقوں سے انجان تھر واسی اس دودھ پر ناک بھوں چڑھاتے کہ وہ اصل دودھ اور اصل ذائقے سے آشنا تھے۔ مجبوراً" پیتے۔ دودھ تو وہ ہوتا ہے، جو اپنے ہاتھ سے دوھ کر کچا بھی پی لیا جاتا ہے۔

رنگ برنگی ٹافیاں... چپس... چیونگم... ایسے ایسے ذائقے جو اس نے تو کیا اس کے باپ نے بھی کبھی نہیں چکھے تھے۔

امر کلا نے سورگ کی جھلک دنیا ہی میں دیکھ لی تھی۔ اب مرنے کا کس کا دل کرے۔

✡ ✡ ✡

اس دن ماں کے نوالے بناتے ہاتھ ٹھٹک کر رک گئے۔ بڑی بڑی بوٹیوں اور موٹے موٹے آلو والے چاول جن کا ذائقہ اور اشتہا ئے خود کر رہی تھی۔ وہ تیز تیز ہاتھوں سے بڑے بڑے لقمے حلق سے اتار رہی تھی۔ جبکہ ماں نے حلق میں اٹک جانے والے آنسو بمشکل نگلے تھے۔ باوجود ضبط کے آنکھ سے کچھ ٹپک ہی گیا۔ سسکی بھی نکل گئی۔

"کیوں روئی ماں! کیا ہوا؟" وہ اچنبھے سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"بوٹی نہیں ملی؟ لے میرے سے لے لے۔" اس نے فیاضی کی حد کردی۔ یہاں آکر وہ کچھ خود غرض ہو چکی تھی۔ جہاں کھانے کی کوئی چیز ملنے لگتی۔ بھیڑ چیر کے سب سے آگے پہنچ جاتی اور اوڑھنی کے اندر ہاتھ رکھ کے شے کو کھاتی یا چھپا جاتی۔

"ہٹ..." ماں نے شدید ناگواری سے اس کا بڑھایا ہاتھ جھٹکا۔ "مجھ کو نئیں کھانی۔" ماں نے ناک سکوڑی۔ اسے بہت زیادہ رونا آرہا تھا۔ امر کلا کا چہرہ سوالیہ ہو گیا۔

"تو پھر روتی کیوں ہے؟ اب کیا دکھ..."

"کب بھگوان کی کرپا ہو گی اور ہم اپنے گھر کو جائیں گے۔ کتنے دن ہوئے میں نے اپنے ہتھوں سے ہانڈی چڑھائی ہو۔"

"تو شکر کرنا ماں! اس مصیبت سے جان چھٹ گئی۔ بیٹھے بیٹھے کھانے کو ملتا اے... اور کھانا بھی کیا سورگ کا... میں تو کہتی ہوں زندگی بس ایسے ہی گزرے..."

"آئے ہائے..." ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کو آگے ہوئی مگر وہ بھانپ کر پہلے ہی پیچھے سرک گئی تھی۔ شانے پر لگا۔ جیسے آگ ہی لگ گئی۔ "کالی جبان والی... کلموہی... چلولی چری۔" ماں اسے تو پیٹ نہ سکی' اپنے کلیجے پیٹنے لگی۔

"مارنے سے کیا ہو گا ماں... میں تو کہتی ہوں بس یہیں رہ جاویں۔ تو ہی ہے جو واپس جانے کی بات کرتی ہے... اور ہے ہی کیا؟ دکھ' تکلیف' مشکل... بھگوان کرے میں تو اور رہ جاویں ہمیشہ کے لیے۔" اس کا پورا وجود دعا بن گیا۔ ماں کو پتنگے لگ گئے' چمک کر بولی۔

"ہاں اور تیرا سسرال کا گھر بنے گا نا... ہمیشہ کے لیے۔"

"تو ماں! کیا نہیں بن سکتا... اِیچ تو میرا بیاہ بس اور کردے۔"

"او" چھکری..." ماں نے چور نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ سب کھانے میں مگن تھے۔ "مگر کوئی سن لے چھوکری اپنے منہ سے بیاہ کی بات کرے' لوئے اوئے..."

"اور کون تیرا ماسات رہتا ہے۔ یہ تو اوپر والے کا کرم ہے کہ گوتم ادر افسر ہو گیا۔ ورنہ ماٹھو ادر بھی بکھ کرتے۔ یہ دور دور سے دوا کے لیے آتے ہیں۔ بکھ منجی تک نہ ملتی۔ پڑے ہیں کھلے آسمان کے نیچے... یہ تو ہے جو بھر پیٹ سے گھومتی رہتی ہے۔ اور بی ایک ٹیم ہالی کو دیکھتے ہیں۔"

ماں نے دکھی' تلخ لہجے میں ساری کتھا کہہ دی۔ مگر اس نے سب سنا ہی نہیں۔ ماں کا ماسات کہنا دل میں گڑ گیا اور گوتم کا چہرہ آنکھ کے آگے پھرنے لگا۔ وہ اس سے پچیس چھبیس برس بڑا تھا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ باپو بھی تو ماں سے کتنا بڑا تھا نا' ماں کے سارے بال کالے اور باپو کے سر اور مونچھ پر جیسے کسی نے آٹا مل دیا ہو۔ کم از کم جب سے اس نے ہوش سنبھالا' باپو تو ایسا ہی ملا اور گوتم کے بال تو کالے تھے۔

"تو ماں! میرا بیاہ گوتم ہی سے کردے نا۔" ایسا موقع دوبارہ کب ملتا... ماں کے کان میں بات ڈال ہی دے۔

"او ئی..." ماں کی آنکھیں پھٹ پڑیں... گوتم سے بیاہ..." اس نے ایک بار پھر ساتھ بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ سب کھانے کھلانے میں مگن تھے۔ ماں نے اس کا ہاتھ دبوچ کر اسے آگے کو گھسیٹا۔ منہ کے بل گرنے سے بمشکل بچی۔ ماں نے صرف ہاتھ دبوچا نہیں تھا۔ نوچا بھی تھا۔ سخت گرفت میں ساری تنبیہہ چھپی تھی۔

"او چری... وہ شادی والا آدمی... اپنا گھر سنسار... اب تو اوپر والے کی کرپا سے گود بھرنے والی ہے اور تو..." ماں نے ہاتھ چھوڑتے چھوڑتے بھی موٹی چٹکی کاٹ دی تھی۔

"ہاں تو وہی بات تو کرتی ہوں... اس کی پتنی تو مرنے والی ہے نا... تو پھر میرا بیاہ کر دینا بس۔" اس نے آسان حل بتا دیا۔ وہ تو جیسے سارا حساب کتاب لگائے بیٹھی تھی۔

"تت... تجھ سے کس نے کہا اے بھگوان!" ماں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"کس نے کہنا ہے' جب بچہ پیدا کرتے ہیں تو ماں تو مر جاتی ہے نا۔" اس کے سوال میں اثبات کا یقین تھا۔

"تو جب بچہ پیدا کرتے وقت وہ مرے گی تو پھر بس..."

"کس نے بولا... بچہ پیدا کرنے سے مر جاتے ہیں۔"

"تو کیا نہیں مرتے؟" اس نے چمک کر پوچھا۔

"اور گوٹھ میں کیترائی زال مری... سمجھو جیئی زال... ماسی جی ڈیی... ہر روز بچہ ہوتا ہے تو ہر روز عورت مرتی نئیں کیا۔" ماں لاجواب ہو گئی۔

"اب کیا میں غلط بولی؟"

"اور شہر میں ایسا نئیں ہوتا۔ وڈا بہ وڈا اسپتال تھیندا۔ کوئی بی نئیں مرتا۔"

"تو گوتم کی پتنی مرے گی نہیں؟" ماں کے پریقین قطعی اعلان نے اس کے خوابوں کا محل مسمار کر دیا۔

"نہیں مرے گی اور جو تو دوبارہ ایسی گالھ کی نا چری! تو میں تیری۔"

ماں نے پسلی کے گوشت پر ایک چونٹا بھرا اور کھا جانے والی نگاہ سے دیکھا کہ خبردار جو سسکاری بھی بھری ہو۔

"چری چھیکری... باپو نے ایسے ہی نام امر کلا رکھا۔" ماں حسب حال نام بدل بدل کر رکھتی ہی رہتی تھی۔

✡ ✡ ✡

سب کچھ کھلا مل رہا تھا۔ لیکن جب انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ ہر جانب اجڑے 'بکھڑے بھوکے' بیمار لوگ... اور میڈیا کا شور... اپنے اصل میں ڈھل کر سامنے آگیا۔ بے حد بھیانک روپ... بیماریاں' موت' ہنگامہ' مایوس لوگ...

منوں گندم بانٹ دی گئی۔ روزمرہ کی بنیاد پر خوراک فراہم کی جارہی تھی۔ علاج کی ہر ممکن کوشش۔ ایک بستر پر چار' چار مریض' جسم غذائی قلت کا شکار تھے۔ پانی کی کمی نے جلد کو چٹخا دیا تھا۔ ڈرپیں لگائی جاتیں۔ مریض کو ڈرپ لگوانے کے بعد لیٹنے اور ڈرپ لٹکانے

کی جگہ نہ ملتی۔ وہ ڈرپ ہاتھ میں پکڑ نکل جاتا۔ ایک ہاتھ میں سوئی لگی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے ڈرپ کسی پیڑ سے ٹانگی اور سخت پتھریلی زمین پر لیٹ گیا۔ علاج مکمل۔۔۔ ڈرپ بند کرنے کا طریقہ بھی پوچھ لیا۔ بعض خود سے سوئی بھی کھینچ لیتے۔

ہر روز انسان آرہے تھے بہت سی امیدیں لیے ہوئے مگر جو پہلے سے تھے' وہ بے زار ہو چکے تھے۔ کب تک یہ ہجرت۔۔۔ کب لوٹیں گے وہ اپنے گھروں کو۔۔۔ مدد کے لیے بہت سے لوگ فعال ہو چکے تھے۔ تنظیمیں' فلاحی ادارے' سیاسی ہرکارے۔۔۔ مگر یہ سب وقتی حل تھا۔ مستقل حل کی جانب کسی کا دھیان نہ تھا اور دھیان دلوایا جاتا تو سیاسی مصلحتیں حائل ہو جاتیں۔ کنوؤں کی کھدائی' واٹر ٹینک۔۔۔ پانی کی لائنیں' ڈسپنسریاں' یہ سب طویل المیعاد منصوبے تھے۔ دوررس نتائج دینے والے' نگران پر دھیان دیتا کون۔۔۔ وقتی ابال کو چولہا بند کرکے بٹھانے کے بجائے پھونکیں مار کے نیچے کر دیا جائے تو بات سنبھلی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں یہی پھونکیں سب مار رہے تھے۔ ابال ٹھنڈا ہو جاتا۔ سب اپنے گھر کی راہ لیتے دینے والے بھی۔۔۔ اور لینے والے بھی' پھر بعد میں تھر واسی جانیں اور ان کا کام' سو سب سے آسان حل یہ ہی تھا کہ ڈور اللہ پر چھوڑ دی جائے۔ بارش ہو جائے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے' جیسا کہ تھر کے باسیوں کے لیے ہمیشہ سے تھا۔ سو ثابت ہوا کہ اگر بارش ہو جاتی ہے تو تمام مسائل ایک جھٹکے سے ختم ہو جائیں گے اور راوی چین کتھا لکھے گا۔ اربوں کی امداد لینے والی این جی اوز غائب تھیں۔ ہاں ہمیشہ کی طرح مذہبی تنظیمیں ہی مددگار تھیں اور خلوص سے کام کر رہی تھیں۔

نماز استسقاء کا اعلان ہوا' راوہ سب کو بتایا۔

سب تھک چکے تھے اس صورت حال سے۔۔۔ ایک بارش کتنے مسائل کا حل بن کر آتی۔ جان چھٹ جاتی۔ دل کی گہرائیوں کے ساتھ' یقین کی آخری حد پر جا کر مانگی جانے والی دعا۔

کہتے ہیں دل جتنا دکھا ہوا ہو' طلب جتنی سچی اور یقین جتنا کامل۔۔۔ تو قبولیت کا عمل پلک جھپکتے جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

صفیں بندھنے لگیں۔ جاء نماز اور چٹائیوں پر نمازیوں کی تعداد مکمل ہو گئی۔ یہاں ہندو اور مسلم سب اکٹھے تھے۔ کوئی پہچانا نہ جاتا تھا۔ ایک جیسی شکلیں اور حلیے اور بدحالی۔۔۔ مگر جب ایک ایک کرتے' وہ سارا میدان ایک صف ہو گیا تو ہندو واضح ہو گئے۔ چند مسلمان جو یوں ہی ذرا پرے وہ اب پہچان کے لیے صفوں میں آ گئے۔ اتنے سارے انسان سجدہ ریز ہونے گڑگڑانے' تڑپنے ملیامیٹ ہو جانے کے لیے' منانے کے لیے' معافی کے لیے رحم و کرم کی طلب میں صف بندی کر رہے تھے۔

امر کلا کے گوٹھ میں مسلمان نہیں تھے۔ اس نے مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھا تو تھا' مگر اتنی بڑی تعداد میں سجدہ ریز انسان۔۔۔ ہندو نماز میں شریک تو نہیں تھے۔ مگر سناٹے کی ہیبت یکدم ہر ذی روح پر طاری ہو گئی۔

روتے بچے بھی چپ کر گئے۔ بھن بھن تک ختم ہو گئی۔ امر کلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' ماں نے گھرک کے اشارے سے چپ کروا دیا۔ سب ہندو دور' دور الگ الگ کھڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر اس میدان کے گرد گھیرا سا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ دھیرے دھیرے سرکتے' عورتیں' مرد سب۔۔۔

"ہم کیوں آگے جا رہے ہیں؟" اسے اعتراض ہوا۔ "یہ تو مسلے کرتے ہیں۔ پنڈت جی تھوڑی پراتھنا کر رہے ہیں۔ یہ تو وہ مسلوں کا مولبی ہے۔ کہتا ہے اس نماج سے مینہہ ہوتا ہے۔ ماں! تو نے کیوں ہاتھ باندھے۔ سب نے ہی جوڑ لیے' کیوں ام کیوں؟"

ماں منہ سے کچھ نہ بولی' اس کی بانہہ پر اپنی کہنی ماری۔ "چپ رہ۔"

ماں نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کی پلکیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ مینہہ برسنے کی پراتھنا تھی۔ پر پہلے آنکھ برسنے لگی۔ اس نے امر کلا کو جواب دینے کے بعد اب کچھ نہ کہا۔ ایسی چپ تا پڑی تھی کہ حرف دعا بھول گیا۔ یا شاید اب لفظوں کی محتاجی نہ تھی۔ رواں رواں دعا میں ڈھل گیا تھا۔

"وہ پرولا سب کا ہوتا ہے جری!"

"تو پھر کچھ مندر اور کچھ مسجد کیوں جاتے ہیں؟" اس کا ذہن ماں کے جواب سے الجھ گیا تھا۔

اوپر تپتا' ہٹ دھرم بے رحم' بے شرم سورج۔۔۔ نیچے گرم ٹیلے' ماٹی کے کڑاہے میں تپتی ریت' پیروں تلے بچھا دی تھی کسی نے۔۔۔ مولوی کی تکبیر کی آواز سب تک پہنچ رہی تھی۔ کئی ایسے تھے جنہیں خبر نہیں تھی۔ رکوع و سجود میں کیا پڑھتے ہیں۔ مگر وہ مسلسل جھک رہے تھے۔

ایک حالت تھی' وجد تھا' کیفیت تھی' یقین دعا۔۔۔ تکلیف اور بے بسی' بے بسی انتہا کی۔

امر کلا ہٹ دھرمی سے کھڑی رہی۔ وہ کیوں مسلوں کے اللہ سے مانگے۔۔۔ وہ دوران لڑکوں کو دیکھ رہی تھی جو سامان سے لدے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی آ کر رکے تھے۔ امر کلا کو نت نئے ذائقوں کا چسکا لگ گیا تھا۔ ہر ایک دوسرے سے الگ اور لاجواب۔۔۔ ڈبے کے اندر مرغی کے ٹکڑے اور کوئلے کے جیسا شربت اس نے پہلے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ اسے بہت دور سے بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک ٹرک پر وہ کالا شربت بھی تھا۔

ٹرک رک گئے تھے۔ چھت پر سامان پہ چڑھ کر بیٹھے لوگ جست لگا کر اترے تھے۔ ڈرائیور ٹرک سے اتر آیا تھا۔ لیکن اتنے بڑے جم غفیر کو یوں گڑگڑاتا دیکھ کے وہیں رک گئے۔ امر کلا کو غصہ آنے لگا۔ سب جہاں کے تہاں رک گئے تھے۔ سارے کام ہی روک دیے گئے تھے۔ کچھ وہ لوگ جو انتظامی کام سنبھالتے تھے اور نماز میں شامل نہیں تھے۔ دعا مانگنے کے پل میں سر جھکا کر خاموش کھڑے ہو گئے تھے۔

دور پکتی دیگوں میں سے کسی کا ڈھکن اٹھا تھا۔ ٹن کی آواز کے ساتھ ہی خوشبو کا طوفان خالی معدوں کا امتحان بن گیا۔ لیکن دعا مانگتے یہ لوگ۔۔۔ اور یہ مولبی۔۔۔ بولتا ہی جاتا تھا' فضا کے سناٹے میں سسکیوں کی آواز اب ارتعاش کا باعث تھی۔ اتنے خاموش لوگ اور دیکھنے والا اوپر۔

امر کلا نے اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ ایک ساکت حالت میں تھی۔ مگر جسم لرزنے لگا تھا اور آنکھ بہنے۔۔۔ وہ تھک گئی۔ دیکھا دیکھی کے عالم میں اس نے پہلے ہاتھ جوڑے' پھر یوں ہی تجرباتی طور پر دعا کی طرح ہتھیلی پھیلائی۔ پھر جوڑی' پھر پھیلائی' آنکھیں موندلیں۔

دیگوں میں چلنے والے چمچے کی آواز کھن کھن تھی سسکیاں بین ڈالنے والے ماتم میں ڈھل گئیں۔ خاموش آنسو با آواز بلند بہنے لگے۔ جیسے کئی دیگوں کے ڈھکن ایک ساتھ الٹے ہوں۔

خاموشی کے اندر یہ شور دل چیر دینے والا تھا۔ محسوس کرنے کی چیز۔۔۔ سناٹا قائل کرتا تھا کہ ہے کوئی جو سب دیکھ رہا ہے اور جسے سب خبر ہے' جو آنا ہے۔ جو دلوں کے بھید جانتا ہے' کتنا سچ اور کتنا جھوٹ۔

امر کلا کے دل پر پہلی بار کچھ انہونی کا احساس ہوا۔ شاید ماحول حاوی ہو رہا تھا۔ اسے اپنی ہتھیلی پر نمی کا احساس ہوا۔ تو کیا وہ رو رہی ہے مگر کیوں۔۔۔

اس نے چونک کر سختی سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رگڑے۔ آنکھیں تو خشک تھی' پھر یہ اندھیرا سا کیوں چھانے لگا۔ اس نے انگلی کو ہاتھ پر مسلا۔ یہاں ابھی نمی تھی نا۔ ایک بار پھر دیگوں کے ڈھکن سرکائے گئے۔ ٹھن۔۔۔ اسے گال پر قطرہ گرنے کا احساس ہوا۔

اور ساتھ ہی بے پناہ شور۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ دیگوں کے ڈھکن کی ٹھن ٹھن نہیں تھی۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ بادل گرجے تھے۔ آنکھ میں کچھ پڑا نہیں تھا کہ دھند محسوس ہوئی تھی۔ آخر کار سورج ہار مان کے اوٹ میں چلا گیا تھا۔

ابھی نمازیوں کے سر سجدے ہی میں تھے۔ کئی ایسے تھے جو طویل دعا کے بعد نماز ختم کرنے کے بعد اٹھنے کے بجائے جیسے غش کھا کر دوبارہ سجدہ ریز ہوئے تھے۔

اللہ کو کیسے منائیں۔۔۔ بے بسی کی آخری حد۔

یہ اندھیرا بادلوں کی سیاہی کا تھا۔ جو بڑھ رہی تھی۔ امر کلا کے ہاتھ پر قطرہ آنکھ سے نہیں گرا تھا۔ یہ

اللہ کا کرم تھا۔ جو آسمان کا سینہ چیر کر بہہ نکلا تھا۔ وہ ایک قطرے کا اسرار کھوج رہی تھی۔

اس نے دوسرے قطرے کے گمان پر اپنا حق دق چہرہ آسمان کی سمت اٹھا دیا تھا اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کے چہرے پر جل تھل برسنے لگا۔ یہ قیامت کا پل تھا۔ انتظار کا پل 'نتیجے کا لمحہ۔

اٹھتے ہوئے نمازی۔۔۔ اللہ اکبر کی صدا لگاتے دوبارہ سجدہ ریز ہوگئے تھے۔ وہ سمیع تھا اور رحیم تھا اور کریم تھا۔ بس ایسے ہی آہ و بکا کرتے رہے۔ ایک بار دل سے پکار کر تو دیکھتے 'یقین سے۔۔۔ بس ایک بار۔

یہ کیا ہوا تھا 'معجزہ۔۔۔ خدا کے وجود کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت۔

تھرواسی حیران تھے اور پھر خوف زدہ 'وہ سب چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھتے تھے مگر ایک تار کی بارش اتنی شدید تھی کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ تاحد نگاہ پانی کی دھند۔۔۔ پیروں میں لوٹتا پانی 'جسموں کو چومتا پانی 'سر پر برستا پانی 'تن من کو بھگوتا پانی۔

پانی آسمان سے ٹپک رہا تھا یا ساتھ ہی زمین سے بھی پھوٹ نکلا تھا۔ پہلے چٹختی سالوں کی پیاسی زمین نے پانی کو اندر سمو کر اپنی پیاس بجھائی۔ پھر پانی انسانوں کے پیروں سے لپٹ گیا۔ پھر گھٹنوں تک چڑھ گیا اور اگر اسی طرح برستا رہتا تو۔۔۔

کہاں کہاں نہ جاتا 'سیرابی' ہریالی 'زندگی۔۔۔ آف۔۔۔

کچھ دیر پہلے انسانوں میں ایک تفریق تھی۔ کچھ جو سجدہ ریز تھے اور کچھ جو دور کھڑے تھے۔ مگر ایک لمحے کے زیر اثر آکر سب جھک گئے تھے۔ تفریق ان کی دنیاوی اور دینی حیثیت بتاتی تھی۔ ایک اللہ کو مان رہے تھے 'دوسرے متزلزل تھے۔

مگر۔۔۔

مگر بارش دونوں پر یکساں برسی تھی۔

وہ رب العالمین ہے۔ آخر یہ بات سمجھ کیوں نہیں آجاتی؟

وہ رب کائنات ہے۔

ہر جان دار بھیگ رہا تھا۔ مرجھائے چہرے کھلنے لگے تھے۔ تر سے ہونٹ سیراب ہوئے۔ ویران آنکھوں میں زندگی ناچنے لگی۔ ہر جان دار جھوم رہا تھا۔ اتنی بارش' اتنی بارش جس نے ویرانے کو گل و گلزار کر دیا۔ جل تھل کر دیا۔ کنویں بھر گئے۔ جگہ جگہ پانی کے چھوٹے واٹر بن گئے۔ یہ سیرابی کا وقت تھا۔ صبح تک جگہ جگہ کیچڑ ہوگیا۔ تھرواسیوں نے اسے بھی خود پر تبرک کی طرح مل لیا' چاٹ لیا۔

☼ ☼ ☼

امر کلا کی ماں کو جیسے سب سے زیادہ جلدی تھی گھر لوٹنے کی۔

ماں جلد از جلد سامان سمیٹ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسے کوس رہی تھی۔

"اے موگو (کاہل ست) اے چری۔۔۔" مجال ہے جو وہ ذرا بھی ہلتی' اس کا تو دل بند ہو رہا تھا۔ اتنا بڑا شہر چھوڑ کر واپس جائے۔۔۔ اس کے دل پر گھونسا پڑ رہا تھا۔ پھر کب ملے گا زندگی میں ایسا موقع۔۔۔ وہ مرے قدموں اور ٹوٹے ہاتھوں سے سب کے پیچھے گھسٹتی تھی۔ بہت دیر تک یوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ مگر جب دیکھا کہ اٹھے بنا چارہ نہیں تو۔۔۔ اب وہ سامان سنبھال رہی تھی 'مگر صرف اپنا۔۔۔

پہلے مور اور دیل کے کھمب سنبھالتی تھی۔ اب اس کا خزانہ کچھ اور تھا۔

کوک اور منرل واٹر کی خالی بوتلیں' چپس' بسکٹ اور کینڈیز کے خالی ریپرز۔۔۔ اسٹرا اور کچھ خالی ٹیٹرا پیک۔

نوجوانوں نے بوڑھوں اور بچوں کو کندھوں پر بٹھا لیا۔ کچھ بڑے لاٹھی ہاتھ میں لیے رہنما بن کر ابھرے جانوروں کو ہانکنے لگے۔ بوڑھی عورتیں اپنی لرزتی آواز میں کوئی لوک گیت گنگنا رہی تھیں۔ جانوروں کے گلے گھنٹیاں اور ہانکنے والوں کی آوازیں۔۔۔ رونق' شور' ہنسی۔۔۔ خوشی' ایک ہی رات میں بارش کے ساتھ کیا سبزہ بھی پھوٹا تھا۔ یہ کیسی تراوٹ تھی۔

مرد و زن کی شوخی کا کیا عالم۔۔۔ چھوکریاں جھینپ رہی تھیں۔ مینہ کے انتظار میں کتنوں کے بیاہ روک رکھے تھے' تو اب شادیانے بجنے کا وقت تھا۔

امر کلا کے قدم ست تھے۔ وہ مڑ مڑ کر دیکھتی تھی۔ ہر اٹھتا قدم اسے مٹھی شہر سے دور لے کر جا رہا تھا۔ ہمیشہ کے لیے وہ سب سے آخر میں تھی۔ بیٹی کی سستی اسے ہمیشہ سے زہر لگتی تھی۔ اب اور بھی زیادہ۔۔۔ وہ رک کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"اے موگو! تیرے پیروں میں کیا کنڈا چبھا ہے جو چلتی نئیں۔" ماں کی پھٹکار پر وہ خفا نہیں ہوئی۔ اپنی خالی اداس آنکھیں ماں کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"اب ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھتی ہے' آگے چل۔ چپ کیوں ہے۔" ماں جھنجلا گئی۔

"ماں۔۔۔" وہ جو پوچھنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی۔ اگر کسی کے کانوں پڑ جاتا کہ۔۔۔

"امر کلا! کیا چاہتی ہے' کیا کہہ رہی ہے تو۔۔۔؟"

"آں بول۔۔۔ جلدی کر چھوکری!" ماں نے بڑھاوا دیا۔

"ماں! اب ام دوبارہ کب اور۔۔۔ مٹھی شہر آئیں گے؟"

"اے پاگل! ہمارا اور کیا کام۔۔۔ اوپر والے کی کرپا سے گھر جانے کو ہو گئے۔ ہمارا اور کیا کام۔۔۔ تجھے کیا بولنا ہے۔ اور رک کر کھڑی ہے' سب آگے نکل گئے۔ میں نے مندر میں دیا بھی جلانا ہے۔ تیرے کو لے کر کھڑی ہوں اور اب تو یہ روتی کیوں ہے؟"

ماں بدمزا ہوئی۔ بیٹی کے چہرے کا سناٹا اسے چونکا رہا تھا۔ ورنہ وہ کہاں ٹھہرنے والی۔

امر کلا کچھ نہ بولی۔ وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ شہری گاڑیاں' امدادی ٹرک دوسری طرف کو لوٹ رہے تھے۔ واپسی کا سفر۔۔۔ وہ ادھر۔۔۔ یہ ادھر۔۔۔ دکھی سناٹے میں آئے چہرے پر بجھی آنکھوں میں موت کی سی ویرانی تھی۔ پھر آنکھیں بہنے لگیں۔

"اب روتی کیوں اے بولتی کیوں نہیں۔" ماں کا لہجہ پریشانی میں ڈوبا۔

"ماں۔۔۔" اس کے حلق میں پھر آنسو اٹکے کیسے کہے جو سوال اٹک رہا تھا۔ قدم بڑھانے کی راہ میں حائل تھا۔

"تو مارے گی تو نہیں نا۔" اس نے پیش بندی ضروری سمجھی۔

"نہیں مارتی۔" ماں نے پچکارا۔ "تو بات کر' اور جلدی کر۔"

"ماں یہ۔۔۔ ماں اب دوبارہ سوکھا کب پڑے گا؟"

ماں کے سر پر سے جیسے کسی گدھ نے پورا ماس نوچ ڈالا۔ سیکنڈ کے ہزارویں پل میں اسے بیٹی کے دل کی خبر ہوگئی۔ اس کے پلاسٹک کے بڑے سے تھیلے سے جھانکتے ریپرز' بوتلیں۔۔۔

"تیرے پر بھگوان کا۔۔۔" اس نے بددعا دانتوں میں روک لی' مگر ہاتھوں کو نہ روک سکی۔

امر کلا پٹ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے ماں اسے کوٹ رہی تھی۔ اس کے بال نوچ رہی تھی۔ اس نے اسے زمین پر گرا دیا۔ اور چڑھ کر مارنے لگی جیسے۔۔۔ بچانے والے پوچھ پوچھ تھک گئے۔ ماں کیا جواب دیتی۔ پیٹنے سے فرصت ملتی تو بولتی' بس یہی کہتی تھی۔

"ارے چری۔۔۔ ارے اور چھوکری۔۔۔ پاگل!"

☼

شازیہ جمال نیر

اماں کا ایک تواتر سے بھنڈیاں کاٹتا ہاتھ یوں رک گیا۔ گویا کسی نے ریموٹ کنٹرول سے آف کا بٹن دبا دیا ہو۔ منہ کھلا اور آنکھیں مارے حیرت کے یہاں سے وہاں تک پھیلتی چلی گئیں۔

"اماں! کیا ہوا۔" جیتی جاگتی اماں کو پتھر کے بے جان مجسمے کا روپ دھارتے دیکھ کر وہ بوکھلائی تھی۔ اماں کا سکتہ ٹوٹ گیا۔

"یہ۔ یہ کیا پہن لیا تم نے؟" تیز دھار چھری کا رخ اپنی طرف ہوتے دیکھ کر اس نے گویا جھرجھری سی لی تھی۔ پھر قدرے ناسمجھی سے پیروں سے لے کر گردن تک اپنا جائزہ لیا۔

آج اس کی عزیز از جان سہیلی ارم کا نکاح تھا۔ اس نے سرخ اناری رنگ کا شیفون کا شلوار قمیص پہن لیا۔ جس پر مقیش کا نفیس کام تھا۔ سرخ رنگ اس کا پسندیدہ ترین تھا اور یہ جوڑا... اس میں تو اس کی جان تھی۔ کم و بیش تین برس قبل عالیہ باجی اپنی شادی کے بعد پہلی بار لیہ سے آنے پر اس کے لیے یہ سرخ جوڑا لائی تھیں۔ جس پر وہ دل و جان سے فدا ہو گئی تھی۔

لیکن گزرے ان تین برسوں میں اسے پہننے کا کوئی بھی موقع دستیاب نہ ہونے پر الماری کی زینت بنا رہا۔ لیکن آج ارم کے نکاح پر یہ جوڑا پہننے کے لیے اس کا دل مچل گیا اور وہ تو تھی ہی دل کی آواز پر لبیک کہنے والی۔ خوب دل لگا کر پورا ایک گھنٹہ صرف کیا تھا اس نے تیاری میں اور اب اماں کا رد عمل... چھری کی چمکتی نوک بدستور اس کا حلق خشک کیے دے رہی تھی۔

"کیا ہوا اماں! ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"یہ جوڑا کیوں پہنا تم نے؟ جانتی بھی ہو ہمارے ہاں کنواری لڑکیاں سرخ جوڑا نہیں پہنتیں؟" گو وہ اپنے اس "خاندانی رواج" سے اچھی طرح واقف تھی، لیکن آج دل کی خواہش پر بند باندھنا بھی مشکل لگا تھا۔

"جانتی ہوں، سب جانتی ہوں، پر اماں! ریت، رواج، رسمیں ایک طرف کبھی کبھی دل کی بات بھی مان لینی چاہیے نا؟"

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ ابھی جا کر بدلو یہ جوڑا۔ اگر اتنا ہی دل چاہ رہا ہے تو وہ ہلکے کام والا نیلا آسمانی جوڑا نکال لو جو میں نے تمہارے جہیز کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔" سختی سے کہتے آخر میں ایک فراخدلانہ پیشکش بھی کر دی۔

"لیکن اماں۔" اس نے دہائی دی۔

"بس مائدہ! جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ مزید کوئی بحث نہیں چلے گی۔" ان کے قطعی انداز پر وہ بے دلی سے واپس مڑی۔ نوچنے کے سے انداز میں ایک ایک چیز اتاری اور سرخ جوڑا اتار کر سادہ کاٹن کا سوٹ پہنا اور سر سے پاؤں تک چادر تان کر لیٹ گئی۔ یہ اس کے خرابیٔ موڈ کا خاموش اعلان تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں کہا کرتیں نیند سے تو اس کی بچپن سے ہی گاڑھی دوستی ہے۔ وقت بے وقت تکیے پر سر رکھتے ہی اس کی ہم جولی لپک کر اس کے گلے آ لگتی اور وہ لمحوں میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہو جاتی۔ اب بھی نجانے کتنی دیر وہ ایک ہی زاویے پر پڑی سوتی رہی۔ بڑی چادر کا ایک پلو سر کے نیچے دبا تھا تو دوسرا ابھی تک جوں کا توں پاؤں کے انگوٹھے میں اٹکا تھا۔ زوردار ہوا کا جھونکا آیا اور کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرائے۔ اس کی آنکھ کھلی اور بچپن کی سکھی الوداعی مسکراہٹ سے نوازتی رخصت ہو گئی۔ وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دوپہر کب کی ڈھل چکی تھی اور اب سہ پہر کے سرمئی سائے پر گہرے کالے بادلوں کا سایہ غالب آ رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے چلتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہلکی ہلکی پھوار سے بھرے تھے۔ جون کا مہینہ اور ایسا خوشگوار موسم! کل ہی تو محکمہ موسمیات والوں نے سہ روزہ پری مون سون بارشوں کا اعلان کیا تھا۔

وہ چپل پاؤں میں اڑستی باہر بھاگی۔ صحن میں خوش گپیوں میں مصروف اماں، عاقب اور مدیحہ نے خوب محفل جمائی ہوئی تھی۔ اس کا موڈ یک بیک خوشگوار ہو گیا۔

"اماں! شام کی چائے پر تھوڑا بہت اہتمام کر لوں؟" جہاں عاقب اور مدیحہ کے چہرے کھل اٹھے وہاں اماں اسے گھور کر رہ گئیں۔

"کہاں سے سیکھ لی ہیں یہ بگڑے رئیس زادوں والی عادتیں۔ شادی کے بعد اپنے گھر جا کر یہ چاؤ چونچلے پورے کرنا۔ ہمارا بجٹ تمہارے نت نئے تجربوں کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔" اماں کے لتاڑنے میں اسے نرمی کا عنصر نمایاں لگا تھا، سو اسے مثبت اشارہ گردانتی کچن میں چلی آئی اور جب ابا اپنا مخصوص ہنکارا بھرتے گھر میں داخل ہوئے تب تک وہ گرما گرم پکوڑے، بیسن کا حلوہ اور دودھ پتی تیار کر چکی تھی۔

لازمی نہیں ہے کہ ہر بار دل کا خوشگوار موسم ہی باہر کے ویرانے میں پھول کھلا دے۔ کبھی کبھی باہر کا پرکیف موسم بھی اندر کی حبس کم کر دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"اللہ کرے آج سارا دن سورج کا چہرہ دیکھنے کو نہ ملے۔" اس نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر ہلکے ہلکے بادلوں میں گھرے آسمان کو دیکھا تھا۔ محکمہ موسمیات کے مطابق مون سون کے تین دن گزر چکے تھے اور آج چوتھے روز بھی بن برسے بادل رخصت ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن دل کا لالچ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

فون کی چنگھاڑتی گھنٹی کا گلا اماں نے ریسیور اٹھا کر گھونٹا تھا۔ بمشکل سکون کے چند لمحے سرکے تھے کہ اماں افتاں و خیزاں ریسیور کریڈل پر پھینک، بڑی چادر پھیلا کر اوڑھتی بیرونی دروازے کی جانب لپکیں۔

"بات سن مائدہ! تیری آپا کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ کریم اسے اسپتال لے کر جا رہا ہے۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ جیسے ہی خوش خبری ملتی ہے، تجھے فون پر بتا دوں گی۔ تب تک گھر کا خیال رکھنا۔" اماں یوں ہی اسے ہدایات سے نوازتیں باد بگولے کی مانند ڈیوڑھی پار کر گئیں۔ آپا پہلی بار ماں بن رہی تھیں اور ان کے گل گوتھنے بچے کو گود میں بھرنے کا تصور ہی اس کے اندر سرشاری بھر گیا۔

اماں تو چلی گئیں لیکن اس کے لیے ایک ایک لمحہ کاٹنا محال ہو گیا۔ سالن چڑھایا، روٹیاں ڈالیں، بالٹی میں بھگویا عاقب کا سوٹ کھنگال کر تار پر پھیلایا، صاف ستھرے صحن میں ایک بار پھر جھاڑو پھیری، لیکن انتظار تھا کہ بڑھتا ہی گیا۔ آخر جب وہ سارے ضروری غیر ضروری کام نپٹا کر چارپائی پر کمر سیدھی کرنے لیٹی تب اماں نے فون پر اسے خوش خبری سنائی۔

"مبارک ہو! لڑکا ہوا ہے۔" وہ اسے دیکھنے کے لیے مچل مچل گئی۔ اماں نے لاکھ تاویلیں گھڑیں، لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی۔ گھر میں تالا ڈالا اور عاقب کے ہمراہ اسپتال پہنچ کر ہی دم لیا۔

"ہائے آپا! اتنا گلابی گڈا۔" آپا کے پہلو میں سوئے نومولود بھانجے کو اس نے جھٹ سے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ آپا کے چہرے پر ممتا نور بن کر پھیل رہی تھی۔ اسے ان کی مسکراہٹ آج سے پہلے کبھی اتنی خوب صورت اور پاکیزہ نہیں لگی تھی۔

"آپا! اس کا نام میں رکھوں گی جہاں داد، قسم سے کب سے میں نے سوچ رکھا تھا۔" اس کی گلابی ہتھیلیاں چومتے ہوئے وہ محبت سے بولی تھی۔

"اونہوں۔۔۔" آپا نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے دادا نے اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کا نام امیر حمزہ رکھ دیا تھا۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔ جب تمہارا اپنا بچہ ہو گا نا تب تم اپنی پسند سے اس کا نام رکھ لینا۔"

آپا کے نرمی سے کہنے پر اس نے بے اختیار جھینپ کر سر جھکا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب سے شعور اور خود آگاہی نے اس کا دامن تھاما تھا۔ تب سے اسے اپنی معصوم، بے ضرر خواہشوں کے اظہار کے جواب میں اپنے ارد گرد رہنے والوں سے یہی سننے کو ملتا۔ "شادی کے بعد اپنے گھر جا کر یہ ارمان پورے کرنا۔"

اگرچہ حالات، اوقات، خواہشات مختلف ہوتیں۔ لیکن جواب اسی سے ملتا جلتا۔ کبھی کبھار دل اڑ جاتا۔ لیکن ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا چلا گیا کہ دلی خواہشوں کو پورا کرنے کا مناسب وقت شادی کے بعد ہی آئے گا۔

وقت کے تھال میں ماہ و سال کے سکے ایک تواتر سے گرتے گئے اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ہوائیں اسے بابل کے گھر سے وداع ہونے کا سندیسہ سنانے لگیں۔ روپہلے خوابوں کے خمار سے اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں، لیکن شادی والے روز اپنا عروسی لباس دیکھ کر وہ ٹھن سی بیٹھی رہ گئی۔ آتشی گلابی بھاری کام دار فراک! اس کی شادی کا جوڑا۔

"داؤد کو سرخ رنگ اچھا نہیں لگتا، اس کی پسند سے ہم نے ساری مارکیٹ چھان کر یہ خریدا ہے۔" اس کی ساس نجانے کس سے کہہ رہی تھیں۔

کچھ دیر پہلے نکاح کا مقدس فریضہ انجام دیا جا چکا تھا۔ اب اسے رخصت کرنا باقی تھا۔

"اماں!" اس کی آنسوؤں سے بوجھل آنکھیں بے اختیار اماں کی جانب اٹھی تھیں۔

"شادی کے بعد صبر و تحمل، برداشت اور درگزر سب سے زیادہ تیرا ساتھ نبھائیں گے۔ اس لیے ان کا دامن اپنے ہاتھ سے کبھی چھوٹنے نہ دینا میری بچی۔" مایوں کی رات اماں نے اسے پہلا سبق یہی پڑھایا

تھا۔ اور پہلے ہی قدم پر شادی والے دن سرخ جوڑا پہننے کا ارمان دل میں دبائے اس نے خاموشی سے آتشی گلابی جوڑا پہن لیا۔

"عورت شوہر کی پسند میں ڈھلی ہی من کو بھاتی ہے۔ اس کی ایک مانو، اپنی منوانے کے بہتیرے مواقع۔" انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ ماؤں کے پاس بیٹیوں کو دینے کے لیے دلاسوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی اور بیٹیاں بھی تو آسمانی صحیفوں کے بعد ماں کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"مائدہ! بس کر دیار۔۔۔ اور کتنا ٹائم لگاؤ گی۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔"

داؤد کلائی میں بندھی گھڑی پر نظریں دوڑاتا اندر داخل ہوا۔ جہاں وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ مقیش کے کام والا سرخ شلوار قمیص آج اس پر بہت جچ رہا تھا۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے آئینے کے سامنے سے ہٹی تھی لیکن داؤد کے چہرے کے پتھریلے تاثرات نے اسے ٹھٹکا دیا۔

"داؤد! کیا ہوا۔ میں اچھی نہیں لگ رہی؟"

"سخت زہر لگتا ہے مجھے یہ رنگ۔" درشتی پہلے آنکھوں سے عیاں ہوئی پھر لہجے سے چھلکی۔

"اوہ!" اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ بری میں ایک بھی سرخ رنگ کا جوڑا نہ ہونے پر جہاں اس کا دل دکھا تھا، وہیں جہیز میں سرخ رنگ کے دیدہ زیب ملبوسات کی موجودگی نے ڈھارس بندھائی تھی لیکن اب۔۔۔

"داؤد!"

"فوراً" بدل کر آؤ یہ کپڑے اور آئندہ میں تمہیں یہ رنگ پہنے نہ دیکھوں۔" دل میں چٹکتی کلیاں بن مہکے مرجھانے لگی تھیں۔ اس نے لباس تو بدل لیا۔ کچھ دیر بعد داؤد کا موڈ بھی معمول پر آ گیا۔ لیکن وہ سارا دن بجھی بجھی سی رہی اور اگلے دن نہ چاہتے ہوئے بھی بڑی نند کے سامنے اس کے منہ سے بات نکل گئی۔

"ریحانہ آپا! داؤد سرخ رنگ کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ کوئی خاص وجہ؟"

"ارے نہیں، کوئی خاص وجہ نہیں ہے، بس وہ ہوتی ہیں نا کچھ مردوں کی عادتیں، کسی کو بیوی کا بالوں کا جوڑا بنانا کھلتا ہے، تو کسی کو بیوی کے ہاتھوں پر رچی مہندی کی مہک سے الرجی ہوتی ہے۔ خود میرے میاں کو دیکھو ذرا سی فٹنگ والے کپڑے پہن لوں تو ان صاحب کی تقریر شروع ہو جاتی ہے۔ تم تو شکر کرو کہ داؤد کو صرف سرخ رنگ سے چڑ ہے، ہمارے جیٹھ صاحب کو تو بیوی کا لپ اسٹک لگانا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اب تم خود سوچو شادی شدہ عورت اور لپ اسٹک پر پابندی۔" اس کی نند اس بات پر ہنس رہی تھیں، جس پر وہ مسکرا تک نہ سکی۔ اس کا شوہر بھی ننانوے فیصد، ہی گھمنڈی مردوں میں سے ایک ہے۔ یہ وہ آج جان پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

کوئی بھی بات شروع کرنے سے پہلے داؤد کے اچھے موڈ میں ہونے کا خود کو یقین دلاتے، اپنی بات کے جواب میں دیر تک ساس کا سپاٹ چہرہ دیکھتے، چھوٹی نند اور دیور کے غیر متوقع رد عمل کا خوف زائل کرتے وہ سوچ میں ڈوب جاتی۔ اماں ایسا کیوں کہتی تھیں کہ شادی کے بعد اپنے گھر جا کر سارے ارمان پورے کرنا؟

سوال لاکھ سر پٹختا، لیکن جواب کونوں کھدروں میں منہ چھپائے باہر نکل کے ہی نہ دیتا۔ ہر ابھرتا سورج اپنے جلو میں ڈھیر سارا نیا پن لے کر آتا تو پرانی بات پر عدم توجہی کی گرد پڑنے لگتی۔

اور جس دن اسے اپنے پیروں تلے جنت آنے کی نوید ملی۔ اسے لگا اس کا ہر ادھورا ارمان پورا ہو گیا ہے۔ کئی گھنٹے موت و زیست کی کشمکش میں گزارنے کے بعد اس نے ہوش کی دنیا میں آنکھ کھولی تو میٹھی قلقاریاں سماعتوں سے ٹکرائی تھیں۔

"میرا جہاں داد!" اس نے محبت پاش نگاہوں سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھا تھا۔

"تو بھئی تیمور حسن کی ماں کو ہوش آگیا ہے۔ مبارک ہو۔"

داؤد سرشاری کے عالم میں نجانے کس سے کہہ رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ میٹھا کروا رہے تھے۔ مختلف آوازیں گونج رہی تھیں' لیکن اس کی سماعت میں ایک ہی فقرا ٹھہر گیا۔

"تیمور حسن؟" اس نے زیر لب دہرایا۔

"ہاں بھئی! ہم نے اپنے بیٹے کا نام تیمور حسن رکھا ہے۔ کب سے سوچ رکھا تھا۔ آج اللہ نے موقع دے دیا۔" اس نے آہستگی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ چپکے سے دو آنسو پھسلتے ہوئے کہیں تکیے میں گم ہوگئے۔

☆ ☆ ☆

"اماں! کیا آپ ہمیشہ سے ہی اتنی بہادر اور بلند حوصلہ رہی ہیں یا پھر اتنی خوش نصیب کہ آپ کی آنکھوں میں سجا ہر خواب خوشنما تعبیر پا گیا؟"

وہ خود ماں تھی' لیکن اسے سکون و قرار آج بھی اپنی ماں کی گود میں ہی ملا کرتا۔ اماں اس کی بات پر مسکرا دی تھیں۔

"کوئی بھی عورت اتنی خوش نصیب نہیں ہوتی کہ اس کی آنکھوں میں سجا ہر خواب پورا ہوجائے۔ البتہ ہر عورت زندگی میں کبھی نہ کبھی اس مقام پر ضرور آ کھڑی ہوتی ہے جہاں اس وقت تم خود کو کھڑا محسوس کررہی ہو۔ خدا لگتی کہوں بیٹا! عورت کا دل بہت وسیع ہوتا ہے سمندر جتنا۔ اپنے اندر دل کی دنیا آباد کر۔ کوئی اور سنے نہ سنے تیرا دل تیری سنے گا' سمجھے گا اور مانے گا بھی۔"

واپسی پر اس نے سوچا اماں کتنی عجیب باتیں کرتی ہیں۔ عجیب۔۔۔ لیکن دل میں اترتی' رات ۔۔۔ وہ سکون سے سو نہیں سکی تھی۔ تیمور کو ہلکے بخار نے آ لیا۔ وہ خود بھی رات بھر بے چین رہا اور اسے بھی بے چین کیے رکھا۔

آج اس کی منجھلی نند عارفہ کی اکلوتی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ تیمور کی خرابی طبیعت کی وجہ سے اس نے اپنے جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

"تم چلی جاؤ بہو! بچے کو میں سنبھال لوں گی۔" ساس کے کہنے پر اس نے سبھاؤ سے انہیں منع کردیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی ساس اس کے بیمار بچے کو نہیں سنبھال پائے گی۔ داؤد اسے تیمور کے سلسلے میں ڈھیر ساری ہدایات دینے کے بعد عجلت میں تیاری مکمل کرتا اماں وغیرہ کو لیے باہر نکل گیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اس نے تیمور کو فیڈ کرا کے سلا دیا اور خود گھر کے روزمرہ کے کام نپٹانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بالکل فارغ تھی۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے نجانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ الماری کے سب سے نچلے خانے میں رکھا اپنا نفیس کا سرخ جوڑا نکال کر پہن لیا۔

وہ جوڑا آج بھی اس کے تن پر یوں ہی سج گیا تھا اور وہ آئینے کے سامنے اپنے نم بالوں کو سنوارتی مسرور سی کھڑی رہی۔

اچانک عقب میں دروازہ کھلا تھا۔ وہ پلٹی اور ساکت رہ گئی۔ داؤد دروازے پر بت بنا کھڑا تھا۔ سرخ جوڑے نے آگ لگائی اور اسے اپنا سارا وجود جھلستا محسوس ہوا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ جسم کا سارا خون نچڑ کر چہرے پر سمٹ آیا۔ کیا توجیہہ پیش کرے گی وہ داؤد کے سامنے کہ وہ ان سب کے پیٹھ پیچھے یہ کچھ۔۔۔ کتنے ہی روح کو کاٹتے لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔ اس نے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"داؤد! سرخ رنگ میرا پسندیدہ رنگ ہے۔۔۔ نہیں تھا۔ بہت پسند تھا اور۔۔۔ اور یہ جوڑا۔۔۔ اس کو پہننے کے لیے میرا دل بہت بار مچلا۔"

وہ تھا اور ہے کے گرداب میں الجھ رہی تھی۔

"اور آج میں نے اسے نکال کر پہن لیا۔" رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے کسی مجرم کی مانند اپنا اعتراف جرم کرکے وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ کئی لمحے مزید سرکے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ داؤد اسے ہی

دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔

"مجھے معاف کردیں داؤد! یہ آخری بار تھا۔" وہ آہستگی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا کچھ یوں کہ اسے اپنے سامنے کی ساری راہیں مسدود ہوتی دکھائی دیں۔ اسی لمحے بیڈ پر سویا تیمور کسمسا کر رونے لگا تھا۔

"او! جہاں داد اٹھ گیا۔" وہ سرعت سے اس کے پہلو سے نکلی اپنے بیٹے کی طرف بڑھی۔

"جہاں داد؟" داؤد نے زیر لب دہرایا اور تیمور کو تھپکتا اس کا ہاتھ لمحوں میں بے جان ہوا تھا۔ شاید آج کا دن اس کے ۔۔۔ سارے پردے ہٹانے کے لیے مقرر کیا جا چکا تھا۔ وہ وہیں نیچے قالین پر بے دم سی ہوکر بیٹھ گئی۔

"بہت پہلے میں نے ایک ناول پڑھا تھا جس میں ہیرو کا نام جہاں داد تھا۔ مجھے یہ نام بہت اچھا لگا تھا۔ تب میں نے سوچا۔۔۔ میرا دل چاہا تھا اپنے بچے کا نام رکھوں گی۔ لیکن۔۔۔" اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا اور آواز بہت مدھم۔ بچہ ماں کی ایک' دو تھپکیوں کا لمس پاکر پھر سے پرسکون ہوکر آنکھیں موند گیا تھا۔

"میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" وہ جس تیزی سے کھڑی ہوئی تھی اسی تیزی سے داؤد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔

"مجھ پر ہاتھ مت اٹھایئے گا پلیز! میں۔۔۔ میں آئندہ نہیں کروں گی ایسا۔" اس کی دھندلائی آنکھوں نے التجا کی تھی۔

"مت گراؤ مجھے اتنا اپنی نظروں میں کہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ ہوسکوں۔" مائدہ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

"ہم مردوں کی خواہ مخواہ کی ناپسندیدگی' لایعنی چڑ اور فضول سی ضد کے ہاتھوں وفا کی مورتیاں کب تک ٹوٹ کر بکھرتی رہیں گی؟ اپنے دل کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا خون کرتی رہیں گی؟" مائدہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔ جس کی پیشانی پر عرق ندامت پھوٹ نکلا تھا۔

"مجھے ان نظروں سے مت دیکھو' میں کھڑے قد سے زمین بوس ہوجاؤں گا۔ اپنی مردانگی کی دھونس جماتے' پسند ناپسند کا برملا اظہار کرتے' محکوم پر حاکمیت جتاتے میں یہ بھول گیا تھا کہ بیوی کے نام پر جو عورت میری زندگی میں آئی ہے۔ اس کی اپنی بھی تو کوئی پسند' خواہش' ارمان' کچھ خواب ہوں گے۔" مائدہ جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ اسے ڈر تھا۔ ذرا سا ہلی تو پلک جھپکتے میں منظر بدل جائے گا۔ وہ ابھی کچھ لمحے اسی منظر میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔

"میں جانتا ہوں' میں ایک بار معافی مانگوں گا' تم مجھے سو بار معاف کروگی۔ لیکن میرا دل چاہ رہا ہے تم اپنے ایک ایک تشنہ ارمان کا مجھ سے حساب مانگو۔ میں سو بار تم سے معافی مانگوں' تب جا کر تم معاف کرو۔"

کب کے رکے آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اماں نے کہا تھا اپنے اندر دل کی دنیا آباد کر۔ اس کے دل میں پنپتے ارمانوں کی آکاس بیلیں بہت دور تک پھیل گئی تھیں' لیکن اندر بہت حبس تھی' گھٹن تھی' یہ آج کیسا خوشگوار جھونکا اندر تک در آیا تھا کہ اس کے مشام جاں مہکنے لگے تھے۔

"پلیز مائدہ! بس کرو۔" اپنے کندھے پر رکھے داؤد کے ہاتھ لودیتے احساس نے اسے پہلی بار عجب مسرت و طمانیت سے دوچار کیا تھا۔

"میں یہ کپڑے بدل۔۔۔"

"اونہوں! اگر کچھ بدلنے کی ضرورت ہے تو صرف ایک سوچ! تم جہاں داد کو اٹھاؤ' اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔"

ایک پراعتماد مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا اور سرخ جوڑے کا سارا گلال اس کے چہرے پر بکھر سا گیا۔

✳

مسرت ناز

وہ کون تھی

آج ویک اینڈ تھا۔

سب گھر والے اکھٹے تھے۔ خورشید زبیری، اس کی خوبصورت بیوی، تین بیٹیاں اور ایک بھانجی۔ وہ لوگ شام کی چائے پی رہے تھے اور خوش گپیاں جاری تھیں۔ جب ملازم نے وہاں آکر بتایا کہ خورشید سے ملنے کوئی آیا ہے۔ خورشید نے ملازم سے مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا تھا۔ جس پر ملازم کچھ ہچکچایا۔

"سر! آپ پہلے مل لیں۔"

خورشید کچھ موڈ میں تھا۔ اسی لیے ملازم کی بات پر سرہلاتا گیٹ کی جانب چلا گیا۔ باقی فیملی دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگئی۔

وہ ایک دیہاتی تھا۔ اونچا لمبا بھرے بھرے جسم کا مالک، بڑھے ہوئے بے ڈھنگے ہنیر اسٹال کے ساتھ بڑھی ہوئی شیو، گندمی رنگت، شلوار قمیص میں ملبوس۔

خورشید کو بہت عجیب سا محسوس ہوا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟" وہ قد میں خورشید سے لمبا تھا۔ اس سے زیادہ چوڑا تھا۔ پھر بھی خورشید نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے کسی کیڑے مکوڑے کو دیکھ رہا ہو۔

"او جی۔ میں نے کہا سلام لیکم!" جھٹکے سے سلام جھاڑ اگیا۔ پھر لان میں موجود لوگوں نے دیکھا کہ خورشید ایک نووارد کو ڈرائنگ روم کی جانب لے کر

مکمل ناول

www.paksociety.com

جارہا ہے۔

حورعین گارڈن میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی تو اٹھ کر جانے لگی۔ خورشید اس کے پاس سے ایسے گزرا جیسے اس نے حورعین کو دیکھا ہی نہ ہو۔ اس کے پیچھے ایک دیہاتی جوان مرد اندر ڈرائنگ روم کی جانب جارہا تھا مگر اس کی نظر حورعین پر تھی۔ حورعین کو عجیب لگا۔ وہ ناگواری سے پیچھے ہی کھڑی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ماموں خورشید اور اس کی ممانی منزہ کو اپنا اسٹینڈرڈ کتنا عزیز تھا۔ ایسے میں ایک گاؤں کا آدمی۔۔۔ خورشید کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا اور وہ سامان کے ساتھ وہاں کیوں آیا تھا؟

☼ ☼ ☼

"بزرگو! اس میں دھمکانے والی بات کیا ہے؟" وہ انجان بنا۔ "میں نے تو صرف یہ درخواست کی ہے کہ اپنے دفتر میں نوکری دے دو۔ یہ آپ کو دھمکی کیوں لگ رہی ہے؟"

"اور تمہیں اپنے گھر میں رکھ لوں۔۔۔ اپنی بیوی کو کیا کہوں کہ یہ لفنگا ٹائپ گاؤں کا لڑکا کون ہے، جسے میں نے جوان بیٹیوں کی موجودگی میں اپنے گھر میں رکھ لیا؟"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو کیا کہنا ہے۔" وہ پھیل کر بیٹھ گیا۔

"نام کیا بتایا تم نے اپنا؟" خورشید نے گھور کر پوچھا۔

"سچل حسین"۔

"کتنی تعلیم ہے تمہاری؟" خورشید نے تھکے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ایم کام۔" وہ مسکراتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بولا۔

"ڈگریاں ہیں میرے پاس۔" خورشید کی آنکھوں میں استہزائیہ دیکھ ـــــ وہ ہنس کر دوبارہ بولا۔

"کتنے میں لیں؟" اس کو طنزیہ انداز میں سر سے پیر تک دیکھ کر خورشید نے پوچھا۔

"میٹرک کی ڈگری دو بکریاں دے کر۔ آئی کام ایک گائے دے کر۔ بی کام کی باری میں نے وی جناب نیلی راوی نسل کی ساہیوال کی بھینس، ہیٹس کلو دودھ دیتی تھی۔ اور ایم کام کی دفعہ ایک زمین کا ٹکڑا دیا۔ اس طرح میں ہو گیا تعلیم یافتہ۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔" وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسا تھا۔

خورشید نے اسے غصے سے گھورا۔ اسی وقت منزہ کا فون آیا تو اس نے بات ختم کردی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا خورشید! ایک غیر مرد ہمارے گھر میں؟"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو منزہ! جیسے ہمارے گھر میں خاندان کے باقی لوگ نہیں آتے۔" خورشید بولا۔

"کیا مطلب۔۔۔ تم اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذب خاندان کا مقابلہ اس جنگلی، جاہل انسان سے کر رہے ہو؟"

"سچل ایسا نہیں ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ مگر وہ گاؤں میں پلا بڑھا ہے۔ اس لیے اس کا حلیہ ایسا ہے۔"

"ہائے واوے، اہم کیوں اتنی وکالت کر رہے ہو اس کی؟ یاد رکھنا! میں اس کو یہاں نہیں رہنے دوں گی۔"

"دیکھو منزہ! مجھے بھی اس کام میں کوئی خوشی نہیں ہے مگر سچل کے باپ نے ایک دفعہ احسان کیا تھا مجھ پر۔ جان بچائی تھی میری۔ میں دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ ایک دوست دوستی کے بہروپ میں دشمنی کر رہا تھا مجھ سے۔ اس نے مجھے گولی ماری اور جنگل کے ایک کونے میں جھاڑیوں میں پھینک کر چلا گیا۔ ایسے میں سچل کا باپ وہاں اپنا کھویا ہوا جانور ڈھونڈنے آیا تھا۔ اس نے میری جان بچائی۔ اب اس کا بیٹا مجھ سے ایک فیور چاہتا ہے۔ ایک معمولی جاب۔ اس میں کیا مسئلہ ہے آخر؟"

"دیکھو خورشید! مجھے جاب دینے میں مسئلہ نہیں ہے۔ مگر میں اسے اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ اور یہ جو کہانی تم نے سنائی ہے نا۔۔۔ اس پر مجھے ایک فیصد بھی ٹرسٹ نہیں ہے۔ جیسے میں جانتی نہیں ہوں کہ تم کس قدر ڈرامے باز ہو۔" اس نے طنز کیا۔

خورشید نے بے اختیار دانت پیسے۔

"تم مانو، یا نہ مانو مگر حقیقت یہ ہی ہے۔ اور سچل یہیں رہے گا یہ بات دماغ میں بٹھالو۔"

"ٹھیک ہے۔ رکھو اسے۔ میں اپنی بیٹیاں لے کر یہاں سے جا رہی ہوں۔"

"منزہ ڈارلنگ! کبھی تو حالات کی نزاکت کو سمجھا کرو۔" وہ پلٹا۔

"کیسی نزاکت۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

خورشید اس کے خبیث چہرے پر لعنت بھیج کر زبردستی مسکرایا۔

"حورعین سترہ سال کی ہو گئی ہے۔ میں نے یہ سترہ سال انگاروں پر گزارے ہیں۔ مجھے ایک ایسا مرد چاہیے تھا جو میرے کام آسکے۔ اور اب ایک پرفیکٹ شخص مجھے مل گیا ہے۔ وہ عمر، خوبروئی، تعلیم، ہر چیز میں اس قابل ہے کہ میرے کام آسکے۔ اس گھر میں رہے گا تو حورعین کو اور بہتر طریقے سے اپنی مٹھی میں کرلے گا۔ حورعین ویسے بھی عمر کے ایسے دور میں ہے کہ ہمیں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور پھر۔۔۔ اس سچل والے کانٹے کو کیسے نکالنا ہے۔ وہ بھی پورا پلان میرے دماغ میں ہے۔ اب منزل دور نہیں۔"

"تو صاف بتا دیتے نا۔ اتنی پہیلیاں کیوں بجھوا رہے تھے۔ ٹھیک ہے۔ آئی ڈو ٹرسٹ یو اگین۔ کیونکہ اور کوئی چارہ نہیں۔ مگر تم نے اس کی لک دیکھی ہے؟"

"بدل دوں گا۔ ڈونٹ وری۔"

"اور اگر دھوکا دے گیا تو؟"

"دیکھو ایسا مت کہو۔ یہ لڑکا مجھے ویسے ہی کچھ پسند نہیں۔ وہم میں مت ڈالو مجھے۔ اس کا حل میں نے سوچ رکھا ہے۔" خورشید کچھ بے زاری سے کہا تو منزہ سرہلا کر چپ ہو گئی۔

منزہ سے بات کر کے وہ باہر نکلا تو حیران رہ گیا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ سچل ان کے دروازے کے باہر موجود ہو گا۔ وہ تمام گفتگو لفظ بہ لفظ سن چکا تھا۔

"کسی کی باتیں چھپ کر سننا، پتا ہے، کتنی غلط بات ہے؟"

"مگر اب تو میں نے سن لیں بزرگو! تو کیا ہم شاپنگ کے لیے جارہے ہیں؟"

"سب سے پہلے تم اپنا لہجہ درست کرو۔" خورشید بھڑکا۔

"آپ بھی بات کرنے میں احتیاط کیا کرو۔ مجھے نوکری دے کر یا اس گھر میں رکھ کر مجھ پر کوئی احساس نہیں کر رہے ہو آپ۔ میں آپ کی دھجیاں اڑا سکتا

ہوں۔ یہ کالا سفید کاروبار جو کررہے ہیں نا آپ' اور جن کے لیے کررہے ہیں' تھوکیں گے آپ پر۔ دوست احباب ہنسی اڑائیں گے۔ اتنا کچھ کرسکتا ہوں مگر نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ کو نقصان دینے میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن اگر میں یہ بات حورعین کو بتادوں تو۔۔۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ خورشید کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

"شاپنگ پر ہم آج نہیں کل چلیں گے۔ میں تمہیں اس حلیے میں نہیں لے کے جاسکتا۔ تمہارے پاس کوئی پینٹ شرٹ نہیں ہے؟" وہ یکدم تحمل سے بولنے لگا۔ "میرا مشورہ ہے اپنی مونچھیں بھی کاٹ دو۔ لوگ عام طور پر مونچھیں نہیں رکھتے۔ خاص طور پر اس طبقے میں جس سے ہم تعلق رکھتے ہیں۔"

خورشید نے ناپسندیدگی سے اس کی گھنی مونچھوں کو دیکھا۔

"ہوسکے تو رات کے کھانے سے پہلے ڈرائیور کے ساتھ جاکر بال کٹوا لینا۔ کوئی ایسا ہیئر اسٹائل جو تمہارے چہرے پر سوٹ کرے۔"

"اور کچھ۔" اس نے قدرے بے زاری سے پوچھا۔

"تمہارے لیے کمرا صاف کرنے کا کہہ دیا ہے۔" خورشید کی لمبی گفتگو کو اس کے موبائل کی رنگ نے توڑا۔ مختصر بات کرکے اس نے دوبارہ سچل سے کہا۔

"تمہارے پاس موبائل تو ضرور ہوگا مگر بہتر ہوگا بدل لینا۔" پھر کچھ دیر کے توقف سے بولا۔

"ڈرائیونگ آتی ہے تمہیں؟"

"جی ہاں! لائسنس ہے میرے پاس۔" وہ مزے سے بولا تھا۔ یہ لڑکا اس کی سوچ سے زیادہ تیز ہے۔ خورشید نے غصہ سے سوچا۔

رات کے کھانے تک سچل کے لیے کمرا صاف ہوگیا تھا۔ اس نے شیو کرلی تھی۔ لباس بدل لیا تھا اور ہیئر کٹنگ بھی کروا آیا تھا۔

خورشید سچل کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ دراصل اس نے اب سچل کو غور سے دیکھا تھا۔ خورشید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے تو وہ اور بھی بہت سے کاموں کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ لمبا قد' مضبوط کاٹھی' گندمی رنگت اور روشن سی آنکھیں۔

"میں تم سے کچھ سنجیدہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیجیے۔" پروقار اور دلکش لہجے میں اس نے ایک لفظ پر مشتمل جواب دیا۔ حلیے کے ساتھ لہجہ بھی بدل لیا تھا۔

"پرفیکٹ" اس نے صرف سوچا۔

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم اپنی زبان نہیں کھولو گے۔"

"آپ بتائیں آپ کیسے مطمئن ہوں گے؟" اس نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"اب یہ مت کہیے گا کہ میرے پاس جو چیزیں ہیں آپ کو دے دوں تاکہ آپ میرا انتظام کردیں اور میرا قصہ ہی ختم ہوجائے۔"

"تم اپنا منہ بند رکھو گے اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟" خورشید غصے میں آگیا۔

"میں پاگل ہوں کہ آپ کے خلاف کچھ کہہ کر آپ کو برباد کردوں گا اور خود واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔"

"ہوسکتا ہے تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟" خورشید نے شک کیا۔

سچل نے حیران ہوکر خورشید کو دیکھا۔

"آپ جو چاہیں سوچیں۔ جہاں تک آپ کو مطمئن کرنے کا تعلق ہے' مجھے باتیں بنانی نہیں آتیں۔ آپ کو مطمئن ہونا ہے تو ہوں۔ یہ بتائیں کھانا کب تک لگے گا؟ میں نے صبح بہت جلدی ناشتہ کیا تھا۔"

خورشید نے بے بس سی کیفیت میں اسے دیکھا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا سچل حسین! اگر میں یا میرا گھر برباد ہوا نا۔۔۔ میں چھوڑوں گا تمہیں بھی نہیں۔ یاد رکھنا!"

سچل مسکرانا نہیں چاہتا تھا مگر چھپانا مشکل ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"گڈ ایوننگ ایوری ون۔" رات کے کھانے پر وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوکر بولا۔ سب نے اس کی جانب دیکھا۔

"آؤ سچل!" خورشید نے گرم جوشی سے اس کو اندر بلایا۔ وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سب کے چہرے پر حیرت تھی۔ انعم نے ترچھی نظر سے اسے دیکھا۔ "آپ کی تعریف؟"

"کیجیے۔" سچل مسکرایا۔

عمینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ منزہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں نے آپ کا تعارف پوچھا ہے۔" انعم نے سابقہ موڈ میں تصحیح کی۔

"وہ تو آپ کے ڈیڈ کروائیں گے۔" وہ سادہ سے انداز میں بولا۔

"آف کورس! سچل جاب کے سلسلے میں یہاں آیا ہے۔ کچھ دن یہیں رہے گا۔"

"اور سچل! یہ میری وائف ہے منزہ خورشید۔" خورشید نے اپنے بائیں جانب پہلی کرسی پر بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ میری بیٹیاں ہیں۔ عائشہ' انعم' عمینہ اور یہ حورعین۔ میری لاڈلی۔"

سچل درحقیقت سب کو پہچانتا تھا۔

"سچل! ویری نائس نیم۔ کس نے رکھا تمہارا یہ نام؟" حقیقتاً منزہ کو یہ نام اچھا لگا تھا۔

"میری نانی نے۔"

"کس گاؤں سے آئے ہو اور بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"سرگودھا سے آیا ہوں اور ایک ہی بیٹا ہوں اپنی اماں کا۔ کوئی بہن نہیں ہے۔"

"اچھا" منزہ نے پرسوچ انداز میں سرہلایا۔ وہ لوگ کھانا شروع کرچکے تھے۔

"کتنی تعلیم ہے تمہاری؟"

"میں نے ایم کام کیا ہے۔ آگے پڑھنا چاہتا تھا مگر جاب کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ عرصہ جاب ڈھونڈی پھر یہاں آگیا۔"

"کیوں؟" منزہ کے لہجے میں کسی قدر خفگی در آئی۔ "باپ' دادا کے بزنس میں انٹرسٹ نہیں ہے کیا؟ سوری بٹ آئی نو کہ تمہارے فادر ایک کسان تھے۔ تو وہ کام کیوں نہیں کرلیتے تم؟" سچل کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔

"بس حالات ایسے ہوگئے تھے کہ وہ کام جاری نہیں رکھ سکا۔"

"جاری نہیں رکھ سکا؟" منزہ نے جیسے اس کی بات پکڑلی۔ "مطلب تم نے یہ کام کیا ہے۔ تم ایک کسان رہ چکے ہو۔"

"جی۔ پروفیشنل کسان تو نہیں۔ مگر میں ہیلپ کرواتا تھا۔ ہر قسم کے کام میں۔ پھر کچھ مسئلہ ہوگیا اور وہ کام ختم ہوگیا۔"

"کیا آپ کھیت میں ہل چلاتے تھے؟" عمینہ خوش ہوکر بولی۔

سچل ہنس پڑا۔

"سچل بیٹا!" منزہ نے پھر سے بات چیت شروع کی۔ "کیا میں جان سکتی ہوں کہ کیا وجہ تھی کہ تمہارا وہ کام ختم ہوگیا؟ وہ جانوروں اور کھیتوں کا کام۔" منزہ کوشش کے باوجود اپنا تضحیک آمیز رویہ چھپا نہ سکی۔

"میرے دادا بیمار ہوگئے تھے۔ سیریس بیماری تھی۔ سب کچھ بیچنا پڑا۔ اس لیے ختم ہوگیا۔" سپاٹ چہرے اور آنکھوں میں کرب لیے سچل نے منزہ سے جھوٹ بولا۔

شام کو وہ خورشید کے ساتھ شاپنگ پر گیا تھا۔ کپڑے' جوتے' استعمال کی بہت سی چیزیں' موبائل اور گاڑی۔ رات گئے وہ لوٹے تھے۔ سچل نے خورشید کا آفس جوائن کرلیا تھا۔ وہ آفس ساتھ جاتے تھے مگر اپنی اپنی گاڑی میں۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ بغیر کسی آہٹ کے کھلی تھی۔ مکمل نیند

لینے کی وجہ سے وہ فریش تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ چھٹی کا سوچ کر وہ خوش ہونے ہی والی تھی کہ آج خورشید بھی گھر پر ہی ہوتا۔ افسردہ منہ بنا کر وہ پھر بستر میں گھس گئی کہ ماموں جان بھی ہوں گے آج۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی مگر وہ جانتی تھی کہ خورشید اسے ناشتے پر ضرور بلوائے گا۔ غصے سے بستر جھٹک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر سست قدموں سے واش روم چلی گئی۔

براؤن جینز پر زرد لمبی قمیص اور دوپٹا لے کر کندھوں تک آتے بالوں کی پونی ٹیل بنائی اور آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر عائشہ کے کمرے کی جانب چلی آئی۔

ان کے کمرے میں متوقع صورت حال تھی۔ عائشہ اپنے بالوں کو باندھ رہی تھی۔ انعم نیل پالش لگا رہی تھی اور عمینہ سو رہی تھی۔

"گڈ مارننگ ایوری ون۔" وہ پیار سے بولی تھی۔

"گڈ مارننگ حورعین! کیسی ہو میری پیاری بہن؟" عائشہ نے اس کے گال پر پیار کر کے پوچھا۔ وہ حورعین سے سات سال بڑی تھی۔ انعم تین سال۔ عمینہ اور حورعین میں کچھ مہینوں کا فرق تھا۔

"ہائے حورعین۔۔۔ یار! کیا ہم ایک دو گھنٹے اور نہیں سو سکتے؟" عمینہ کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے لمبی سی انگڑائی لینے کے بعد جو پہلا سوال کیا' وہ ہر ایک کے لیے متوقع سوال تھا۔

"تم کسی دن ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کھل کر سو جاؤ۔ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ اگر تمہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے تو تم کتنے دن مسلسل سو سکتی ہو؟" عائشہ نے پیار سے کہہ کر اس کا کمبل کھینچا۔

"تم بہت ظالم بہن ہو۔" عمینہ چلائی۔ "اللہ کرے تیمور بھائی جلدی سے کینیڈا سے واپس آجائیں تاکہ پھر میرے اوپر سے کوئی کمبل نہ کھینچے۔" اس نے دکھی دل سے دعا کی۔

☼ ☼ ☼

ان کی نشست حسب معمول تھی۔ اضافی انسان صرف سجل تھا۔

"نیند کیسی آئی سجل؟" منزہ نے سجل سے خوش اخلاقی دکھائی۔

"اچھی نیند آئی آنٹی!" سجل کے آنٹی کہنے پر منزہ نے ناک سکوڑی۔

"مجھے برا نہیں لگے گا۔ اگر تم مجھے صرف مسز منزہ خورشید بلاؤ۔"

"اوکے مسز منزہ خورشید۔" سجل فوراً بولا۔

"منزہ! تیمور کب تک آئے گا؟" خورشید نے منزہ سے پوچھا۔ حورعین نے شرارتی انداز میں انکھیوں سے عائشہ کو دیکھا۔ عائشہ نے آنکھوں سے اسے کچھ تنبیہہ کی۔ سجل نے گہری نظروں سے اس کارروائی کو دیکھا تھا۔

"تین مہینے بعد آئے گا' جانتے تو ہو تم۔" منزہ نے لاپروائی سے کہا۔

"میں نے تاریخ پوچھی ہے۔" خورشید ناگواری سے بولا۔

"تین مہینے پہلے ہی تاریخ کنفرم تھوڑا ہی ہو جاتی ہے خورشید!" منزہ چیخ کر بولی۔ وہ اپنی بحث میں مصروف ہو گئے۔

"سجل بھائی۔" عمینہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔

"جی!" وہ پیار سے بولا۔

"آپ مجھے اپنے گاؤں لے جائیں گے؟" فرمائش تیار تھی۔

"عمینہ!" منزہ کی پاٹ دار آواز آئی اور عمینہ نے منہ بسورا۔

☼ ☼ ☼

سیاہ جینز۔۔۔ اور سبز رنگ کی لمبی قمیص میں ملبوس بالوں کی پونی بنائے وہ اپنے دھیان میں چلی آرہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

خورشید نے بتایا تھا کہ وہ سترہ سال کی تھی۔ لگتی بھی تھی مگر اس کی آنکھیں۔۔۔ سنجیدہ سی آنکھیں ہر آہٹ پر چونک سی جاتیں۔ بلکہ سجل نے محسوس کیا تھا کہ وہ معمولی سی آہٹ پر بھی چونک جاتی تھی۔

بالکل اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ہاتھ میں موجود چابیوں کو زور سے بجایا۔ وہ چونک گئی۔ سجل اس کے قریب سے مسکراہٹ دباتا ہوا گزر گیا۔ حورعین نے پلٹ کر اس کی پشت کو حیرت سے دیکھا۔ عجیب حرکت تھی۔

اسے یہ شخص پہلے دن سے ہی پسند نہیں تھا۔ وہ ہر وقت خورشید کے ساتھ کچھ نہ کچھ بات کرتا ہی رہتا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ تھی اس کی سجل کے لیے نفرت کی' حالانکہ عمینہ اور عائشہ اس کے ساتھ کافی حد تک بے تکلف ہو چکی تھیں۔ حورعین کو اکثر ہی سجل کی نظریں اپنے اوپر محسوس ہوتیں۔ وہ نظریں بے ریا نہ تھیں۔ کچھ تھا ان نظروں میں۔ اس بات سے حورعین پریشان تھی۔ وہ سر جھٹک کر باہر لان میں آگئی۔

بہت اچھا موسم ہو رہا تھا۔ وہ لمبی سانس بھر کر درختوں کو دیکھنے لگی۔ خالی خالی آنکھوں سے عجیب عجیب سی خواہشات اس کے اندر جنم لینے لگیں۔

یہ درخت میرے کیوں نہیں؟

یہ پھول میرے کیوں نہیں؟

تتلی بھی میری نہیں چڑیا بھی میری نہیں۔

آخر میرا کون ہے؟ اتنی بڑی اس دنیا میں۔۔۔ میرا کون ہے؟

اس کا دل خالی رہتا۔ کبھی کبھی اسے اپنے جینے کا کوئی مقصد سمجھ نہ آتا آخر وہ کیوں پیدا ہوئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی اس کا اپنا ہو۔ جو اس کا خیال کرے۔ اس کا احساس کرے۔ جس سے وہ ڈھیر ساری باتیں کرے۔ اپنا ہر غم' ہر درد' ہر احساس' ہر خواہش' ہر محرومی اسے بتائے۔

حورعین کی عادتیں عجیب تھیں۔ اسے ناپائیدار چیزیں پسند نہ تھیں چاہے وہ کوئی جیولری ہو یا رشتہ۔ وہ کوئی دوست نہ بنا پائی تھی کہ دوستی اس کے نزدیک پائیدار رشتہ نہ تھی۔

ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک وہ یہاں تھی۔ یہ گھر زبیری ولا کہلاتا تھا۔ "زبیری" اس کے پردادا کا نام تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تھا' تب سے وہ ایسے ہی تھی تنہا۔

اس کے ماموں تھے بس' جو اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

اسے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ اپنے ماموں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے۔

حورعین کے بابا کی وفات ایک کار حادثے میں ہوئی تھی۔ اس کار میں اس کے دادا بھی تھے۔ دونوں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کی ماں نے بیوگی کا ایسا روگ پالا تھا کہ اکثر بیمار رہنے لگی۔ سننے میں آتا تھا کہ تب منزہ نے ہی اس کو سنبھالا تھا۔ حورعین کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب منزہ کو حورعین سے نفرت کیوں ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ دو سال کی ہوئی تو اس کی ماں کی بھی وفات ہو گئی تھی۔ اپنے ماموں' ممانی کے رحم و کرم پر رہ گئی جنہوں نے اسے بہت پیار سے پالا تھا اور تعلیم بھی دلوا رہے تھے۔

جمال زبیری اور کمال زبیری دو بھائی تھے۔ انہوں نے خود کاروبار شروع کیا تھا۔ کافی محنت کی پھر زمینیں وغیرہ سب کچھ بیچ کر شہر آبسے۔ ان دونوں بھائیوں کا پیار مثالی تھا۔ جمال زبیری کا ایک ہی بیٹا تھا آفتاب اور چھوٹے بھائی کمال زبیری کے دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا خورشید اور چھوٹی بیٹی عظمیٰ زبیری۔ جمال زبیری آفتاب کے خراب اطوار دیکھ کر تنگ آچکا تھا۔ وہ ایک بگڑا ہوا امیرزادہ تھا۔ اکلوتا ہونے' دولت مند ہونے اور خوب صورتی کا گھمنڈ۔۔۔ ان تینوں چیزوں نے مل کر اس کا دماغ کافی حد تک خراب کر رکھا تھا۔ شراب' جوا' لڑکیاں آفتاب زبیری اخلاقی لحاظ سے تباہ ہو چکا تھا۔

جمال اپنی بھتیجی عظمیٰ کو بہو بنانا چاہتا تھا۔ اس بات پر نہ تو کمال راضی ہوا نہ خورشید۔ مگر وہ جمال کو اپنا بڑا سمجھ کر مان گئے۔ خورشید ایک محنتی' فرماں بردار اور شریف لڑکا تھا۔ آفتاب کا دوست بھی تھا۔ اسے سمجھاتا بھی' مگر کبھی بھی آفتاب پر اس کی کوئی بات اثر

اندازہ نہ ہوئی تھی۔ آفتاب بھی عظمیٰ سے شادی نہ کرنا چاہتا تھا مگر جمال نے کہہ دیا تھا کہ اگر عظمیٰ سے شادی نہ کی تو میں اپنی تمام جائیداد عظمیٰ کے نام کردوں گا۔ قانونی طور پر یہ ممکن بھی تھا کیوں کہ یہ جائیداد کمال اور جمال کے باپ کی تھی۔ مگر کاروبار ان بھائیوں نے ہی کھڑا کیا تھا۔ آخر وہ مان گیا۔

اس نے شرط رکھ دی کہ اس کا حصہ اسے فوراً دے دیا جائے، مگر ایسا نہ ہوا۔ جمال زبیری ٹال مٹول کرتا رہا۔ آفتاب ایک دن بھی عظمیٰ کو خوش نہ رکھ پایا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد عظمیٰ اور آفتاب ایک بیٹی کے ماں باپ بنے۔

عظمیٰ جیسے نقش اور آفتاب جیسی رنگت چرانے والی حورعین واقعی حوروں جیسی خوب صورتی لے کر پیدا ہوئی تھی۔ کمال زبیری اور جمال زبیری اسی انتظار میں تھے۔ انہوں نے آفتاب اور عظمیٰ کے حصے کی تمام جائیداد حورعین کے نام کردی۔ مزید یہ کہ اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے اس کی جائیداد کوئی نہ لے سکتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو وہ جائیداد کسی ٹرسٹ کے پاس چلی جاتی۔

حورعین کی پیدائش کے آٹھ مہینے بعد جمال زبیری اور آفتاب زبیری ایک کار حادثے کا شکار ہوگئے۔ اس دکھ نے عظمیٰ کو توڑ دیا۔ آفتاب نے کبھی اسے خوش رکھا ہی کہاں تھا، مگر ایک موہوم سی امید تھی کہ آفتاب کبھی تو سدھرے گا، مگر یہ کیا ہوگیا تھا؟ عظمیٰ نے زندگی سے منہ موڑ لیا۔ آخر ایک دن دو سالہ حورعین کو چھوڑ کر وہ بھی دنیا سے منہ موڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

شام کا وقت تھا۔ جب سجل بے مقصد گاڑی سڑکوں پر دوڑا کر واپس آیا تھا۔ لاؤنج سے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔

عمینہ اور حورعین ٹی وی دیکھ کر خوب ہنس رہی تھیں۔ عائشہ بھی ان کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، مگر اس کا دھیان ٹی وی پر اتنا نہیں تھا۔ وہ اپنے موبائل پر لگی ہوئی تھی۔ ساتھ والے صوفے پر انعم بیٹھی اپنے ناخن فائل کررہی تھی۔ سجل کو سب سے پہلے عائشہ نے دیکھا تھا۔

"آیئے بیٹھیے سجل بھائی!" اس نے اخلاقاً کہا اور سجل بھائی صاحب بھی فوراً آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ گویا اسی دعوت کے منتظر تھے۔

عمینہ اور حورعین نے کوئی توجہ نہیں دی۔ انعم نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی تھی۔ سجل کی موجودگی کا احساس حورعین کو تھا۔ جب ہی اس کی ہنسی دب گئی تھی۔

وہ دو تین رنگوں کے لباس میں ملبوس تھی۔ سجل نے نظر اس پر سے ہٹائی۔

"آپ مجھے اپنے گاؤں لے چلیں گے؟" عمینہ نے موقع پاکر سجل سے کہا۔ انعم چڑ کر اپنی چیزیں اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔

"ہاں ضرور! اگر تمہاری ماما نے جانے دیا تو۔"

"کیا آپ واقعی اکلوتے ہیں سجل بھائی! حورعین کی طرح؟"

"ہاں!"

"سجل بھائی! اکلوتا ہونا کیسا لگتا ہے؟"

"حورعین سے پوچھ لو۔"

"اس کو کیا پتا۔ اس کے ماما بابا تو ہیں ہی نہیں جن کی وہ اکلوتی بیٹی ہے۔" عمینہ نے اپنے بچپنے میں کتنی بڑی بات کردی تھی۔

"اس کے ماما بابا۔۔۔؟" تھوڑی دیر بعد عائشہ اور حورعین بھی چلی گئیں تو سجل نے پوچھا۔

"ان کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ حورعین جب آٹھ مہینے کی تھی تو اس کے بابا کی ڈیتھ ہوئی اور جب دو سال کی ہوئی تو اس کی ماما کی بھی ڈیتھ ہوگئی۔"

"پہلے کہاں رہتی تھی وہ؟"

"یہ اوپر والا پورشن ان کا ہی تو تھا۔"

"آپ کی پھپھو آپ کے ساتھ کیوں رہتی تھیں؟" سجل موقع سے فائدہ اٹھا کر مزید معلومات لے رہا تھا۔

"کیوں کہ حورعین کے دادا اور میرے دادا ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ اور پھوپھا اور بڑے دادا اوپر ہی رہتے تھے اور آپ کو پتا ہے۔" وہ رازداری سے بولی۔ "حورعین کے بابا حورعین کی ماما کو پسند نہیں کرتے تھے۔"

"اچھا۔۔۔؟" وہ بھی تجسس سے آگے بڑھا۔

"ہاں! حورعین کے دادا نے آفتاب پھوپھا اور عظمیٰ پھپھو کی شادی زبردستی کروائی تھی، مگر آفتاب پھوپھا نے کبھی اس شادی کو دل سے قبول نہیں کیا۔ پھپھو زیادہ خوب صورت نہیں تھیں نا۔" اٹھارہ سالہ عمینہ بالکل ہی بچی تھی۔

"اگر حورعین کی ماما خوب صورت نہیں تھیں تو پھر حورعین کس پر ہے؟"

"اس کی آئیز اپنی ماما پر ہیں اور کامپلیکشن (رنگت) اپنے بابا پر۔"

"یہ سب تمہیں کیسے پتا؟"

"ماما بتاتی ہیں کہ پھپھو بہت ڈارک تھیں اور آفتاب پھوپھا انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اور پتا ہے، وہ یہ سب حورعین سے بھی کہتی ہیں۔"

"حورعین تو دکھی ہوجاتی ہوگی۔" اسے منزہ کی بے حسی پہ غصہ آیا۔

"ہاں ہوتی ہے۔ پھر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مجھے برا لگتا ہے۔ ماما اسے پسند نہیں کرتیں۔ حالانکہ وہ بہت سویٹ ہے۔" وہ دکھ سے پلکیں پٹپٹانے لگی۔

"مگر بابا اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ جب بھی گھر پر ہوتے ہیں، چاہتے ہیں کہ حورعین ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ وہ کھانا بھی تب شروع کرتے ہیں جب وہ کھانے پر موجود ہو، مگر وہ تب بھی خاموش رہتی ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ تو نہیں پتا۔" وہ معصومیت سے کہہ کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔ سجل سرہلا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ایک بزنس پرابلم تھی، جو حل نہ ہو پارہی تھی۔ سجل نے اس کو بہت کم وقت میں حل کردیا تھا۔ خورشید اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور سجل چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک پل کے لیے نظریں اٹھا کر خورشید کو دیکھا، مگر کہا کچھ نہیں۔

"تمہارے شناختی کارڈ پر تمہاری جو تاریخ پیدائش ہے اس کے حساب سے تم صرف چوبیس سال کے ہو کیا یہ تاریخ پیدائش صحیح ہے؟" خورشید نے اس سے پوچھا۔

"آپ کے خیال میں درست عمر کیا ہے میری؟" سجل نے خشک مزاجی سے پوچھا۔ خورشید نے بمشکل اپنے موڈ کو خراب ہونے سے روکا تھا۔

"اس کم عمری میں۔۔۔ ایسا شاطر دماغ کہاں سے پایا تم نے؟ تم مجھ تک پہنچ گئے۔ تم واقعی تیز لڑکے ہو۔"

"موروثی خوبی ہے یہ۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "میں جانتا تھا۔ میرا دماغ جانوروں اور کھیتوں میں کام کرنے کے لیے نہیں بنا۔ مجھے تو بہت اوپر جانا ہے۔ اسی لیے میں نے تعلیم حاصل کی۔ کیوں کہ اپنے آپ کو بہت اوپر دیکھنا چاہتا تھا۔"

"سجل حسین!" خورشید بغور اسے دیکھتا ہوا بولا۔ "مجھ سے ہاتھ ملا لو۔ ہم بہت کامیاب ہوں گے۔ ہم دونوں کے دماغ ایک جیسے ہیں۔ بزنس کی دنیا کے شہنشاہ ہم ہوں گے۔ کوئی برابری نہیں کرسکے گا ہماری۔۔۔ کیا کہتے ہو؟"

"دیٹس دا پوائنٹ۔۔۔ اب آپ وہ بات کررہے ہیں جو میں پہلے دن سے کررہا ہوں۔"

"جم کب جانا شروع کروگے؟"

"مجھے ضرورت ہے جم جانے کی؟"

"نہیں۔۔۔ ضرورت نہیں، لیکن بہتر ہے کہ جاؤ۔"

"چلا جاؤں گا۔"

"کبھی بار میں گئے ہو؟"

"نہیں۔"

"آج چلنا۔ کچھ دوستوں سے ملواؤں گا۔"

"کیا وہ عورتیں ہیں؟"

"تم چلنا بس۔"

"آپ ڈرنک بھی کرتے ہیں؟"

"یہ ہماری کلاس کا اسٹائل ہے۔ تمہیں بھی اپنانا ہوگا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"مجھے پسند نہیں، فورس نہ کریں۔" وہ دو ٹوک بولا

"دیکھتے ہیں۔ فی الحال تو چلو۔"

بار میں جا کر اسے اچھا لگا تھا۔ ڈرنک کے علاوہ اسے سب پسند آیا۔ خورشید کے دوستوں سے ملا جن میں عورتیں اور مرد دونوں تھے۔ اچھا وقت گزار کر وہ واپس آئے تھے۔

جو مسئلے خورشید کو پریشانی میں مبتلا کر دیتے تھے ان مسئلوں کو سچل چٹکی بجا کر حل کر دیتا۔ بہت ساری ذمہ داریاں وہ اپنے ہاتھوں میں لے چکا تھا۔ انہیں احسن طریقے سے نبھاتا۔ نہ صرف بزنس کو چمکانے کے، بلکہ مقابل کو زیر کرنے کے اور نقصان پہنچانے کے بھی اس کے پاس حربے موجود ہوتے۔ وہ کاروباری سوچ رکھنے کے باوجود خوش مزاج تھا۔ بزنس ڈنرز اور پارٹیز میں شرکت کرتا تو خورشید کو کم اور اس کو زیادہ اہمیت دی جاتی۔

بڑے بڑے بزنس مین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر لیتا ہے۔ خورشید یہ سب دیکھ کر دوہرے جذبات کا شکار ہو جاتا۔ سچل کی طرف سے اس کا خوف بڑھ گیا تھا۔

سچل ایک شاہانہ زندگی گزار رہا تھا۔ یہ گاڑی کا دوسرا ماڈل تھا۔ جو اس کے پاس تھا۔ اس کا والٹ پیسوں اور کریڈٹ کارڈ سے بھرا رہتا۔ جدید موبائل بہترین ملبوسات، بہترین خوشبوؤں میں بسا سچل اب پرانا سچل حسین نہ رہا تھا۔

وہ بارز میں جاتا۔ کلب جاتا۔ اس کے دوست بننے لگے۔ ان میں لڑکیاں بھی شامل ہونے لگیں۔ پھر یہ فہرست بڑھنے لگی۔ اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا مگر زندگی بدل چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

خورشید نے سچل کو لنچ کی آفر کی۔ سچل کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔

"کسی لڑکی سے محبت نہیں ہوئی تمہیں؟"

"ابھی ایسی کوئی لڑکی نہیں ملی جو تگڑی آسامی ہو۔" وہ خود اپنی بات پر ہنسا۔

"حورعین کی برتھ ڈے ہے اگلے ہفتے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو جائے گی۔ اس کا شناختی کارڈ بنوانا ہے فوراً۔" خورشید نے یکدم موضوع بدلا۔

"عمینہ بھی تو اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے۔"

"حورعین بھانجی ہے، امانت ہے میرے پاس۔"

"اس کی جائیداد الگ کرنے کے لیے یا پھر اس کے بعد اس کے دستخط وغیرہ کی ضرورت پڑے گی؟" سچل نے جواباً سوال کیا۔

"تم جانتے ہو اس بزنس میں حورعین کا کتنا حصہ ہے؟"

"جی۔ چھیاسٹھ فیصد کی مالک ہے وہ۔" وہ لاپروائی سے کھانا کھانے لگا۔

"اگر وہ الگ ہو جائے تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟"

سچل نے اس کی جانب دیکھا بولا کچھ نہیں۔

"اس کا سارا بزنس اس کے شوہر کا ہوگا۔ کس قدر بکواس بات ہے۔" وہ بھڑک رہا تھا۔ سچل کو ہنسی آئی، بمشکل ضبط کی۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی سے دل نہ لگا بیٹھے۔ اس کے پل پل کی نگرانی کرواتا ہوں میں۔ اس کی فون کالز تک چیک کرتا ہوں۔ یوں سمجھو، سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔"

"آج نہیں تو کل۔ ایک سال بعد۔ دس سال بعد۔ آخر اسے شادی تو کرنی ہے نا، ٹینشن لے کر بھی ہونا وہی ہے۔ جو طے ہے۔ سو ریلیکس!"

"یہ لڑکیاں۔ بہت خود غرض ہوتی ہیں۔ ایک غیر آدمی کروڑوں، اربوں کھا جائے، اپنا باپ یا ماموں نہ لے رہش۔"

"مائی گاڈ! مجھے خیال تک نہیں آیا کبھی۔ وہ چھوٹی سی گونگی ٹائپ لڑکی۔ اور اتنی بڑی جائیداد۔ وہ تو بہت تگڑی پارٹی نکلی۔" اس نے چشم تصور سے حورعین کو دیکھا۔

"پھر۔" خورشید کے کہنے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا خیال ہے اس پارٹی کے بارے میں؟" خورشید جال تو پھیلا ہی چکا تھا۔ اب اصل مدعا پر آیا تھا۔ سچل کھانا بھول گیا۔

"مجھے کیا ملے گا؟"

"تینتیس فیصد" خورشید نے جال سمیٹنا شروع کر دیا۔

"ڈن۔" بغیر پلکیں جھپکائے اس نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی سہیلی کے گھر آئی تھی۔ اس کی سہیلی چوہدریوں کی بیٹی تھی۔ دونوں نے گاؤں کے اکلوتے اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ چوہدریوں کے گھر پٹواری کی بیٹی حیات بی بی کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔

کلثوم کی منگنی ہونے والی تھی۔ حیات اس سے ملنے آئی تھی۔ دو گھنٹے بعد اس کا باپ اس کو لینے آیا تھا۔ کلثوم، حیات کو دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ دروازے پر وہ شخص کلثوم کے باپ اور بھائیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ حلیے سے گاؤں کا نہیں لگتا تھا۔ اور وہ اس گاؤں کا تھا بھی نہیں۔ وہ شہر کا آدمی تھا۔ اور اپنی گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ حویلی کے اندر سے دو بوڑھے مرد نکلے تھے۔ حیات اپنے بابا کے ساتھ نظر جھکا کر نکل گئی تھی، مگر ایسا دوسری جانب نہیں ہوا تھا۔ دوسری جانب نظریں اٹھی تھیں اور حیات پر جمی ہوئی تھیں۔ ان جمی ہوئی نظروں نے اثر دکھایا تھا۔ کچھ ہی دن بعد اس کا رشتہ آگیا تھا۔

اس کے ماں باپ اس رشتے سے زیادہ خوش نہ تھے مگر ان لوگوں نے جانے کیسے منایا۔ حیات خوش سے زیادہ حیران تھی۔ آخر کیا وجہ تھی؟ کس وجہ سے شہر کے ایک اتنے امیر آدمی نے اسے پسند کیا۔ وہ وجہ معلوم نہ کر پائی اور دلہن بن کر ایک بڑے سے محل نما گھر میں آگئی۔

اگلے دن اس بڑے سے محل میں کوئی ایک بھی ذی روح نہ ڈھونڈ سکی۔ اس کے شوہر کا کہنا تھا کہ شہر کا یہی رواج ہوتا ہے کہ شادی کے بعد کچھ دن تک نئے شادی شدہ جوڑے کو ڈسٹرب نہیں کیا جاتا۔ صرف ایک ملازمہ تھی۔ ان کا ہنی مون صرف ڈیڑھ ہفتے پر محیط تھا۔ اس کے شوہر کا کہنا تھا کہ اسے کچھ بزنس کا کام تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں ہنی مون ختم کرنا پڑا۔ حیات نے اپنے ماں باپ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ اس کا شوہر تین دن کے لیے اسے اس کے ماں باپ کے پاس چھوڑ گیا۔

اور پھر تین دن کا یہ انتظار کئی سال پر محیط ہو گیا۔ حیات کے گھر والوں نے اسے ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نہ ملا۔ وہ محل نما گھر کرائے کا تھا۔ اس کا شوہر اور اس کے منہ بولے رشتے دار گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے۔

حیات کے سر پر آسمان آگرا تھا۔ اس کے باپ نے ذلت سے بچنے کے لیے زمین اونے پونے داموں بیچی اور جانور لے کر دوسرے گاؤں چلے گئے۔

حیات اب ایک بیوہ تھی۔ ایک چار سالہ یتیم بیٹے کی ماں بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بیوہ عورت جس کی بے رنگ آنکھیں اکثر ہی دروازے سے ٹکراتیں۔ وہ بیوہ عورت جس کے بستر کا تکیہ آج بھی ― بھیگ جاتا۔ ایسا نہیں تھا کہ حیات کے بوڑھے باپ نے اپنے داماد کو ڈھونڈا نہیں تھا۔ اس کے باپ اور تایا نے حیات کے گاؤں میں زمین بیچی تھیں مگر منشی، زمینوں کا نیا مالک کوئی بھی کچھ بھی بتانے پر تیار نہ تھا۔ وہ یقیناً جانتے تھے حیات کے شوہر کا پتا۔

مگر نہیں بتایا۔

حیات نے ایک لمبا عرصہ اس وہم میں گزار دیا تھا کہ اس کے شوہر کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

اس نے حسب معمول جینز کے ساتھ لمبی قمیص پہن رکھی تھی۔

بینچ پر بیٹھ کر آسمان کو غور سے دیکھنے لگی۔ آسمان پر بادل تھے۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے پتوں سے بھرے درختوں کو دیکھنے لگی۔ گاڑی کے زوردار ہارن کی آواز پر وہ چونکی۔

کیا خورشید آگیا؟ یہ ناگوار سی سوچ تھی، مگر وہ گاڑی خورشید کی نہ تھی سچل کی تھی۔ سچل کے آنے جانے سے اسے فرق نہ پڑتا تھا۔ گاڑی پورچ میں آکر رک گئی۔ وہ باہر نکلا اس کا کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

سچل کس قدر بدل گیا تھا۔ لباس، ہیر اسٹائل سے لے کر انداز و اطوار تک۔ کوئی اس کا پرانا جاننے والا دیکھ لیتا تو نہ پہچانتا۔ کہ یہ وہی سچل تھا۔ حورعین کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر چلا گیا۔

کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد وہ بھی اندر بڑھ گئی۔ کوریڈور سے اندر جاتے ہوئے وہ ایک دم اس کے سامنے آگیا۔ حورعین نے برابر سے گزرنا چاہا مگر وہ سامنے آگیا۔ وہ پھر ایک طرف ہوئی، وہ پھر سامنے آگیا۔ حورعین نے سر اٹھا کر غصے سے اسے دیکھا۔ وہ فریش ہو کر لباس تبدیل کر چکا تھا۔ اس نے ایک طرف رک کر اسے اشارے سے جانے کو کہا، مگر وہ ہلا بھی نہیں۔

"جائیے" اب کی بار وہ بول اٹھی، سات مہینے میں یہ پہلا لفظ تھا جو سچل نے اس کے منہ سے سنا۔

"آپ کی آواز سات مہینوں میں پہلی بار سن رہا ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کرتی ہیں جو بولتی کم ہیں۔ اتنی پیاری آواز زیادہ لوگوں کو۔۔۔ آئی مین۔ ہر ایک کو نہیں سننی چاہیے۔"

"آپ مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" وہ غصے سے بولی۔

"فلرٹ۔۔۔ میں آپ کو فلرٹ لگتا ہوں؟ آپ کو لگتا ہے کہ ابھی ابھی اچانک آپ کو دیکھ کر مجھ پر آپ کی محبت کا انکشاف ہوا ہے؟ مجھے آپ سے تب ہی محبت ہو گئی تھی، جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا۔ سات مہینے میں نے آپ پر اپنی شرافت ثابت کرنے میں لگا دیے۔ آپ ابھی بھی مجھے فلرٹ کہہ رہی ہیں؟"

حورعین نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کی یہ گفتگو سنی۔ "آپ کے لیے بہتر ہو گا کہ سنبھل جائیں آپ۔"

"حورعین آفتاب! میں آپ کو یہ بات دوبارہ سمجھا دوں۔ میں نہ تو فلرٹ ہوں۔ نہ ہی سڑک چھاپ عاشق۔ وقت گزاری نہیں شادی کرنا چاہتا ہوں آپ کے ساتھ۔ یہ بات آپ دماغ میں بٹھالیں۔"

حورعین اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

دکھ سے۔۔۔ بے یقینی سے۔ اس کے دکھ اور بے یقینی کو سچل نے محسوس کیا تھا۔

وہ وہاں سے بھاگتے ہوئے چلی گئی۔ اب کی بار سچل نے اس کا راستہ نہ روکا۔

اس وقت تو وہ وہاں سے بھاگ گئی تھی مگر رات کے کھانے پر سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس کے بالکل مقابل تو نہ بیٹھتی تھی مگر ہوتی سامنے ہی تھی۔ آج اس ٹیبل پر بیٹھنا سخت ناگوار لگ رہا تھا۔ مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سچل کو نظر انداز کرے گی۔ وہ نظریں جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے نظریں اتنی اٹھائیں کہ سلاد کی ٹرے ڈھونڈ سکے۔ وہ زیادہ دور نہ تھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی، مگر اپنے سامنے نہ کر پائی۔ اس ٹرے کو دوسری جانب سے سچل نے پکڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک

نظر اٹھا کر لاشعوری طور پر دیکھا پھر نظر ہٹالی۔ سچل نے ٹرے چھوڑ دی، وہ بے زار ہو گئی، سچل نے یہ جان بوجھ کر کیا تھا۔

کمرے میں آکر اس نے کتابیں بیڈ پر پٹخ پٹخ کر اپنا غصہ نکالا تھا۔ پتا نہیں اسے اتنا غصہ کس بات پر آرہا تھا۔

اگلی صبح جب وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر گئی تو وہاں بھی سچل پہلے سے موجود تھا اور پھر وہی ڈراما دوبارہ ہوا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔

لنچ ٹائم پر بھی اس نے سچل کو موجود پایا۔ اس وقت خورشید بھی وہاں موجود نہ تھا۔ اس نے کھانا اپنے کمرے میں منگوا لیا۔ وہ درحقیقت بہت الجھی ہوئی تھی۔

وہ شام حورعین نے اپنے کمرے میں بند ہو کر گزاری تھی۔ اسے بہت زیادہ وحشت اور ڈپریشن ہو گیا تھا۔ پریشان ہو کر وہ رات کے کھانے کے لیے باہر آگئی۔ سچل حسب توقع وہیں موجود تھا۔ اس کو وہاں دیکھ کر حورعین کا موڈ سخت خراب ہوا مگر اس نے کچھ ظاہر نہ کیا۔

سچل خورشید سے باتوں میں مصروف رہا۔ اس نے کل والی کوئی حرکت نہ دہرائی اور جلدی کھانا کھا کر چلا گیا تھا۔

حورعین نے سکون کا سانس لیا تھا۔

وہ کھانا کھا کر عائشہ سے کچھ دیر باتیں کرتی رہی اور پھر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے حسب معمول اپنا دروازہ بند کیا اور پلٹی تو حیران رہ گئی۔ سچل پتا نہیں کس کونے سے نکل کر سامنے آگیا تھا۔ حورعین نے بے ساختہ چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ ایک جست میں اس تک پہنچ گیا اور اپنے ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا۔ حورعین نے مچل کر اپنا سر اور منہ چھڑوانے کی کوشش کی۔

"چیخنا مت۔" یہ کہہ کر سچل نے اسے چھوڑ دیا۔

حورعین غصے سے پاگل ہو گئی۔

"کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟ نکلو میرے کمرے سے ابھی۔" وہ حتی الامکان آواز دبا کر بولی۔ سچل اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں اور تم سے بات کرنا اتنا مشکل ہے کہ مجھے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اگر آرام سے میری بات سن لو گی تو جلدی چلا جاؤں گا یہاں سے۔۔۔ بے کار بحث اور میرے جانے کی ضد کرتی رہو گی تو تمہاری مرضی۔ میں بات مکمل کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اب فیصلہ تمہارا ہے۔" معنی خیز اور شرارت سے بھرا انداز تھا اس کا۔ حورعین سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"حورعین! میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔ تم میری وجہ سے اپنے آپ کو تکلیف مت دو۔ میں نہیں چاہتا کہ۔۔۔"

"اس سب کے ذمہ دار تم خود ہو مسٹر سچل! تم اگر الٹی سیدھی حرکتیں نہیں کرو گے۔ میرا دھیان اپنی جانب کروانے کی کوشش نہیں کرو گے تو ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اور اب جاؤ یہاں سے۔۔۔ تم منزہ ممانی کو جانتے نہیں ہو۔ ابھی اگر انہیں پتا چل گیا تمہاری اس حرکت کا تو قیامت اٹھا دیں گی وہ۔"

"میں انہیں جتنا جان چکا ہوں۔ اس سے زیادہ جاننے کی مجھے خواہش نہیں اور یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہیں اپنے ہونے کا احساس نہ دلاؤں، تم مجھے اگنور کرتی رہو۔ میں تمہیں چھپ چھپ کر دیکھتا رہوں اور تم شہزادیوں جیسی زندگی گزارتی رہو۔ واہ۔۔۔ مجھے کیا سڑک چھاپ دو ٹکے کا عاشق سمجھ رکھا ہے تم نے۔۔۔ خیر۔۔۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میری وجہ سے اپنے آپ کو تکلیف میں مت ڈالو۔"

"کیوں محبت کا نام بدنام کرتے ہو مسٹر سچل حسین! کوئی اور نام دو اپنی فلرٹ طبیعت کو۔"

"بس۔" وہ دھیمے لہجے میں چلایا تھا۔ گرم لہجہ آگ برساتا ہوا تھا۔

"بس حورعین! بہت ہو گیا۔ میں اپنی محبت کی اور توہین برداشت نہیں کروں گا۔ تمہیں ماننا ہے تو مانو ورنہ۔۔۔ اب اگر دوبارہ میں نے تمہارے منہ سے یہ لفظ فلرٹ سنا۔" وہ کچھ دیر عصیلی نظروں سے اسے گھورتا

رہا۔ "تو نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔ سمجھیں تم؟"

حورعین ایک تو اس کی غصیلی نظروں سے خائف ہوئی تھی دوسرا اس کی یہاں موجودگی اسے پریشان کررہی تھی۔

سچل اب بھی اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔

"میں محبت کر بیٹھا ہوں تم سے۔ یہ غلطی ہے میری 'مگر یہ میری وہ واحد غلطی ہے جس کو کرنے میں میری کوئی کوشش نہیں۔ یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھنا۔"

حورین کا غصہ... خوف سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ یاد تھا تو صرف یہ... کہ... وہ حورعین آفتاب ہے۔

سچل دروازہ کھول کر چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عائشہ کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی۔ دو مہینے بعد شادی تھی اور وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔

عائشہ کے سسرال والے آئے ہوئے تھے۔

خورشید اور سچل کافی دن بعد دن کے وقت گھر میں دکھائی دیے۔ اچھے ماحول میں لنچ کیا گیا۔ تیمور بھی موجود تھا وہاں۔

سچل' تیمور اور مہیب (عائشہ کا دیور) میں اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ عائشہ کی چھوٹی نند سمیعہ بھی سچل سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی اور بڑی صبا بھی پیش پیش تھی۔

سب کچھ اچھا اور خوب صورت تھا۔ حورعین بھی کافی انجوائے کررہی تھی۔ باتوں باتوں میں شرطیں لگنے لگیں ایک دوسرے کو بیڈمنٹن میں ہرانے کی۔ عائشہ تو شرماتی ہی رہی۔ حورعین اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ان سے تھوڑی ہی دور انعم بیٹھی ہوئی تھی اور حسب عادت ہر چیز میں نقص نکال رہی تھی۔

"میں بیڈمنٹن میں بہت ماہر ہوں سچل! سوچ کر کھیلنا۔ مجھے کوئی ہرا نہیں سکتا۔" تیمور نے سچل کو خبردار کیا تھا۔ سچل ہنس پڑا۔

"آپ سے تو میں... اگر چاہوں بھی... تو نہیں جیت سکتا۔ ورنہ عائشہ ناراض ہوجائے گی۔"

"ویری فنی۔" انعم مصنوعی ہنسی ہنسی تھی۔

"سچل! تم نے آرمی کیوں نہیں جوائن کی۔ تم آرمی کے لیے فٹ لگتے ہو۔" تیمور کے والد نے اس سے پوچھا۔

"کسی نے گائیڈ نہیں کیا تھا صحیح وقت پر انکل!" اونچی آواز میں کہہ کر اس نے اسٹروک لگایا۔

"صاف گوئی کی حد کردی تم نے جوان! مگر یہ بھی سچ ہے کہ تمہاری جگہ آرمی میں تھی' بزنس میں نہیں۔" وہ خود بھی آرمی میں رہ چکے تھے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل! بعض اوقات لگتا ہے کہ کسی کی جگہ کہیں اور ہونی چاہیے تھی۔ جیسے کوئی کہیں سے بھٹک کر کہیں اور آپہنچا ہے۔" اس کی نظریں صرف ایک لمحے کے لیے گھومی تھیں اور پھر سے زاویہ بدل گیا تھا۔ حورعین نے بے زاری سے منہ بنایا' مگر کہیں اور... ایک ہوا چلی تھی۔

سچل کریم کلر کے ٹراؤزر کے ساتھ براؤن شرٹ میں ملبوس' کسرتی مضبوط جسم' چہرے پر پسینے کے قطرے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنی گیم ہار رہا تھا اور انعم... اپنا دل ہار گئی تھی۔ اس نے ایک بار ہی اس "دیہاتی" پر غور کیا تھا اور اسے وہ بھی مہنگا پڑا تھا۔

اس دن کے بعد سے انعم کی نظروں کا محور وہی رہنے لگا۔ وہ نظر جو کھیل کے دوران اس نے لڑکیوں کی جانب ڈالی تھی اور اس کے اس ایک جملے نے انعم کا رہا سہا غرور بھی توڑ دیا تھا۔ حالانکہ دونوں ہی چیزیں اس کے لیے نہ تھیں' مگر وہ اپنی ہی نہیں۔ دوسروں کی چیزیں بھی لے لینے کی عادی تھی۔

☆ ☆ ☆

دن گزر رہے تھے اور پارلر کے چکر بھی باقاعدگی سے لگتے۔ ایک کام مکمل ہوتا' دس کام اور نکل آتے۔ تھک کر شام کو لان میں بیٹھ کر سامان پر تبصرے کیے جاتے۔ اس وقت بھی یہ ہی ہو رہا تھا۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے خورشید گھر پر موجود تھا۔

سچل کے روز و شب بہت زیادہ مصروف گزر رہے تھے۔ دن تو الگ بات آج کل ناشتے اور رات کے کھانے پر بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

اتفاق سے دس منٹ بعد سچل بھی آگیا۔ ہلکے نیلے رنگ کی جینز اور گہرے نیلے رنگ کی شرٹ میں ملبوس وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔

حورعین نے اپنا بیٹھنے کا انداز بدلا۔ وہ تقریباً" ڈیڑھ مہینے بعد آمنے سامنے آئے تھے۔ حورعین نے چور نظروں سے اسے دیکھا تھا اور پھر نظریں پھیلی تھیں۔

وہ اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔

"کیا کچھ لے لیا اور کیا کچھ رہ گیا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی بہت کچھ رہتا ہے۔ اور بہت کچھ لے لیا ہے۔" انعم نے بتایا شروع کیا تھا۔ "زیور آدھا آگیا ہے۔ آدھا آرڈر کیا ہوا ہے' فرنیچر لینا ہے اور۔ پتا ہے بہت خوبصورت گھر لیا ہے عاشی کے جہیز کے لیے پاپا نے۔" انعم بہت خوشی سے بتارہی تھی۔

انعم نے ان آٹھ نو مہینوں میں پہلی بار اس سے اچھے انداز میں بات کی تھی۔

"اینی وے سچل! تم بتاؤ تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔" خورشید نے پوچھا تھا۔

"پچھلے دو مہینے سے میں گھر نہیں گیا۔ تین چار دن کے لیے اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"اوکے مگر یہاں بھی تمہاری ضرورت ہے۔ اس لیے جلدی آجانا۔"

"جی! ٹھیک ہے میں جلدی آجاؤں گا۔"

"تمہیں اپنا گھر یاد آرہا ہے؟" انعم مسکراہٹ دبا کر بولی تھی۔

"ہاں! اماں کے ہاتھ کے پراٹھے یاد آرہے ہیں۔"

"پراٹھے تو یہاں بھی بنتے ہیں۔" وہ ہنسا کر بولی۔

"میری اماں کے ہاتھ کے تو نہیں بنتے۔"

"تو تم صرف پراٹھے کھانے جارہے ہو۔ اماں سے ملنے نہیں۔" وہ بات بنا کر بولی تھی۔

سچل نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

اور یہ وہی لمحہ تھا' جب حورعین نے لاشعوری طور پر سچل کی طرف دیکھا اور سچل کے دیکھنے پر نظر چرا بھی لی۔ سچل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا ایک عکس آیا اور معدوم ہوگیا۔

"اوکے گائز! مجھے اپنی پیکنگ کرنی ہے۔ بائے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس نے اپنا سرکل کافی وسیع کرلیا ہے اور اس کے سرکل میں لڑکیاں بھی ہیں۔ فاروقی صاحب کی چھوٹی بیٹی مہوش بھی اس کی فرینڈ ہے۔" خورشید حورین کو سنا رہا تھا۔ جس کو شاید اس بات سے فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔

"کیا آپ مذاق کررہے ہیں ڈیڈ! وہ تو اتنی نک چڑھی ہے۔"

"سچل کافی اگنور کرتا ہے اسے۔ مجھے لگتا ہے وہ انوالو ہے سچل میں۔" اب کی بار بھی یہ بات حورعین کو سنائی گئی تھی مگر سن کر انعم بھڑک گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا وقت تھا۔ وہ سو نہیں پارہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو کمرے سے باہر آگئی۔ نیچے والے پورشن میں بالکل خاموشی تھی۔ یہاں خورشید نے اپنی ایک لائبریری بنائی ہوئی تھی۔ وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بیٹھی رہی' پھر کھڑی ہوگئی۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ لائبریری میں کچھ آہٹ محسوس ہوئی تو وہ اس طرف بڑھ گئی۔ گلاس وال سے اسے اندر سچل نظر آیا۔ وہ کوئی کتاب ریک میں سے نکال رہا تھا۔ وہ واپس پلٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دوبارہ لائبریری میں داخل ہوئی' اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔ انعم کو دیکھ کر حیران ہوا۔

"میں جاگ رہی تھی۔ لائبریری کی جانب آئی تمہیں دیکھا تو سوچا چل کر ایک کپ کافی پی لی جائے۔"

اس نے ایک کپ سچل کے سامنے رکھا اور اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"تم اتنی دیر تک جاگتی ہو؟ تمہیں تو صبح جلدی جانا

ہوتا ہے نا کالج۔"

"جانا تو تمہیں بھی جلدی ہوتا ہے۔ تو پھر تم کیوں اتنی دیر تک جاگ رہے ہو؟" اس نے پٹاخ سے جواب دیا۔

سجل نے خاموشی سے کپ اٹھالیا۔

انعم کافی پیتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

انسان کی کیا حقیقت ہے؟ کیا پہچان ہے؟ کیا صرف لباس اور طریقہ نشست و برخاست ہی انسان کا اصل ہے۔ جو انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایک انسان اگر شلوار قمیص میں ملبوس ہے تو دیہاتی ہے۔ پینٹ شرٹ میں رہتا ہے تو ماڈرن جنٹلمین ہے۔ کردار کچھ نہیں؟

"اپنے گھر جانے کے لیے کب نکلوگے؟"

"کل صبح۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر مختصر جواب دیا۔

"مہوش کے ساتھ کیا تعلق ہے تمہارا۔"

"وہ ایک نادان لڑکی ہے ——— کسی بچی کی طرح ضدی اور ناسمجھ۔ مجھے ابا جان بن کر دوسروں کو سمجھاتے رہنا پسند نہیں۔ مہوش کو سمجھانا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ دوستی نہیں ہوسکی۔ میں بور ہو جاتا ہوں۔"

انعم کے سینے سے سانس یوں نکلا تھا جیسے کوئی اٹکی ہوئی پھانس ہو۔ وہ ہلکی پھلکی ہوگئی ہو۔ سجل اب اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے جانے کا منتظر ہو۔ انعم اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے شادی کروگے سجل؟"

سجل کی آنکھیں خون رنگ ہوگئیں۔

"آئی ایم ویٹنگ فار یور آنسر۔" وہ آرام سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

وہ سب آفس اور کالج جانے کے لیے تیار تھے ناشتا شروع ہوچکا تھا۔

"زرینہ!" انعم نے ملازم کو پکارا۔ "سجل کو ناشتے کا کہہ کر آؤ۔"

"وہ جاچکا ہے۔ صبح بہت جلدی چلا گیا تھا۔"

خورشید نے بتایا۔ انعم حیران رہ گئی۔ حورعین بھی حیران ہوئی۔ اس کے اعصاب میں شکستگی اتر آئی۔

وہ چلا گیا تھا۔ بغیر بتائے۔ بغیر اس سے ملے، بغیر اسے دیکھے۔

ایک احساس تھا کہ ہر وقت دو آنکھیں اسے دیکھتی ہیں۔ وہ احساس ختم ہوچکا تھا۔ اپنائیت کا جو ایک احساس تھا۔ اب نہیں تھا۔ عجیب سی بے کلی پھیل گئی تھی اس کے اندر باہر۔ لگتا تھا کہ وہ پھر تنہا ہوگئی ہو۔

اسے اکثر ایسا لگتا تھا کہ سجل صرف اور صرف خورشید کے کہنے پر اسے اپنے پیار کے جال میں پھنسا رہا ہے مگر سجل کی باتیں اس کی نظریں۔

اس کے سر میں مسلسل درد رہنے لگا تھا۔

انعم نے اپنا موبائل دیوار پر دے مارا۔ سجل نے اپنے دونوں نمبرز بند کر رکھے تھے۔

☆ ☆ ☆

چار دن کا کہہ کر وہ سترہ دن بعد واپس آیا تھا، وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے۔ خورشید آفس میں تھا۔ عائشہ، عمینہ، منزہ کے ساتھ فرنیچر پسند کرنے گئی ہوئی تھیں۔ حورعین کی کچھ طبیعت خراب تھی۔ وہ گھر پر تھی۔

کار پورچ میں کھڑی کر کے اپنا سامان خود اندر لے آیا۔ وہ اندر آرہا تھا جب لاؤنج کے دروازے پر حورعین سے ٹکراؤ ہوگیا۔ وہ سجل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

ایک عجیب سا جذبہ ابھرا تھا دل میں۔ پھر تشویش اور اندیشے خوشی پر حاوی ہوگئے۔ وہ اس کی سائیڈ سے نکل کر جانے لگی کہ بیگ نیچے رکھ کر وہ ایک دم اس کے سامنے آگیا۔ حورعین نے جھجک کر مگر غصے سے اسے دیکھا۔ ایک عرصے بعد اسے شلوار قمیص میں دیکھا تھا۔ گاؤں کی آب و ہوا اور کھلے موسم نے اس کی رنگت کو تھوڑا گہرا کردیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی ویلکم نہیں؟"

وہ بغیر جواب دیے جانے لگی تو پھر سامنے آگیا۔

"اس نفرت کی کوئی حد ہے یا نہیں؟" وہ اس کے قریب آیا۔ "میں اتنے دن بعد آیا ہوں۔ بات کرو مجھ سے۔"

"جی!" وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔ "اسی لیے تو مجھ سے مل کر گئے تھے تم؛ جانے سے پہلے اللہ حافظ کہا۔ سی یو کہا۔ پھر تم مجھے ہر روز فون بھی کرتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو تمہارے تین چار فون آجاتے تھے ایک دن میں۔ ہیں نا؛ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش مت کیا کرو سجل!"

سجل کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت جاگی۔

"اچھا!" وہ محظوظ ہوا۔ "اگر یہ ہی بات میں تم سے کہوں تو؟" اس کی مسکراہٹ سے حورعین چڑ گئی۔

آخر وہ کیوں اس کے جال میں پھنس رہی تھی۔

"میں تم سے اتنی نفرت کرتی ہوں سجل حسین کہ اگر میرے پاس پستول ہو تو میں ـــ اپنے آپ کو مار ڈالوں۔ ختم کرلوں خود کو۔ تم سے اپنی جان چھڑوانے کا اور کوئی طریقہ مجھے سمجھ نہیں آتا۔" وہ مڑ کر بری طرح روتی ہوئی چلی گئی۔ سجل تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر بیگ اٹھا کر اندر کی طرف بڑھا مگر تب ہی انعم ٹکرا گئی۔

حورعین اس پر شک کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سجل کی ان سب حرکات کے پیچھے خورشید کا کوئی مقصد تھا۔ ایک بات تو سچ تھی کہ حورعین کی چھٹی حس کمال کی تھی۔ مگر سجل قدرے بددل ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ انعم کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر انعم کسی بلا کی طرح حملہ آور ہوئی اس پر۔

"کہاں تھے تم اتنے دن سے۔ ہاں؟" وہ اس کے قریب آکر ترش لہجے میں بولی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کہاں تھا اور مس انعم خورشید! اپنی کینٹس بھول گئی ہو کیا؟"

"تو بھل ود اپنی کینٹس۔ تم نے کہا تھا چار دن بعد آجاؤ گے اور اب ـــ اٹھارہواں دن ہے۔ موبائل تم نے بند کر رکھا تھا اپنا کیوں؟" وہ حلق کے بل چلائی۔

سجل نے گھبرا کر آگے پیچھے دیکھا۔ کوئی ملازم نہ تھا۔

"کس سے بھاگ رہے ہو تم؟ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے ـــ ابھی۔" سجل نے اسے ایک طرف دھکیلا۔ اور اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ انعم نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"انعم! میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں پلیز۔" وہ تھکے انداز میں بولا۔

"مجھے جواب چاہیے سجل! ابھی اور اسی وقت۔" وہ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئی۔ "تم مجھ سے شادی کروگے یا نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"آئندہ مجھ سے ایسی بات مت کرنا انعم! مجھے گھن آتی ہے تم سے۔" سجل نے سختی سے اسے کہا۔ "عائشہ اور عمینہ کی طرح تم بھی مجھے بھائی کہا کرو۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" وہ بھونچکا گئی۔

وہ بغیر جواب دیے باتھ روم میں گھس گیا۔

وہ غصے سے کچھ دیر تو وہیں کھڑی رہی۔ پھر تن فن کرتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔ بہت رونق اور ہلا گلا تھا کہ اچانک گھر کے سب ہی افراد کو خورشید نے اپنے کمرے میں بلالیا۔ اس نے حورعین کو پاس بلا کر پیار کیا اور ایک دھواں دار تقریر شروع کردی۔ عظمیٰ سے اپنی محبت کی عظمیٰ کی ناکام ازدواجی زندگی کی

اس کی تقریر کا دوسرا حصہ اس بات پر مشتمل تھا کہ اس نے کل رات خواب میں عظمیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ ناراض تھی خورشید سے، جس کی وجہ یہ تھی کہ خورشید نے اپنی بیٹی کا سوچا، عظمیٰ کی بیٹی کا نہیں۔

خورشید کی تقریر کا آخری حصہ یہ تھا کہ وہ حورعین کا نکاح عائشہ کے نکاح سے پہلے کرے گا۔ اور رخصتی دونوں کی ایک ہی دن ہوگی۔ یعنی کہ آج سے صرف پانچ دن بعد۔

حورعین کو لگا کہ اس کے سر پر کمرے کی چھت آگری۔ اسے آج تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیسے اتنی بڑی بڑی خبریں سن کر بھی بے ہوش نہ ہوتی تھی۔ آنکھیں پھاڑے سیدھی کھڑی رہتی اور منہ کھول کر اگلے بندے کو بس دیکھتی ہی رہتی۔

مگر اگلی خبر نے اس کی دیرینہ خواہش آج پوری کر ہی دی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے خورشید کو دیکھا۔ پھر اپنے ہونے والے شوہر سچل کو۔ اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

✡ ✡ ✡

وہ خورشید کے کمرے میں موجود تھا۔ وہ اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس نے شادی کے بعد کیا کرنا ہے۔ وہ بہت دھیان سے سن رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ خورشید نے اندر آنے کو کہا۔ حورعین اندر داخل ہو گئی۔ سچل کے سامنے ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ حورعین خورشید کے بلائے بغیر آئی تھی۔

"ماموں! مجھے آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے سچل کو نظر انداز کر کے صرف خورشید کو دیکھا۔

"سچل تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔ صرف چار دن بعد تم دونوں کی شادی ہے۔ تم سب کچھ اس کے سامنے کہہ سکتی ہو بیٹا!" وہی چاپلوسانہ انداز۔

"نہیں ماموں! مجھے آپ سے ہی کہنا ہے اور اکیلے میں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"حورعین! جو کہنا ہے سچل کے سامنے کہو۔" خورشید کا انداز بدل گیا۔

"ماموں! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔"

"وجہ؟" خورشید نے ابرو اچکائے۔

"میں پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ میری بیٹی! تم نے یہیں پر رہنا ہے شادی کے بعد۔ صرف ولیمہ کے لیے سچل کے گاؤں جاؤ گی۔ اگلے ہی دن واپس آجاؤ گی۔ تم پر سچل کی بھی کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ اطمینان سے اپنی پڑھائی جاری رکھنا۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ مجھے سچل سے شادی نہیں کرنی۔"

سچل نے اب رخ موڑ کر بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"کسی اور سے کرنی ہے؟" خورشید کی نظروں میں شک تھا۔

"مجھے شادی نہیں کرنی اور سچل سے تو بالکل نہیں کرنی۔"

"لگتا نہیں کہ تم کسی اور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو لیکن اگر چاہتی بھی ہو تو بھول جاؤ۔" خورشید نے خشک لہجے میں کہا۔

"ماموں! میں کسی صورت سچل سے شادی نہیں کروں گی۔"

برداشت ختم ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"میں مر جاؤں گی مگر سچل سے شادی نہیں کروں گی۔ میں نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔" وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ سچل بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ خاموش نظروں کے ساتھ بے تاثر چہرے کے ساتھ۔

"ہوں۔۔۔ تم نکاح کے وقت بھی انکار کر سکتی ہو سب مہمانوں کے سامنے۔ نکاح خواں کے سامنے۔ ٹھیک کہا۔ تو پھر حورعین بیٹا! اپنے رہنے کا انتظام کر لو، کیونکہ جن مہمانوں کے سامنے تم انکار کرو گی ان سب کے سامنے ہی میں تمہیں گھر سے اسی حالت میں نکال دوں گا۔" حورعین رونا بھول گئی۔

"یہ میرا بھی گھر ہے ماموں۔" اس کی آواز پاتال سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں! ــــــ مگر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ جاؤ اپنے حق کے لیے عدالت جاؤ۔ کیس کرو مجھ پر۔ مگر اکیلے کہیں اور رہ کر۔ یہاں سے تمہیں اسی وقت نکلنا ہو گا۔ میں دھمکی نہیں دے رہا۔ کر کے بھی دکھاؤں گا۔ تم دیکھنا۔" خورشید کے لفظوں میں کڑواہٹ تھی۔ قہر تھا۔ اتنی سختی تھی کہ حورعین اپنی جگہ پر جم سی گئی۔ پھر وہ مڑی اور دروازہ کھول کر چلی گئی۔

✡ ✡ ✡

وہ بری طرح رو رہی تھی۔ سچل کی موجودگی کی پروا کیے بغیر۔

وہ وہاں بہت دیر سے کھڑا تھا مگر کچھ بول نہیں رہا تھا۔ خاموشی سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

آج بھی وہ اس کے کمرے میں سب سے چھپ کر آیا تھا مگر آج حورعین اسے جانے کو نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔

"اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟"

"تم چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں کوئی چیز مار کر تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔" وہ اس کے مقابل کھڑی ہو کر چیخی۔

"تم آج مجھے اپنی نفرت کی وجہ بتاؤ گی حورعین! ورنہ میں نہیں جاؤں گا۔"

سچل کی نظروں میں نجانے کیا تھا اس نے بے اختیار ہی نظریں چرائی تھیں۔ سچل مبہم سا مسکرایا۔

"کوئی زبردستی نہیں ہے حورعین! مگر میں وجہ جاننا چاہتا ہوں تمہاری نفرت کی۔"

"میں جانتی ہوں تم ماموں کے چمچے ہو۔ انہیں بتا دو گے مگر اب مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے ہمیشہ سے لگتا ہے کہ ماموں جان ایمان دار انسان نہیں۔ وہ کرپٹ ہیں اور اب وہ کسی مقصد کے تحت ہی میری تم سے شادی کروا رہے مجھے لگتا ہے کہ میری جائیداد لے کر وہ مجھے بیچ دیں گے۔ ان اندیشوں نے مجھے مار ڈالا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں وہ عجیب سی بھوک نہیں ہے مگر تم ان کا ہی دایاں ہاتھ ہو۔ تم پلیز ماموں سے کہو۔ میری جائیداد لے لیں۔ ابھی لے لیں۔ جہاں سائن کروانے ہیں کروا لیں مگر مجھے چھوڑ دیں۔"

"میں تمہیں تمہارے ماموں سے بہت دور لے جاؤں گا۔ حورعین! تمہیں کبھی کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی ہے۔ مجھ سے کر لو۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ جہاں تک خورشید انکل کی پلاننگ کی بات ہے تو میں ان کی کسی پلاننگ میں شامل نہیں ہوں۔ اگر تم چاہو گی تو میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ تم میرا یقین کرو۔"

حورعین خاموش ہو گئی۔ اس نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ وہ جان گئی تھی کہ کسی احتجاج کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

سچل کمرے سے نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

انعم منزہ کے پاس موجود تھی۔ وہ بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ منزہ سکتے کے عالم میں تھی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا انعم! کیا کہہ رہی ہو تم؟ حواس تو قائم ہیں تمہارے؟" منزہ پھٹ پڑی۔

"کیوں میں نے ایسی کیا بات کر دی ہے۔" وہ جواباً ترخ کر بولی۔

"وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟ کیا فیوچر ہے اس کا؟ ہم کیا جانتے ہیں اس کے بارے میں؟ میں تمہارے لیے اتنا اچھا سوچ رہی ہوں اور تم۔ آئی کانٹ بلیو دس۔ تم نے کیا دیکھا سچل میں؟"

"ڈیڈ نے حورعین کا سوچ لیا۔ میں نظر نہیں آئی ان کو۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"خورشید نے سچل کو حورعین سے شادی کا آرڈر دیا تھا۔ وہ مان گیا۔ اس کی اوقات ہی نہیں تھی انکار کرنے کی۔ تم میں اور حورعین میں بہت فرق ہے انعم!"

"میچ تو اس کا حورعین کے ساتھ بھی نہیں ہے۔" وہ منمنا کر بولی تھی۔

اس کا دل انوکھا لاڈلا بنا صرف چاند کی ہی خواہش کر رہا تھا۔ مگر پھر خاموشی سے اس نے شادی اٹینڈ کر لی۔ مہندی کی تقریب شروع ہونے سے دس منٹ پہلے حورعین کا سچل سے اور عائشہ کا تیمور سے نکاح ہو گیا تھا۔

حورعین بالکل چپ اور خاموش تھی۔ حورعین پر ترس کھاتی نظروں کو جھٹکا تب لگا جب سچل شادی کے لیے تیار ہو کر آیا۔

سچل اور تیمور دونوں سیاہ ڈنر سوٹ اور عائشہ اور حورعین گہرے سرخ رنگ کے لباس میں ملبوس تھیں۔

انعم نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ حورعین سے زیادہ خوبصورت تھی اور حورعین سے بہتر ہی حق رکھتی تھی۔

عائشہ رخصت ہو کر تیمور کے گھر چلی گئی تھی اور حورعین سچل کے کمرے میں بٹھادی گئی۔

تازہ پھولوں کی سیج تھی۔ کمرے میں لاتعداد پھولوں کے بو کے تھے جن میں تازہ گلاب مہک رہے تھے۔

جیسے ہی رشتے دار لڑکیاں اور دوست اسے وہاں چھوڑ کر گئیں۔ وہ سیج کی لڑیاں سختی سے جھٹک کر بیڈ پر سے اتری اور صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور سچل اندر داخل ہوا۔ اس نے اندر آکر دروازہ لاک کرلیا۔

حورعین نے سچل کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی قالین کو گھورتی رہی۔ وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہوا۔

"نہ تو ہماری شادی قاعدے قوانین کے تحت ہوئی ہے' نہ ہی مجھے اتنی رسموں کا پتا ہے مگر ایک چیز معلوم ہے۔ دلہن کو منہ دکھائی دی جاتی ہے۔" وہ الماری کی طرف مڑا تھا۔ سچل نے ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اس کے پاس لاکر رکھا۔

وہ ایک شاکنگ پنک کلر کا لباس تھا۔ گولڈن تلے کے کام سے بھرا ہوا۔ اور اس کے ساتھ پرانے طرز کا زیور۔ اس سوٹ کیس میں کھسّہ بھی موجود تھا۔ دلہن کا تقریباً" مکمل سامان تھا۔ ایک عجیب سی خوشبو سامان سے آرہی تھی۔ حورعین کا دل چاہا کہ لباس کو چھو کر دیکھے اور اس من موہنی سی خوشبو کو محسوس کرے۔ مگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا۔

"مجھے نہیں چاہیے تمہاری منہ دکھائی۔"

"یہ میری طرف سے نہیں ہے۔ میری اماں نے بھیجا ہے یہ سب۔ ان کی خواہش ہے کہ ولیمہ پر جو کہ میرے گاؤں میں ہوگا' تم یہ لباس اور یہ ہی زیور پہنو۔"

حورعین نے دوبارہ اس لباس کو دیکھا۔

"یہ شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی۔ تمہارا شوہر تمہاری مرضی کا نہیں ہے۔ یہ لباس بھی مجھے تمہاری پسند کا نہیں لگ رہا۔ مگر ایک دفعہ اور ایک ناپسندیدہ چیز کو ٹرائی کرلو۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں گا کیونکہ اس سے میری اماں بہت خوش ہوں گی۔"

"اپنی اماں کی مرضی کے بغیر شادی کرتے ہوئے تمہیں خیال نہیں آیا اپنی اماں کی خوشی کا؟"

"کس نے کہا کہ یہ شادی میری اماں کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟" اس نے اطمینان سے حورعین سے پوچھا۔

"تو پھر تمہاری اماں اس شادی میں شامل کیوں نہیں تھیں؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"یہ بات تم کل ان سے ہی پوچھ لینا فی الحال ریسٹ کرنا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟" سچل نے سوٹ کیس بند کرکے ایک طرف رکھا۔

"یہ شادی تمہاری مرضی کے بغیر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔ کل ہمارا ولیمہ ہے۔ اس کے بعد تم فیصلہ کرسکتی ہو کہ آگے تمہیں کیا کرنا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟" پتا نہیں وہ سمجھ رہی تھی یا نہیں' لاتعلق سی بیٹھی رہی۔

"میں تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں کروں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ تم بیڈ پر ایزی ہو کر سو جاؤ۔ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔ اوکے؟" حورعین نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر چینج کرنے چلی گئی۔

سچل مسکرادیا۔

☆ ☆ ☆

آہٹ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ پہلے اسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ کہاں ہے پھر سچل کو سامنے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"بہت پیاری لگتی ہو سوتے ہوئے۔ کسی معصوم بچے کی طرح۔ میں تمہاری نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اینی وے۔ میں جاگنگ کرنے جارہا ہوں۔ تم سوجاؤ۔"

وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا۔ کہتے کہتے ہی اس نے موبائل اور ایک دو چیزیں اٹھائیں اور مسکراتا چلا گیا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر دوبارہ سوگئی۔

سات بجے اپنے مخصوص وقت پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھیں کھول کر لیٹے لیٹے اپنے اطراف میں دیکھا اور سب یاد آگیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے صوفے پر سچل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یقیناً" باتھ لے چکا تھا اور سفید شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔

"تم اندر کیسے آئے۔ دروازہ تو لاک تھا۔ میں نے خود لاک کیا تھا۔ تم نے کھولا کیسے؟" وہ کچھ حواس باختہ سی ہوگئی۔

"محترمہ! آپ اس وقت میرے کمرے میں ہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے میرے پاس میرے اپنے ہی کمرے کی چابی نہیں ہوگی؟ میں تو کافی دیر سے موجود ہوں یہاں۔"

حورعین نے افسوس سے سر جھکالیا۔ کیا ناپسندیدہ تبدیلی آئی تھی زندگی میں۔

"اور یہ تم۔ تم کیا ہوتا ہے؟ آپ جناب سے بات کرو۔ مجازی خدا ہوں تمہارا۔"

حورعین کے افسوس میں اضافہ ہوا تھا۔

"تیار ہو جاؤ' ہمیں ناشتے کے لیے جانا ہے۔ اور ہاں! مسز منزہ خورشید اگر کچھ پوچھیں۔ ہمارے بارے میں۔ آئی مین ہمارے ریلیشن کے بارے میں۔ تو سنبھل کر جواب دینا۔ سمجھیں؟"

"اب وہ کیا پوچھیں گی؟" وہ حیران ہوئی۔

سچل سمجھ گیا کہ اس کو سمجھانا مشکل تھا۔

"دیکھو۔ میری بات سنو۔ تمہیں جاننا ہے کہ تمہاری شادی مجھ سے کیوں ہوئی؟"

"ہاں جاننا ہے۔" وہ فوراً" بولی۔

"تو میری شرط ماننی ہوگی۔"

"کیسی شرط؟"

"پورے گھر کو یہ لگنا چاہیے کہ تمہارے اور میرے درمیان سب سیٹ ہے۔ سمجھ گئیں؟"

اب کی بار وہ سمجھ گئی تھی۔

"تو کیا وہ حیران نہیں ہوں گے کہ اتنی جلدی میں نے یہ سب کچھ کیسے قبول کرلیا؟ آپ کو کیسے قبول کرلیا؟ حورعین نے نکتہ اٹھایا۔

"یہ جتانا ہے نہ دکھاؤ کہ مجھے قبول کرلیا ہے۔ ہمارے درمیان سب ٹھیک ہے' یہ دکھاؤ۔"

"اچھا کوشش کروں گی۔" وہ لٹھ مار انداز میں کہہ کر آگے بڑھی۔ سچل نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس اپنی جانب موڑا۔

"کیسے کوشش کروگی؟" وہ غیر یقینی تھا۔

"کیسے کروں؟" وہ ہکلائی۔

سچل نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور اسے خود سے قریب کرکے اس پر جھکا۔ وہ ایک دم گھبرائی تھی مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ سچل قدرے تاخیر سے دروازے تک گیا۔ حورعین حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔

آنے والی منزہ تھی۔ ساتھ انعم بھی تھی۔ سچل سے ہیلو ہائے کرکے وہ حورعین کی طرف مڑی۔

"حورعین! تم فریش نہیں ہوئیں اب تک۔" منزہ نے سوال کے دوران ایک بھرپور نظر حورعین پر ڈالی تھی اور حورعین جس طرح گھبرائی تھی۔ منزہ بڑے مطمئن انداز میں مسکرائی۔

حورعین کے چہرے کی بے نیازی غائب ہو چکی تھی۔

"میں تم لوگوں کو ناشتے کا کہنے آئی تھی۔"

"آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔ ہم آ ہی رہے تھے۔" سچل بولا۔

"جلدی آنا۔" انعم زہریلی نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ کون تھی؟

تمام شہر اس کے حسن میں گم تھا
وہ کیا تھی؟
کہ پھر تو مستقل خزاں کا موسم تھا
وہ نیند تھی، خوشبو تھی، کیا تھی وہ؟
وہ کون تھی؟

سچل گلوکار کے ساتھ ساتھ گنگنانے لگا تھا۔
حورعین کنفیوز ہونے لگی تھی۔
"مجھے شاعری نہیں آتی۔ ورنہ سچ میں تمہارے لیے شعر لکھتا۔" حورعین نے سچل کی جانب دیکھا۔
کیا واقعی وہ اپنے جذبوں میں سچا تھا؟
جب وہ گلی میں داخل ہوئے تھے تو گلی میں بہت زیادہ ہلا گلا دکھائی دیا۔
پھولوں کے ہار لیے سچل کے دوست اور کافی زیادہ لڑکیاں اور عورتیں کھڑی تھیں۔ ان عورتوں میں سے ایک عورت نے آکر حورعین کی جانب سے دروازہ کھولا۔ سچل کار سے باہر نکلا۔ ہنستے، قہقہے لگاتے جوشیلے سے سچل کے دوست لپک کر اس کی طرف آئے۔ اسے ہار پہنائے۔ اس سے گلے ملے۔
"میری بیٹی آگئی۔" اس عورت نے حورعین کو گلے سے لگایا۔ حورعین عجیب سے احساس کا شکار ہوگئی۔ اس نے دیکھا سچل ماں سے مل کر آبدیدہ ہوگیا تھا۔ حورعین کو اس کی ساس خوبصورت سے سجے کمرے میں لے گئیں۔ سچل وہیں سے پلٹ کر اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔
سچل کی اماں نے کھانا لگایا۔
"نہیں آنٹی! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے انکار کردیا۔
"نہ پتر! کھانا دل کے چاہنے پر نہیں پیٹ کے چاہنے پر کھاتے ہیں۔ اب تو دوپہر بھی ڈھلنے لگی ہے۔ چل! میں تجھے کھلاؤں۔"
انہوں نے چمچہ بھر کر اس کے منہ کی جانب بڑھایا۔ حورعین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
حیات بی بی نے پیار سے اس کے آنسو صاف کیے تھے اور پھر چمچہ اس کی جانب بڑھایا وہ مسلسل ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل سچل جیسی تھیں۔
"یہ میرے ابا جی ہیں۔" کمرے میں ایک بوڑھا سا شخص داخل ہوا تو اماں نے تعارف کروایا۔
حورعین نے ابا جی کی طرف دیکھا۔ بڑھاپے کے باوجود بارعب شخصیت، لمبا چوڑا وجود، سفید رنگ کا تہبند، آف وہائٹ کرتا اور سفید پگڑی سر پر۔ اس نے ان کی آنکھوں کو دیکھا۔ ابا جی کی آنکھیں، سچل کی اماں کی آنکھیں اور سچل کی آنکھیں حیرت انگیز طور پر بے حد مشابہت رکھتی تھیں۔ اس نے احترام سے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔" انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بہو کی منہ دکھائی کے طور پر کچھ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے اور دعا دے کر واپس چلے گئے۔ حورعین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
شام ڈھلے وہ کمرے میں آیا تھا۔
"کیسی ہو حورعین!"
حورعین نے جواب نہ دیا۔ اپنی سونے کی چوڑیوں کو دیکھتی رہی۔
"یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں کہ کھانا کھایا یا نہیں؟ میری اماں بہت پیاری ہیں۔ بندے کو کھلا کر ہی چھوڑتی ہیں۔"
"آپ نے ایک وعدہ کیا تھا مجھ سے۔ یاد ہے؟"
سچل نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔
حورعین نے تیزی سے نظر چرائی اور پھر غصے سے اسے گھورا۔
"آپ بہت وعدہ خلاف ہیں۔"
"وہ تو میں نے ابھی کی ہی نہیں۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔ حورعین نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔
کچھ دیر ایسے ہی گزری۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ تو وہ پھر باہر چلا گیا۔
"پتر۔ سچل نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کچھ بتانے کا؟" اماں نے پیار سے پوچھا۔
"آپ کیسے جانتی ہیں؟" وہ حیران ہوئی۔
"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اماں جی میری ہر بات سے آگاہ ہیں۔" سچل نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔
"جی! انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔ بتائیں گے۔۔۔" وہ ہکلانے لگی۔
"تمہیں پتا ہے سچل خورشید کا کیا لگتا ہے؟"
حورعین نے ان کی جانب دیکھا۔
"سچل کا باپ ہے وہ۔" ابا جی بھی کمرے میں آگئے۔
"واٹ؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔
حسین احمد کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس پہاڑ جیسے مرد کی گردن بھی جھکی ہوئی تھی۔ سچل خلا میں گھور رہا تھا بے تاثر انداز میں۔

☼ ☼ ☼

سات سال بعد بھی حیات بی بی کا انتظار ختم نہ ہوا تھا۔ سچل چھ سال کا تھا۔ شرارت کرکے گھر آیا تھا۔ اسکول والوں کے بلانے پر حیات بی بی اگلے دن اسکول گئیں۔ اسکول والوں نے بہت شکایتیں لگائیں اس کی۔ وہ بہت دکھی ہو کر واپس آئی تھیں۔ آکر انہوں نے سچل کو مارنے کی کوشش کی مگر حسین احمد بیچ میں آگئے۔
"کیا فائدہ ہے میری زندگی کا۔ پہلے اس کا باپ اذیت دے کر گیا۔ اب یہ دے رہا ہے۔ اسی کی اولاد ہے یہ۔"
"حیات! ذرا ہوش میں رہ۔" حسین احمد گھبرائے۔
"کیا کرنا ہے، میں نے ہوش کا؟ خدا مجھے اٹھا ہی لے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔
"آپ بھی ابا کی طرح مرنا چاہتی ہیں؟" سچل جو شرمندہ سا کونے میں کھڑا تھا، قدرے دکھ سے بولا۔
"اس سے تو اچھا تھا مر ہی جاتا وہ۔ میں بیوہ تو کہلاتی۔ مجھے سکھ ملتا۔ اللہ کرے اس جیتے جاگتے کو کیڑے کھائیں۔"
"حیات!" خشمگیں نظروں سے بیٹی کو گھور کر حسین احمد سچل کو اٹھا کر باہر لے گئے۔
"کیوں شرارتیں کرتا ہے بے بدا ہے؟" اسے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر بازار کی گلیاں گھما رہے تھے۔ "ماں کو دکھی کرنا کتنا بڑا گناہ ہے جانتا نہیں ہے تو؟"
"نانا جی! میرے ابا کو جیتے جاگتے کیڑے کیسے کھا سکتے ہیں۔ کیا وہ جیتے جاگتے ہیں؟"
"پہلے ماں کو پریشان کیا، دکھ دیا۔ اس نے بے خیالی میں کچھ کہہ دیا تو اس کی بات پکڑلی۔ چل اب کوئی قلفی نہیں کھلانی میں نے تجھے۔ چل واپس۔" مگر ان کی یہ لفاظی کام نہ آئی۔ اس کی زبان پر یہ ہی ایک سوال تھا۔
"دیکھ سچل! اگر اب تو نے اپنی ماں سے اس بارے میں سوال کیا تو یاد رکھ! میں تجھ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ سمجھ گیا؟"
"کیوں نانا جی! کیوں نہ پوچھوں۔"
"اپنی ماں کو پھر دکھی کرے گا۔ جا میں اب ناراض ہوں۔" وہ خاموش ہوگیا مگر کبھی کبھی بازار میں گھومتے ہوئے یا ان کے ساتھ لیٹ کر کہانی سنتے ہوئے وہ اچانک سوال کردیتا۔
"نانا! کیا میرے ابا جیتے جاگتے ہیں جیسے اسلم اور خاور کے ابا جیتے جاگتے ہیں؟"
پھر یہ سوال مسلسل ہونے لگا۔ تنگ آکر حسین احمد نے کہہ دیا۔ "جب تو دس جماعت پاس کرے گا تب بتاؤں گا۔"
سچل شرارتیں کرنا بھول گیا۔ اب اسے دس پاس کرنی تھیں۔ حسین احمد جانتے تھے کہ یہ وقت آئے گا۔ انہوں نے ایک دفعہ اس کی ایک کاپی پر یہ جملہ لکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ "کیا میرے ابا جیتے جاگتے ہیں؟"
وہ لاشعور میں یہ ہی بات کہتا رہتا۔ یہ ہی بات سوچتا رہتا۔ نانا جی جن کو اب وہ ماں کی دیکھا دیکھی ابا جی کہنے لگا تھا۔ ان کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھنے جاتا تو اکثر سجدے میں یہ سوال اپنے اللہ سے بھی کر بیٹھتا۔
"یا اللہ! کیا میرے ابا جیتے جاگتے ہیں؟"
"ابا جی۔۔۔! آپ نے کہا تھا دس پاس کرلوں گا تو بتائیں گے۔" دس سال بعد اپنا سوال لیے پھر حاضر

تھا۔

"بڑا بے درد انسان ہے تو سچل حسین!" وہ دکھ سے بولے۔ "پتر کیا کرے گا جان کے۔ دل میں نفرتیں نہ پال۔ یہ تیرے سونے جیسے دن ہیں۔ پڑھ لکھ جا۔ اپنی ماں کا اللہ کے بعد واحد سہارا ہے تو۔ دل میں کھوٹ پال کر غلط راستے پر نہ نکل پڑ۔"

"آپ ہو نا اباجی! مجھے سنبھالنے کے لیے۔ غلط راستوں پر نہیں جاؤں گا مگر مجھے بتاؤ تو۔"

"نہیں۔۔۔ تو صابر نہیں ہے۔ برداشت نہیں کرسکے گا۔ غلط راستوں پر چل نکلے گا۔ حیات نے ایک جملہ کہہ کر مجھے پھنسا دیا ہے۔"

"آپ پر میں ابھی بھی اپنا صبر ثابت نہیں کرسکا اباجی!" وہ دکھ سے میٹرک کا رزلٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔

"نہ پتر!" وہ فوراً بولے۔ "ایسی بات نہیں۔ تو۔۔۔ تو میرا بڑا پیارا بیٹا ہے۔ پر دیکھ لے۔ دس سال پہلے تیری ماں کے ایک جملے نے تیرے اندر سوالوں کا ایک پہاڑ کھڑا کردیا۔ تیرا بچپن تجھ سے چھین لیا۔ اب کچھ حقیقتیں اگر میں بتا دوں تو تیرا یہ سنہرا وقت تیرے ہاتھ سے چلا جائے گا میرا بچہ! یہ وقت نہ برباد کر۔"

"تو مطلب نہیں بتائیں گے؟" وہ چاہے سولہ سال کا تھا، مگر تھا بچہ۔ حسین احمد نے اسے اپنے اندر بھینچ لیا۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"بتاؤں گا ضرور بتاؤں گا۔ تیرا صبر آزمانے کا وقت ختم نہیں ہوا۔ تو وعدہ کر۔۔۔ اچھی تعلیم حاصل کرے گا۔ اچھا انسان بنے گا۔ اپنا مقام بنائے گا۔ جس دن، جس لمحے مجھے لگا کہ بتانے کا وقت آگیا ہے، ضرور بتاؤں گا تجھے اور تیرا نانا اپنا وعدہ توڑے گا نہیں۔ بس۔۔۔ تو بھی وعدہ کر۔ اپنی زندگی کا ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کرے گا۔ تو نے اپنی ماں کو خوشیاں دینی ہیں۔ تیرے آگے ایک مقصد ہے۔ تو نے اسے پورا کرنا ہے۔"

اس کے بعد کبھی سچل نے یہ سوال نہیں کیا۔ وہ پڑھتا۔ دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا۔ ماں کے ساتھ رہتا۔ اباجی کے ساتھ بیلے پر جاکر مدد کرواتا۔ باتیں کرتا، مگر یہ سوال وہ نہیں کرتا۔

وہ بی کام کے دوسرے سال میں تھا جب اس کے نانا نے ایک دن اچانک کہا۔

"وے سچل۔۔۔ تیرا ابا جیتا جاگتا ہے۔" اس نے چونک کر دیکھا۔

"کدھر ہے؟"

"یہ ہمیں نہیں پتہ۔" انہوں نے سب بتا دیا۔

"میں ڈھونڈوں گا اسے۔" اس کی آنکھیں خون رنگ تھیں۔

"ہاں! خورشید زبیری کو تو ہی ڈھونڈے گا، پر دیکھ! اپنا وعدہ نہ توڑیں۔ تیرے پرچے ہونے والے ہیں۔ اپنی ماں کو بھنک نہ پڑنے دینا۔"

پھر سچل نے پیپر دیئے تھے، مگر۔۔۔ اس کے پاس کوئی تفصیل نہ تھی خورشید زبیری کے بارے میں۔

وہ صرف دو چیزیں جانتا تھا۔ ایک نام اور ایک یہ کہ وہ پینٹ شرٹ پہننے والا، گاڑیوں میں گھومنے والا انسان تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کا بی کام کا رزلٹ آگیا تھا۔ پھر اس نے ایم کام کرنا شروع کردیا۔ ساتھ ساتھ خورشید زبیری کی تلاش جاری رکھی۔ اس کا ایک دوست ایس ایچ او کا بیٹا تھا۔ اس نے دوست سے کہہ کر اس کے باپ سے بھی مدد لی۔ مگر فی الحال فائدہ نہ ہوا۔

یہ کام مشکل ضرور تھا، مگر ناممکن نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"سنا ہے مری میں بڑی برف باری ہو رہی ہے اس دفعہ۔ چلیں؟" یہ اس کا دوست خاور تھا۔ اس کے بچپن کا دوست۔۔۔ وہ صحافی تھا۔

"چھوڑ یار۔۔۔! پہلے اسلام آباد جاؤ پھر مری۔ رہنے دے۔" اس نے انکار کردیا۔

"تم بڑے بور ہوگئے قسم سے۔" خاور نے سست انداز میں انگڑائی لی۔

"تو اپنے دفتر میں بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ تیرے اخبار کا تو اللہ حافظ۔"

"او بھائی! میں سینئر صحافی ہوں۔ اب کیا۔۔۔؟"

دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ اندر۔" بے تکلف انداز میں خاور نے اندر آنے کو کہا۔ ایک دبلا پتلا، سوکھا سڑا سا لڑکا ٹائپ آدمی اندر داخل ہوا۔

"تم یقیناً" کوئی لڑائی جھگڑے یا قتل، موت کی خبر ڈھونڈ کر لائے ہوگے۔ چلو بھائی! بیٹھ جاؤ ادھر اور پھوٹنا شروع کردو۔"

"ادھر ایک لیدر فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ جانی نقصان نہیں ہوا۔"

"آج تو محفوظ خبر لائے ہو۔ کدھر ہے فیکٹری کس علاقے میں؟ اور کس کی ہے؟" خاور نے سوال جواب کر رہا تھا۔

سچل نے بور ہو کر اٹھنے کا سوچا، جب دبلے پتلے صحافی نے کہا "خورشید زبیری ہے نام فیکٹری کے مالک کا۔ یہاں نہیں رہتا۔ کبھی کبھی چکر لگا لیتا ہے۔"

اس سے آگے بھی اس نے کچھ کہا تھا، مگر سچل کی سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی تھی اور پھر اس نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ ایک دن ایک لمحے کی طرح گزر جاتا۔ اس کام میں پیسہ بھی کافی خرچ ہوا مگر سچل کا نانا۔۔۔ ایک خوشحال کسان تھا۔ اسے پیسے کی تنگی نہ ہوئی تھی۔۔۔ جس دن ڈی این اے کی رپورٹ اس کے ہاتھ میں آئی ۔ وہ اباجی کے پاس چلا گیا۔

"خورشید زبیری کو ڈھونڈ لیا ہے اباجی!"

حیات بی بی نے سنا تو صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ خورشید زبیری کے پاس جائے گا تو وہ اسے کبھی معاف نہیں کریں گی۔ مرتے دم تک اس کا چہرہ نہیں دیکھیں گی۔

سچل نے خورشید کو ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ سن کر جو ردعمل انہوں نے دکھایا۔ وہ بھی ایک الگ داستان تھی۔ چوبیس سال کے سچل نے اپنی ماں سے مار بھی کھائی تھی۔ اباجی نے اور اس نے مل کر حیات بی بی کو سنبھالا تھا۔ وہ اباجی سے بھی ناراض ہوگئی۔ اپنے آپ پر افسوس ہوا تھا اور سچل پر حیرت۔ چھ سال کی عمر سے اسے یہ بات کیسے یاد رہ گئی تھی، مگر سچل نے ماں سے اجازت لے کر ہی چھوڑی تھی۔

وہ خورشید کے پاس چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ سن رہی تھی لفظ بہ لفظ۔ دکھ کی ایک لمبی داستان۔ لوگ کس قدر ظالم ہوتے ہیں۔ انسان کس قدر بے رحم ہوتے ہیں۔

دنیا کی سب سے زہریلی مخلوق۔۔۔

جو کاٹتا بھی نہیں اور مار بھی ڈالتا ہے اور ایسا مارتا ہے کہ انسان مرتا بھی نہیں اور جیتا بھی نہیں۔ انسان کو زندہ لاش کون بنا دیتا ہے؟

ایک اور انسان۔۔۔

ایک عورت کی پوری زندگی۔۔۔ پوری جوانی ایک انسان نے اپنی ایک نفسانی خواہش کی نذر کردی۔

ایک گھر تباہ ہوگیا تھا۔

ایک ماں اپنی بیٹی کی بے بسی دیکھتے دیکھتے مرگئی۔

ایک باپ اب تک اپنی بیٹی کو تنہا دیکھ رہا تھا۔

ایک بیٹا۔۔۔ باپ ہونے کے باوجود یتیم کہلاتا رہا۔ اپنے ننھے ہاتھوں کو پھیلا پھیلا کر اللہ سے پوچھتا رہا۔ "کیا میرے ابا جیتے جاگتے ہیں؟"

اور وہ جیتا جاگتا انسان اطمینان سے اپنی زندگی گزارتا رہا۔

"کیا ماموں اتنے ظالم ہیں؟" اس نے سچل سے پوچھا۔

"اصل قصہ۔۔۔ ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں۔" سچل بولا تھا۔ حسین احمد اب خاموش ہوگئے تھے۔

"کچھ اور بھی ہے؟" اس کو اپنی آواز سنائی نہ دی۔

"آفتاب زبیری اور جمال زبیری کا ایکسیڈنٹ ہوا نہیں تھا، کروایا گیا تھا اور تمہارے ماموں نے کروایا تھا۔" سچل نے حورعین کے سر پر ایک آسمان توڑا تھا۔

"عظمیٰ زبیری مری نہیں تھیں۔ ماری گئی تھیں۔ انہیں کوئی بیماری نہ تھی۔ وہ صرف دکھ میں تھیں۔ انہیں سلو پوائزن دینا شروع کردیا گیا اور وہ دو سال میں

چل بسیں۔ یہ کام مسز منزہ خورشید نے کیا تھا۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو سچل۔" وہ چلائی تھی۔

"میرے پاس ثبوت ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر خورشید صاحب نے سب کچھ مانا ہے میرے سامنے۔ سنو!" سچل نے سب کچھ موبائل میں ریکارڈ کر لیا تھا۔ اس نے وہ ریکارڈنگ چلائی تھی۔

"سچل! تمہیں ہر حال میں اس لڑکی کو لائن پر لانا پڑے گا' میں نے اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔"

"کون سی دولت۔" سچل کی آواز میں لاپروائی نمایاں تھی۔

"آفتاب اور عظمیٰ کی دولت۔" خورشید کی آواز میں نشے کی زیادتی کی واضح موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ "تایا اور ڈیڈ نے میرے ساتھ کیا مذاق کیا؟ آفتاب سکسٹی سکس لے اور میں۔۔۔ صرف تھرٹی فور پرسنٹ؟ کیا مذاق ہے؟ وہ لفنگا۔۔۔ ساری دولت عورتوں پر نچھاور کر دے اور پھر بھی وہی باس رہے۔ مار دیا باسٹرڈ کو۔ اس کو بھی۔۔۔ اس کے باپ کو بھی اور کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔۔۔ عظمیٰ۔۔۔ یہ بہن بیٹیاں کس قدر خود غرض ہوتی ہیں۔ عظمیٰ کو کبھی اعتراض نہ ہوا کہ ایک ایسا آدمی جو اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ چھیاسٹھ فیصد لے اور اس کا اپنا بھائی چونتیس فیصد لے۔ وہ اگر اپنا حصہ مجھے دے دیتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ تم بتاؤ۔ میں کیسے برداشت کرتا۔۔۔ وہ مجھ سے کم تر تھا۔ عمر میں' تجربے میں' اوقات میں۔۔۔ ہر چیز میں۔۔۔ میں نے منزہ کے ہاتھوں۔۔۔ عظمیٰ کو مروا دیا۔ سلو پوائزن۔۔۔ وہ مر گئی۔۔۔ اب حور عین رہ گئی ہے' اب تم۔۔۔ تم مجھے وہ دولت اس سے چھین کر دو گے پھر چاہے تم بھی مرو۔ وہ بھی مرے۔۔۔" سچل نے فون بند کر دیا۔

حور عین کے آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نو وارد کھڑا ہو کر بس اسے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ خورشید کا موڈ خراب ہونا شروع ہو گیا۔ کیا وہ دیہاتی کی وجہ سے اپنی فیملی میں سے اٹھ کر آیا تھا؟ اور وہ دیہاتی بس آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر آخر اس دیہاتی نے اپنی پھیلی ہوئی آنکھیں سکیڑیں اور مسکرا دیا۔

"او۔۔۔ جی۔۔۔ میں نے کہا سلاما لیکم!"

"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔" خورشید نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"گارڈ! اس آدمی کو جو بھی کہنا ہے اس سے پوچھ لو اور جو مسئلہ ہے حل کر کے اس کو چلتا کرو۔" اب کی بار خورشید گارڈ سے بولا۔

"میرا نام سچل حسین ہے اور مجھے جو مسئلہ ہے وہ آپ خود ہی سن لیں تو بہت فائدے میں رہیں گے۔ سنا ہے بڑے احتیاط پسند ہیں۔ اب کی بار بھی احتیاط کر لیں۔" خورشید سخت غصے اور ناگواری سے پلٹا۔

"تم کون ہو اور تمہاری اتنی جرات۔۔۔" اس نے اپنی رہی سہی توانائی خرچ کر کے اپنا لہجہ بارعب بنانے کی کوشش کی۔

"جرات تو میں اور بھی کر سکتا ہوں بزرگو۔ پھر بعد میں کچھ نہ کہنا۔" وہ قدرے قریب آیا۔ "میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ جاؤ تمہاری وجہ سے مجھے جو نقصان ہو سکتا ہے وہ کر کے دکھاؤ۔ گارڈ۔۔۔" اس نے گارڈ کو آواز دی۔ وہ پہلے ہی چوکنا تھا فوراً" آگیا۔

"واپس اپنی جگہ پر چلے جاؤ۔ اگر اپنی نوکری اور جان پیاری ہے تو۔" پھر وہ خورشید کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میرے والد تمہیں نوکری سے نکال سکتے ہیں اگر مجھ سے بدتمیزی کی تو۔۔۔ ہیں نا والد صاحب؟"

"کیا بکواس ہے یہ؟"

"آپ کا نکاح نامہ دکھاؤں؟ مگر پھر ایسا نہ ہو کہ آپ کا گارڈ بھی رازدار بن جائے آپ کا۔ پھر مجھے کچھ نہ کہنا کہ ایک گارڈ کے سامنے میں نے آپ کا پردہ نہیں رکھا۔ اندر چل کر بات کریں؟"

خورشید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی بلیک میلر ہے یا پھر۔۔۔ کسی ایسی کوٹھے والی کا بیٹا کہ جس کے پاس وہ جاتا رہا تھا۔ کہ جوانی میں یہ کام خوب کیے تھے۔ اور اب۔۔۔ وہ اس سے لمبی رقم اینٹھنا چاہتی تھی۔ خورشید نے سوچ لیا کہ اس لڑکے کو پولیس سے چھینٹی لگوائے گا۔

"کون سا نکاح نامہ؟" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خورشید نے پوچھا تھا۔

"حیات بی بی اور خورشید زبیری کا نکاح نامہ۔۔۔ آپ کیوں بھول گئے تھے کہ نکاح نامے کی ایک کاپی نہیں ہوتی۔ تین کاپیاں ہوتی ہیں۔ دوسری غلطی آپ نے یہ کر دی کہ نکاح کے وقت تصویریں بھی بنوالی تھیں آپ نے۔۔۔ تو بزرگو۔۔۔ میں سچل حسین ولد خورشید زبیری ہوں اور آپ کا نکاح نامہ اور وہ تصویریں میرے پاس موجود ہیں۔"

خورشید بھونچکا سا کھڑا تھا۔ اس نے حیرت اور غور سے اس اجنبی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں۔۔۔ اپنی زندگی کا ایک بہت روشن باب وہ بھول چکا تھا۔ اسے لگا۔ وہ پچیس سال پیچھے چلا گیا ہو۔ وہ۔۔۔ وہی آنکھیں تھیں۔ سچل کی آنکھیں۔۔۔ وہ خوب صورتی۔ وہی تیکھا پن۔

"اس نقلی تصویر اور جعلی نکاح نامے سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم؟"

سچل قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "یہ تصویر نقلی ہوتی تو کیا میں اس شاندار گھر کے اس شاندار ڈرائنگ روم میں موجود ہوتا؟ بزرگو۔۔۔ مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ میں آپ کی اولاد ہوں۔"

"خبردار۔۔۔" خورشید دھیمے لہجے میں پھنکارا۔

"خبردار! جو تم نے دوبارہ یہ لفظ دہرایا۔۔۔ کیا ثبوت ہے یہ تصویر۔۔۔؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اپنی چھوٹی امی سے مل کر آتا ہوں۔ ان کو ثبوت کے طور پر نکاح نامے کی فوٹو کاپی بھی دکھاؤں گا۔"

"بیٹھو فوراً"۔۔۔ بیٹھو ادھر۔" خورشید دوبارہ پھنکارا۔ "تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب دکھا کر تم یقین دلا دو گے؟ یہ کام آج کے دور میں مشکل نہیں ہیں یہ نقلی تصویریں۔۔۔ یہ سب۔"

"اوہ نہیں والد صاحب! میرے پاس تو اور بھی ثبوت ہیں۔" خورشید جس کا پارہ "والد" لفظ پر چڑھا تھا۔ ایک نئی بات پر دھیان بدل گیا۔

"کیسا ثبوت؟"

"ڈی این اے ٹیسٹ کروالیں اگر شک ہے تو۔۔۔؟ میں نے تو کروا لیے ہیں۔ بغیر ثبوت کے کوئی بات نہیں کرتا میں۔"

"اچھا۔۔۔؟ میرے ڈی این اے ٹیسٹ بھی ہو گئے ہیں اور مجھے پتا بھی نہیں۔ کیا میری تصویر سے تم نے یہ کام لیا ہے؟" خورشید نے طنز کیا۔

"آپ کو شک ہے تو پھر کروا لیتے ہیں' لیکن پھر۔۔۔ یہ رپورٹ اور لوگ بھی دیکھیں گے۔"

"کیسے کروائے تم نے ڈی این اے ٹیسٹ؟" خورشید ڈپٹ کر بولا۔

"آپ کے بال لے کر۔" سچل مزے سے بولا۔

"میرے بال کہاں سے لیے تم نے؟" خورشید کی آواز جیسے پاتال میں سے آئی تھی۔ سچل مزید پھیل کر بیٹھا۔

"اب آیا ہوں تو۔۔۔ سب سے مل کر جاؤں گا۔ خاص طور پر اپنے سوتیلے ماموؤں سے۔ سنا ہے بڑا تگڑا سسرال ہے آپ کا۔ سالوں سے ذرا دبتے ہو آپ اور سنا تو میں نے یہ بھی ہے کہ آپ کی بیوی بہت شکی مزاج ہے اور بات بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔"

"کیا چاہتے ہو؟" خورشید تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

"اپنے دفتر میں ایک بہترین نوکری دے دیں۔ اور اپنے گھر میں میرے رہنے کا انتظام کر دیں۔"

"اگر نہ کروں تو؟" خورشید نے اسے بغور دیکھا۔

"میں تو معصوم بندہ ہوں جناب۔۔۔ آپ کی بیوی ہی ہنگامہ کرے گی۔"

"دھمکی دے رہے ہو؟" خورشید چوٹ کھائے سانپ کی طرح ہو گیا۔

"میری توبہ جی!" سچل نے کان پکڑ لیے۔

☆ ☆ ☆

"کیا تم ساری رات ایسے ہی بیٹھے رہو گے خورشید؟" خورشید کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔

"خاموش رہو۔ آئی ایم اپ سیٹ۔" وہ برہمی سے بولا تھا۔ "اگر اس لڑکے نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دوں گا یہ اور اس کا خاندان۔ جانتا نہیں ہے مجھے۔ میں خورشید ہوں۔ خورشید زبیری۔"

"کچھ نہیں ہو گا خورشید۔ سو جاؤ۔" وہ ہر حال میں سونا چاہتی تھی۔

"تم نہیں جانتیں اس لڑکے کو منزہ! تم نہیں جانتیں ...وہ شیطان کی اولاد ہے۔" وہ بے دھیانی میں بول گیا۔

"ہاں! مگر شیطان نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولی اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چارپائی پر تکیوں سے ٹیک لگائے۔ وہ خلا میں گھور رہی تھی۔ نہ کچھ سوچ پا رہی تھی۔ نہ کچھ بول پا رہی تھی۔

اماں اس کے لیے ناشتا لائیں۔

حورعین نے دیکھا اس کا ناشتا وہ نہ تھا جو سچل اور حسین احمد کر رہے تھے۔ پراٹھے، آملیٹ، اچار اور گرم گرم دودھ پتی۔ حورعین کے سامنے وہ تھا جو وہ ہمیشہ سے کھانے کی عادی تھی۔

"سب سوچیں جھٹک کر پہلے ناشتا کرو حورعین۔" سچل نے پیار سے کہا تو اس نے تھوڑا بہت ناشتا کر لیا۔

پھر حسین احمد کے کہنے پر سچل اسے باہر لے گیا۔

"میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں حورعین۔ ہم ایک ہی انسان کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بنے لوگ ہیں، مگر میں بہت خوش قسمت ہوں میرے ساتھ میرے اپنے تھے۔ تمہارے ساتھ کوئی نہیں تھا۔"

حورعین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"یہ پیسہ اتنا منحوس ہے۔ اتنے لوگوں کی جان لے گیا۔ کچھ کو زندہ مار گیا۔" وہ اتنی آہستہ آواز میں بولی کہ وہ بمشکل سن سکا۔

"پیسہ نہیں...یہ ہوس منحوس ہے۔ جو اس انسان کے اندر ہمیشہ سے تھی۔ میری ماں کے پاس "دولت نہ تھی پھر یہ میری ماں کے پاس کیوں آیا؟"

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کو آپ کی ماں سے پیار ہو گیا ہو۔ مگر منزہ ممانی کا بہت زیادہ مضبوط بیک گراؤنڈ اور دولت نے ان کو زیادہ متاثر کیا۔ آپ کچھ بھی کہیں۔ لالچ دولت کا ہی ہے۔ وہ دولت جو میرے ماں، باپ کو کھا گئی۔ آپ کی اماں جی کی زندگی اور خوشیاں کھا گئی۔" وہ رو رہی تھی۔

سچل کا موبائل بجا تھا۔ اس نے گاڑی ایک جانب روکی۔

"خورشید ہے۔" اس نے حورعین کو بتایا۔

"مت سنیں فون۔"

"نہیں جان! سننا تو پڑے گا۔" اس نے یس کر کے ہیلو کہا۔

"کیسے ہو سچل! ولیمہ کیسا گزرا؟" گزشتہ رات کے اندیشوں کا شائبہ تک نہ تھا اس کے لہجے میں۔

"بہت اچھا۔ عائشہ کا ولیمہ کیسا ہوا؟"

"اس کا بھی بہت اچھا۔ تو تم آ رہے ہو نا آج واپس۔"

"ابھی تو مہمان داری کافی ہے گھر میں۔ حورعین سے پوچھتا ہوں۔ پھر بتاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ دن اور یہاں رہنا چاہے۔"

"وہ خوش ہے کیا؟" خورشید نے توقف سے کہا۔

"لگ تو رہی ہے۔"

"تمہارے ساتھ رویہ کیسا ہے اس کا؟"

"پہلے سے کافی بہتر اچھا۔"

"میری بات کرواؤ اس سے۔"

"نہیں کروا سکتا۔ میں دوستوں کے ساتھ باہر ہوں۔ وہ گھر پر ہے۔" سچل نے انکار کر دیا۔

"اوکے لیکن سچل کل تمہیں ہر حال میں یہاں موجود ہونا چاہیے... سمجھے تم؟"

"جی سمجھ گیا۔"

"حورعین کو بتانا میرے فون کا۔"

"ٹھیک ہے خدا حافظ۔" اس نے فون بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں جاؤں گی واپس۔" وہ پھر رونے لگی۔

"میں اب ان دونوں میاں بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں پولیس کے پاس جاؤں گی۔ ان کو سب بتانا چاہتی ہوں۔" حورعین نے بچوں والی بات کی تھی۔

"اس سے کیا ہو گا؟" پھر وہ توقف سے بولا۔ "میں خود سمجھ نہیں پا رہا حورعین! کہ کیا کروں۔ یہ مقصد تو نہیں تھا میرا۔"

"پھر کیا مقصد تھا آپ کا؟" اس نے سچل کی جانب دیکھا۔

"میرا دل نہیں چاہتا کہ میں ان کی حقیقت منزہ کو بتاؤں۔ وہ صابر عورت نہیں ہے۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے ماں باپ کو بتا دے گی۔"

"تو بتانے دیں۔"

"میری تین بہنیں ہیں حورعین! میں ان کا مستقبل خراب نہیں کرنا چاہتا۔ منزہ پروا نہیں کرے گی۔ وہ خورشید کو تباہ کرنے کے چکر میں انہیں رسوا کر دے گی۔ اگر عائشہ کے سسرال کو پتا لگے کہ اس کے باپ نے ایک شادی کی تھی۔ اس کی بیوی اور بیٹا موجود ہے۔ اور اس نے بیوی کے ساتھ کیا کیا۔ اور بیٹا میں ہوں تو پھر ان کا رویہ عائشہ کے ساتھ کیسا ہو جائے گا؟"

حورعین خاموش ہو گئی۔

"عمینہ اور انعم کے رشتوں کے لیے کتنا مسئلہ ہو جائے گا۔"

"تو پھر...؟" تھوڑی دیر بعد آہستگی سے بولی۔

"خورشید کی سزا یہ بھی ہے کہ تم اپنے حصے کی جائیداد کسی ٹرسٹ کو دے دو۔ جس دولت کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا۔ وہ اسے نہیں ملنی چاہیے۔"

"ٹرسٹ کو کیوں؟ اپنے پاس کیوں نہ رکھوں؟" اس نے غور سے سچل کو دیکھا۔

"نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا اس دولت کے ساتھ کوئی تعلق رہے۔ وہ دولت خورشید کے پاس رہ چکی ہے وہ دولت ناپاک ہے۔ اس دولت کی خاطر قتل ہو گئے۔ میرے پاس زمین ہے۔ جانور ہیں۔ ہر آسائش نہ سہی مگر ایک اچھی خوشیوں بھری زندگی میں اپنی بیوی بچوں کو دے سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ دولت اپنے پاس نہ رکھو۔"

"تو پھر۔ خود غرضی دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ماموں ہی لے لیں۔"

سچل نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ وہ دولت ہے جو میرے باپ، دادا اور ماں کو کھا گئی۔ آپ کی اور اماں کی خوشیوں کو کھا گئی۔ اب... ماموں کی باری ہے۔

اگر ہم انسان کسی انسان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں تو کیا کر سکتے ہیں۔ کسی کو ایک بزنس اسٹیبلش کر کے دے دیں۔ تو کیا ہو گا؟ جب تک اللہ نہ چاہے گا۔ اسے فائدہ نہ دے سکے گا اور اگر ایک انسان کسی دوسرے انسان کا سب کچھ چھین لے مگر اللہ اس انسان کا نقصان نہ چاہے اور اس ایک دروازے کے جواب میں، جو ایک انسان بند کر گیا اللہ سو دروازے کھول دے تو...

انسان کا کسی انسان کے ساتھ بھلا کرنا۔ بدلہ لینا... کیا ہے؟ کس حد تک ہے؟

میں نے خورشید زبیری کو معاف نہیں کیا۔ روز محشر میں جواب مانگوں گی۔ تب اللہ اس کو سزا دے گا۔ اور وہ سزا اس سزا سے بہت زیادہ ہو گی جو میں دوں گی۔"

☼ ☼ ☼

خورشید کا موڈ سخت خراب تھا۔ سچل اور حورعین واپس نہ آ رہے تھے۔

اس نے وہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جو اس نے سوچ رکھا تھا۔ صرف آج رات تک کی مہلت تھی سچل کے پاس۔

اور حیران کن بات ہوئی۔ رات کو سچل کا فون آگیا۔ اس نے ایسی خبر سنائی کہ خورشید پر شادیٔ مرگ کی کیفیت ہوگئی۔ پھر اس نے بہت جلدی کاغذات تیار کروائے۔

حورعین نے ایک پیسہ بھی اپنے شوہر کو دینے کے بجائے سب کچھ اپنے ماموں کے نام کر دیا تھا خورشید کو لگا اٹھارہ سال سے کی جانے والی محنت رنگ لے آئی۔

☼ ☼ ☼

حورعین گھر پر تھی۔ اپنا سامان اٹھا رہی تھی۔ اپنے ماں باپ کی تصویر اور کچھ چھوٹی چیزیں۔ سچل آفس میں تھا۔

"سچل — تم نے کیا کیا جو وہ اس طرح مان گئی۔" خورشید خوشی کے مارے ٹھیک سے بول بھی نہ پا رہا تھا۔

"آپ ابھی سچل حسین کو جانتے نہیں ہیں؟"

"مگر مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے حورعین کو صرف میرے لیے کیوں راضی کیا۔"

"میں اپنی بیوی سے اس کا پیسہ کیوں لیتا؟ میری ڈیل آپ کے ساتھ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس میں میری محنت شامل ہے۔ میں صرف یہ تینتیس فیصد ڈیزرو کرتا ہوں جو آپ دیں گے۔ اپنی بیوی سے کچھ نہیں۔"

"وہ سب تو مذاق تھا۔ کوئی دستخط کیا ہوا معاہدہ تو نہیں۔ تم میرے مذاق کو سچ سمجھ بیٹھے سچل؟"

سچل نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ خورشید حیران ہوا۔ اسے سچل سے ایسے ردعمل کی توقع نہ تھی۔

"دیکھو سچل تم یہاں ایک اچھے عہدے پر کام کرتے رہو۔ میں تمہیں نکالوں گا نہیں۔"

"آپ نکال بھی نہیں سکتے۔ خیر یہ لیں — آپ کا اور حیات بی بی کا نکاح نامہ۔ اور یہ تصویریں۔ دیکھ لیں، اصل ہے فوٹو کاپی نہیں۔" اس نے خورشید کے سامنے کیں اور پھر انہیں پھاڑ دیا۔

خورشید شدید حیران ہوا تھا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ میری بیوی۔ اور آپ کی بھانجی۔ وہ سرپھری عورت ہے۔ اس نے شور مچایا ہوا ہے کہ اب اسے گاؤں میں ہی رہنا ہے۔ لہٰذا اب میں شہر میں نہیں رہ سکتا۔ تو اب مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔

گاڑی جو آپ نے مجھے دی۔ یہیں گیراج میں ہے۔ یہ اس کی چابیاں۔" اس نے چابیاں میز پر رکھیں۔ اپنا موبائل بھی میز پر رکھا۔

"خدا حافظ بزرگو۔ میں نے آپ کو تھوڑا تنگ کیا۔ تنگ کیا مگر آپ کو فائدہ بھی کافی بڑا ہوا۔ گڈ بائے۔"

خورشید کچھ بول نہ پایا اور سچل اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسے یاد آیا۔ آج سے ایک سال پہلے آج ہی کی تاریخ میں ایک دیہاتی اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس کو نکاح نامے کی فوٹو کاپی اور دو تصویریں دکھائی تھیں۔ خود کو اس کا بیٹا کہا تھا۔

اس کو بلیک میل کیا مگر کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اور اب بہت خاموشی سے وہ اس کی بھانجی کو بھی لے گیا۔ جس کو دیکھ کر۔ خورشید کو فوراً ہی اپنے گناہ یاد آ جاتے تھے۔ افسوس نہ ہوتا تھا مگر وہ سب بھول جانا چاہتا تھا۔

یقین تو نہ آ رہا تھا مگر سچ یہ ہی تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

☼ ☼ ☼

عمینہ نے عائشہ اور انعم کو اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ پہنچ گئیں۔ خورشید کو بہت سیریس ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے خون میں ایچ آئی وی پوزیٹو کے جراثیم ہونے کا انکشاف ہوا تھا۔

خورشید کو یہ جان کر بہت — خوشی محسوس ہوئی — وہ جانتا تھا کہ یہ جراثیم اب نہیں پھیلنے شروع ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ منزہ میں بھی یہ بیماری منتقل ہو گئی ہوگی۔ اس نے منزہ کو یہ

بات بتانے سے سب کو منع کر دیا تھا۔ کہا کہ وہ اپنی بیوی کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔

یہ کچھ دن بعد کی بات تھی۔ سچل، حورعین اور ان کا دو مہینے کا بچہ خورشید سے ملنے آئے تھے۔ انہیں عائشہ نے خورشید کے بیمار ہونے کی اطلاع دی تھی۔

حورعین نے سادہ مگر بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا اور ایک بڑی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ گود میں بیٹا تھا۔ اس کی خوبصورتی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

سچل اور حورعین اپنے بیٹے سمیت اکٹھے خورشید کے قریب پہنچے۔ خورشید ان کی جانب دیکھ بھی نہ پایا تھا۔ نہ سلام کا جواب دیا تھا۔

"میں نہیں پوچھوں گا کہ اتنی بڑی بیماری کیسے لگوالی۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ جلدی سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں۔ آپ کی حالت دیکھ کر تو آپ سے نفرت بھی نہیں کی جاتی۔"

سچل نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔

خورشید نے بمشکل باری باری دونوں کو دیکھا تھا۔

"یہ بچہ۔"

"میرا بیٹا ہے عبداللہ۔ اللہ کی نعمت۔ اللہ کا تحفہ۔"

خورشید نے پھر آنکھیں موند لیں۔

حورعین خاموشی سے خورشید کو دیکھ رہی تھی۔

"حورعین! کیا تم سچ جانتی ہو؟" خورشید آنکھیں موندے موندے بولا۔

"جی ہاں! سب جانتی ہوں۔ آپ قاتل ہیں میرے ماں باپ کے۔" وہ شکستہ آواز اور سادہ لہجے میں بولی۔

"تم نے مجھے معاف تو نہیں کیا نا؟"

"نہیں۔" وہ قدرے برہمی سے بولی۔

"مت کرنا۔ ورنہ میری موت آسان ہو جائے گی۔ مجھے سزا ملنے دو۔"

"بیمار ہوتے ہی آپ کو احساس ہو گیا؟ کیا موت سے ڈر لگنے لگا ہے ماموں؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"یہ بیماری بہت چھوٹی ہے۔ حور! ہاں تمہاری ماں تمہیں حور کہتی تھی۔ جسے میں نے زہر دے کر مار دیا۔

اپنی چھوٹی بہن کو۔ میری چھوٹی بہن۔ میں نے حیات کو چھوڑ دیا۔ میں نے منزہ سے شادی کی۔ میں نے دوست کو مار ڈالا۔ تایا کو مار ڈالا — دولت کے لیے۔ جانتے ہو! میں ایک نارمل انسان ہوں۔ باپ بننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ پھر بھی میری بیوی کہتی ہے کہ میری تینوں بیٹیاں میری نہیں ہیں۔ وہ تینوں مظاہر محمود کی بیٹیاں ہیں۔ میرے سب سے بڑے کاروباری حریف کی بیٹیاں — ہاہاہا —" خورشید قہقہے لگانے لگا۔

"سچل چلیں یہاں سے۔" حورعین کو بے طرح گھن آئی۔ سچل حورعین سے بھی پہلے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسپتال کے کمرا نمبر آٹھ میں خورشید زبیری کے پاگل قہقہے گونج رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں دم بخود کھڑی تھیں۔

☼

محبت کا ستارہ

یاسمین حنفی

"شبانہ جاؤ! رضوانہ کو دیکھو' تیار ہوئی یا نہیں؟" رضیہ بیگم نے کچن میں کام کرتی بیٹی سے کہا۔

"دیکھتی ہو اماں۔۔۔ بس ذرا بریانی دم پہ لگا دوں؟" شبانہ نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

"آپی آئیں گی یا نہیں؟" اس نے کچن سے باہر آتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

"نہیں آج نہیں بلایا۔ میں نے سوچا ابھی تو صرف دیکھنے آ رہے ہیں۔ جب رشتہ طے ہو جائے گا تو رسم میں بلا لوں گی۔" رضیہ بیگم نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اچھا کیا آپ نے۔ روز' روز انہیں تنگ کرنا بھی اچھا نہیں۔ میں اٹھاتی ہوں رضوانہ کو۔" شبانہ نے رضوانہ کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جاؤ! دیکھو اسے' مزاج ہی نہیں ملتے صاحبزادی کے تو تم ذرا بانو سے پوچھو کب تک آئیں گے وہ لوگ۔" رضیہ بیگم نے کہا۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ وہ لوگ آنے والے ہی ہوں گے۔" اس نے رضوانہ کو یوں ہی لاپروائی سے لیٹے دیکھ کر کہا۔

"کیوں آ رہے ہیں وہ لوگ؟ جب میں نے کہا بھی ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی؟" رضوانہ نے کروٹ بدل کر اسے گھورا۔

"فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ چلو اٹھ جاؤ' اماں' بانو خالہ کو فون کر رہی ہیں۔ تم نہیں اٹھیں تو سیدھی یہیں آ جائیں گی۔ پھر پتا ہے نا کیا ہو گا۔" شبانہ نے اس کی بات ان سنی کر کے اسے اماں کا ڈراوا دیا۔

رضوانہ کو ناچار اٹھنا پڑا۔

عصر کے بعد لڑکے والے آ گئے۔ آنے والوں میں لڑکے کی ماں' بہن اور پھوپھی تھیں۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنے والے تھے۔ لڑکے کی ایک ہی بہن تھی' جس کی شادی طے تھی۔ لڑکے کی ماں چاہتی تھی کہ بیٹی رخصت کرنے سے پہلے بہو لے آئیں۔

"لیجیے نا بہن! آپ تو بہت تکلف کر رہی ہیں؟" رضیہ بیگم نے لڑکے کی ماں سے کہا۔

"بس بہن! بہت لے چکے۔ آپ نے تو اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا۔ شرمندہ کر دیا۔ ہمیں اب آپ ہماری بیٹی کو بلوا دیں بس۔"

"جی جی بلواتی ہوں۔" رضیہ بیگم نے شبانہ کو اشارہ کیا۔ شبانہ خوشی خوشی بہن کو بلانے چل دی۔ تھوڑی دیر بعد ناراض ناراض چہرہ لیے رضوانہ آ گئی۔ لڑکے کی والدہ بے اختیار مسکرا دیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ بہت پیاری ہے ہماری بیٹی۔" انہوں نے رضوانہ کو پاس بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ جواباً" رضوانہ نے دانت پیستے ہوئے سر جھکا لیا' جسے انہوں نے اس کی شرماہٹ پر محمول کیا۔ بمشکل تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی' تو پھر آپ کیوں یہ سب کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟ شادی نہیں کرو گی تو کیا کرو گی؟ پڑھائی پوری ہو چکی ہے تمہاری' نوکری کروانی نہیں۔۔۔ تو؟" رضیہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے کہا' پر اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔

"امی! میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ ابھی تو میری پڑھائی کمپلیٹ ہوئی ہے۔ میں آپ کے اور بابا کے ساتھ گھر میں سکون سے رہنا چاہتی ہوں؟" رضوانہ نے جھنجلا کر کہا۔

"ابھی صرف تمہاری رسم کر رہے ہیں۔ منگنی اور شادی ہونے تک ایک ڈیڑھ سال لگ ہی جائے گا۔ تب تک تم ہمارے ساتھ رہنے کے اپنے سارے ارمان پورے کر لینا۔" رضیہ بیگم نے اس کی بات کو چنداں اہمیت نہ دی۔

"بہت اچھے لوگ ہیں۔ سلجھے ہوئے' شریف' کھاتے پیتے اور کیا چاہیے تمہیں۔ خاقان بھی کہہ رہا تھا کہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اس نے معلومات کروائی ہیں کچھ۔۔۔" ان کی بات پر رضوانہ غصے سے پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم کب اپنے گھر والوں سے بات کرو گے۔ امی صبح شام میری شادی کی فکر میں ہیں۔" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"میں کیا کروں! امی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔" دوسری طرف بھی مجبوری تھی۔

"تو میں امی کو کیسے روکوں۔" رضوانہ نے عدیل سے پوچھا۔

"یار! تم کچھ دن اپنے گھر والوں کو سنبھال لو۔ میں امی سے بات کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گی۔" اس کا دامن تھمایا گیا۔

"سنو کیا ہم کورٹ میرج کر لیں؟" راہ نکالی گئی۔

"تم یہاں تک سوچ سکتی ہو؟" دوسری طرف حیرانی تھی۔

"کیوں؟ کیا لوگ کرتے نہیں ایسا۔ ہم کرلیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

"مگر میں ایسا کرنا تو دور کی بات' سوچنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ میرے گھر میں میری بہن بھی ہے۔ اور میں تمہاری بھی بہت عزت کرتا ہوں۔" اس کے بعد ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں نے کہہ دیا' مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی۔ میں۔۔۔ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔" رضوانہ نے بالآخر بول دیا۔

"کیا بکواس کررہی ہو رضوانہ۔۔۔ ہوش میں تو ہو۔" رضیہ بیگم ایک دم بھڑک اٹھیں۔

"میں نے آپ کو بتادیا ہے۔ کچھ دن انتظار کرلیں۔ وہ اپنے والدین کو بھیج رہا ہے۔"

"دماغ ٹھکانے رکھو اپنا رضوانہ! دو دن بعد رسم کرنے آرہے ہیں وہ لوگ۔۔۔ کیا جواب دوں گی میں انہیں۔"

"صاف بتادیں۔۔۔ اگر آپ نہیں کہہ سکتی ہیں تو میں کہہ دوں گی۔" وہ سرکشی سے کہتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رضیہ بیگم نے سر پکڑلیا۔

☼ ☼ ☼

"عدیل! مجھ سے اب بحث مت کرنا۔ میں نے تمہارا رشتہ طے کردیا ہے' پرسوں جارہے ہیں ہم منگنی کرنے۔" سلطانہ بیگم نے عدیل کی باتوں پہ زچ ہوکر اپنا فیصلہ سنادیا۔

"امی! آپ ایسا کیسے کرسکتی ہیں؟ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔ آپ ایک بار اس سے مل تو لیتیں؟" عدیل نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"میں نے کچھ سوچ کے ہی تمہارے لیے اس لڑکی کو پسند کیا ہے۔ دیکھو گے تو باہر ملنے والی ان لڑکیوں کو بھول جاؤ گے۔ ہمارے گھر کو ایک گھریلو لڑکی کی ضرورت ہے۔" سلطانہ بیگم نے اپنی توجہ دوسری طرف کرلی اور عدیل اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"اسی دن کے لیے لوگ روتے ہیں کہ بیٹیاں پیدا نہ ہوں۔ ایسی بیٹیوں کو تو پیدا ہوتے ہی ماردینا چاہیے۔" رضیہ بیگم نے روتے ہوئے بانو بیگم سے کہا۔

"آپا! اگر لڑکی راضی نہیں تھی تو پہلے بتادیتیں نا' اب تو وہ کل آرہے ہیں رسم کرنے۔" بانو بیگم نے فکرمندی سے کہا۔

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں بانو! وہ تو اینٹھے بیٹھی ہے۔" رضیہ بیگم نے نفرت سے رضوانہ کا ذکر کیا۔

"کرتی ہوں بات لڑکے والوں سے۔ ہائے! سلطانہ بیگم تو مجھے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر کردیں گی۔" بانو بیگم نے متوقع صورت حال سوچتے ہوئے کہا۔

"کوئی بہانہ کردینا بانو۔۔۔ یہ مت بتادینا کہ لڑکی ہی منہ کالا کرنے کو تیار بیٹھی ہے۔" رضیہ بیگم نے بانو سے درخواست کی۔

"ہاں آپا! یہی کروں گی۔ ویسے میں سوچ رہی تھی آپا۔۔۔" بانو بیگم نے بات ادھوری چھوڑی۔

رضیہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر رضوانہ کی جگہ شبانہ کا رشتہ کردیں ادھر تو؟" بانو بیگم نے رازدارانہ انداز میں رضیہ بیگم سے کہا۔

"مجھے تو بہت بھلے لوگ لگے تھے بانو۔۔۔ اگر شبانہ کا رشتہ یہاں ہوجاتا تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ میرا ضمیر بھی مطمئن ہوجائے گا۔" رضیہ بیگم کی آنکھوں میں امید کی کرن روشن ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے معاف کردو۔ میں کچھ نہیں کرسکا۔ امی نے مجھے مجبور کردیا ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"عدیل! میں کیا کروں گی اب۔" اس نے آہستہ سے جیسے خود کلامی کی۔

"میں نے امی کو بہت سمجھایا۔" اس کے لہجے میں ہار ہی ہار تھی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم کورٹ میرج کرلیتے ہیں۔ کوئی نہیں مانے گا۔ مگر تم نے بھی میری بات نہ مانی۔" اس نے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں تم سے پیار کرتا ہوں۔۔۔ مگر اتنی بڑی باتیں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور تم لڑکی ہوکر۔۔۔"

"میں تمہارے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ کورٹ میرج کے علاوہ میرے پاس کوئی اور حل نہیں ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"حیرت ہورہی ہے مجھے خود پہ کہ میں نے تم جیسی لڑکی سے کیسے پیار کرلیا۔ جو آج میرے لیے اپنے گھر والوں کو چھوڑ سکتی ہے۔ کیا بھروسا کہ کل وہ کسی اور کے لیے مجھے بھی چھوڑدے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"بس کرو! اپنی کمزوری کو میری ضد کا نام مت دو۔ غلطی ہوگئی مجھ سے' جو میں نے تم جیسے کمزور انسان سے پیار کیا۔" اس نے کہا اور اٹھ کر پارک سے باہر چلی گئی۔ وہ تاسف سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے بانو! اگر بڑی بیٹی کا رشتہ طے تھا تو ہمیں پہلے ہی چھوٹی دکھادیتے؟" سلطانہ بیگم نے ناراضی سے بانو کی طرف دیکھا۔

"اب کیا کہوں بہن۔۔۔ بچپن میں چچازاد سے طے ہوئی تھی بات۔۔۔ پھر چچا دیار غیر جو گیا تو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب اچانک فون کیا ہے کہ ہم امانت لینے آرہے ہیں۔" بانو بیگم نے دل میں جھوٹ بولنے پر اللہ سے معافی مانگی۔

"اچھا۔۔۔" سلطانہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ "گھرانہ تو اچھا اور شریف ہے۔ چھوٹی والی کو بھی دیکھا ہوا ہے۔ وہ بھی بہت پیاری ہے۔ ارادہ تھا اسے بعد میں اپنے وقار کے لیے مانگ لوں گی۔ مگر۔۔۔ چلو ایسے ہی سہی۔ تم کہہ دو انہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" سلطانہ بیگم کے جواب پر بانو نے سکون کا سانس لیا۔

☼ ☼ ☼

"کب آئیں گے تمہارے۔۔۔ وہ۔۔۔" رضیہ بیگم نے ناراضی سے پوچھا۔

"آجائیں گے' کیا جلدی ہے آپ کو؟" رضوانہ نے چڑتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بابا چاہتے ہیں کہ تم دونوں کی ایک ساتھ شادی کردیں۔" رضیہ بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ شبانہ کی شادی کردیں' مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" رضوانہ نے بہانہ کرتے ہوئے کہا۔

"مرضی ہے تمہاری۔۔۔ تمہارے آسرے پہ نہیں بٹھاؤں گی اپنی بیٹی کو۔ سر جھکادیا میری مرضی کے آگے اس نے۔ ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ایسی بیٹیاں ہی ماؤں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہیں۔" رضیہ بیگم نے اسے سناتے ہوئے زور سے کہا۔

اس نے کمرے کی ہر چیز بکھیر کر رکھ دی تھی۔ کوئی چیز نہیں تھی جو اپنی جگہ پہ صحیح سلامت ہو۔ الماری کے سارے کپڑے' ڈریسنگ ٹیبل کا سامان' اس کی کتابیں' کچھ بھی اس کے ہاتھ سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔

پھر بھی اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہورہا تھا۔ تھک ہار کر وہ فرش پر دوزانو بیٹھ کر رونے لگی۔

کیوں؟ آخر کیوں ہوا اس کے ساتھ ایسا۔۔۔ کیسے اس کی قسمت کا ستارہ شبانہ کے ماتھے پہ سج گیا۔

آج جب وہ تیار ہوکے بہن کی بارات کا استقبال کرنے کھڑی تھی تو دولہا کے روپ میں اسے آتے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔۔۔ چونک تو وہ بھی گیا تھا' پر وہ اسے نظر انداز کرکے اس کے برابر سے گزر گیا۔

اور اب اپنی قسمت پہ ماتم کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ جس محبت کے پیچھے وہ بھاگ رہی تھی' وہ محبت ماں کی فرماں برداری کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔

اگر وہ اپنے ماں' باپ کا مان رکھتی تو محبت کا ستارہ آج اس کی مانگ میں سجا ہوتا' پر اپنی جلد بازی کے ہاتھوں وہ محبت بھی کھو بیٹھی اور والدین کا مان بھی۔

☼

مریم عزیز

تعبیر

تعبیر کے والدین کا انتقال ہونے کے بعد اس کے چچا، تایا اور پھوپھی اسے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیتے ہیں تب اس کے ماموں آگے بڑھ کر اسے سہارا دیتے ہیں اور اپنے ساتھ گھر لے جاتے ہیں۔

تعبیر کے ماموں کا یہ فیصلہ اس کی ممانی کو بالکل پسند آتا۔ نہیں وہ اس پر سخت احتجاج کرتی ہیں لیکن ماموں پروا نہیں کرتے۔ انہیں اپنی مرحوم بہن سے بہت محبت تھی اور تعبیر سے بھی وہ بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک ہی بیٹی ہے ثمرین۔ تعبیر کی ممانی اس سے نفرت کرتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تعبیر کی ماں کلثوم ان کے مس کیرج کی ذمہ دار ہے۔ تعبیر کے باپ کو کینسر تھا۔ ماموں ان کے پاس تھے، تب اچانک ممانی کی طبیعت بگڑ گئی۔ فوری طور پر اسپتال نہ جانے کی بنا پر ان کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ وہ پھر کبھی بھی تعبیر کی ماں کو معاف نہ کر سکیں۔ بیوہ ہو کر وہ بھائی کے گھر آئی تو انہوں نے اتنا تنگ کیا کہ وہ خود ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے بھائی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ یہ بھی نہیں کہ بھابی کس طرح تعبیر کو ذرا ذرا سی بات پر دھنک کر رکھ دیتی تھیں۔

ماں کے مرنے کے بعد تعبیر دوبارہ ان کے پاس آ گئی تو ان کی نفرت اور غصہ کی انتہا نہ رہی۔ ماموں جاب کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر ہی رہتے۔ ان کی غیر موجودگی میں ممانی کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔ وہ گھر کے سارے کام تعبیر پر ڈال دیتی ہیں۔ تعبیر کی ماموں زاد بہن ثمرین اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ امتحان میں نمبر کم آنے پر وہ اپنے خالہ زاد بھائی فہد سے اسے پڑھانے کے لیے کہتی ہے۔ فہد کی ماں خالدہ کو یہ پسند نہیں، وہ فہد کو تعبیر کو پڑھانے سے منع کرتی ہیں لیکن فہد ان کی بات نہیں مانتا۔ تعبیر اسکول میں ٹاپ کرتی ہے تو فہد کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ ماموں اس کو ٹاپس تحفہ میں دیتے ہیں۔ یہ بات بھی ممانی کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔

مکمل ناول

تعبیر کے انٹر میں بہت اچھے نمبر آتے ہیں وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ ممانی خرچ پر احتجاج کرتی ہیں تو تعبیر خود ہی کہہ دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر بننا پسند نہیں۔

فہد تعبیر سے محبت کا اظہار کرتا ہے' وہ اس سے کہتا ہے کہ وہ اسے یہاں سے نکال لے جائے گا۔ لیکن اس کی ماں خالدہ ثمرین کو بہو بنانا چاہتی ہیں۔ ثمرین بھی فہد سے محبت کرتی ہے۔

خالدہ ثمرین کا رشتہ مانگ لیتی ہیں۔ فہد اس سے بے خبر ہے۔ وہ جاب کے سلسلے میں آسٹریلیا چلا جاتا ہے۔ وہ فون پر فہد کو رشتہ طے کرنے کی اطلاع دیتی ہیں تو فہد بتاتا ہے کہ وہ ثمرین کو نہیں تعبیر کو پسند کرتا ہے۔

ثمرین کو جب پتا چلتا ہے کہ فہد اسے نہیں چاہتا تو اس کی حالت بگڑ جاتی ہے۔ تب ماموں تعبیر سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ان کی خاطر قربانی دے اور ثمرین کے راستے سے ہٹ جائے۔ تعبیر مان جاتی ہے۔

ممانی تعبیر کا رشتہ طے کر دیتی ہیں۔ تعبیر دلہن بنی بیٹھی ہے۔ نکاح خواں اس کی رضامندی پوچھ رہا ہے۔

دوسری اور آخری قسط ۲

اس نے ایک پل کے لیے زور سے آنکھیں بند لیں اور جب کھولیں تو دل سے ہر نقش صاف کر کے ہاں کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے شوہر اور بیٹی کو دیکھ رہی تھیں' جو نکاح کے بعد ایک دوسرے کے گلے لگے تسلی دے رہے تھے۔ تب ہی خالدہ ہانپتی ہوئی ان کے پاس آئی تھیں۔

"خیریت آپا! سانس کیوں پھول رہا ہے۔"

"وہ شاہدہ! فہد کا فون آرہا ہے۔"

"اسے پتا چل گیا؟" شاہدہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"نہیں' اس نے تو ویسے ہی فون کیا ہو گا لیکن میں تم سے پوچھنے آئی ہوں۔ کیا کہوں؟ اسے بتا دوں تعبیر کی شادی کا۔"

"نہیں آپا!" وہ تیزی سے بولیں۔ "ابھی نہیں۔ ایسے اسے اچانک نہ بتائیں۔ مجھے سوچنے دیں' کیسے اس سے بات کی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"کیا مطلب؟" خالدہ الجھ کر بہن کو دیکھنے لگیں۔

"کچھ نہیں آپا! ابھی اسے ٹال دیں۔ میں بعد میں آپ کو بتاتی ہوں۔" کہہ کر وہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں' جہاں تعبیر کو لایا جا رہا تھا۔

رخصتی کے وقت سب کی آنکھیں اشک بار تھیں لیکن خود اس کی آنکھیں خشک تھیں کیونکہ سارے آنسو تو وہ پچھلے دنوں بہا چکی تھی۔ اس کی بارات واقعی بہت سادہ تھی۔ دس لوگوں پر مشتمل مختصر سی بارات حالانکہ بقول ان کے' یہ ان کے گھر میں پہلی شادی تھی۔ میرج ہال سے گھر تک کا سفر اتنی خاموشی سے کٹا تھا کہ اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھا اس کا شریک حیات جس کی اس نے صرف تصویر دیکھی تھی۔ وہ تو بالکل اجنبی تھا اور ساتھ بیٹھا اور اجنبی لگ رہا تھا اور گھر میں جب اسے زید کی دوست کی بیگم اندر لائیں تو وہ خود کہیں چلا گیا تھا۔

باہر شور کی آواز پر کمرے میں موجود باقی لوگ بھی باہر نکل گئے تھے اور وہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی' سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سے وہ لوگ گئے تھے اور پھر اس کی نظر کمرے کے اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ بے شک یہ کمرا خوب صورت اور پر آسائش تھا لیکن آج کی تقریب کی مناسبت سے وہاں کوئی سجاوٹ نہیں تھی۔ صاف ستھری بیڈ شیٹ اور صاف ستھری دیواریں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اس نے ایک دفعہ پھر سر جھکا لیا تھا۔ تب ہی دروازہ کھلنے پر اس کے حواس ایک دم چوکنا ہو گئے۔ وہ جس صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ دروازے سے ترچھے رخ پر پڑا تھا۔ نہ آنے والا اس کو ٹھیک طرح سے دیکھ سکتا تھا اور نہ وہ۔

"السلام علیکم!" اس کے پیچھے کھڑے ہو کر کسی نے بھاری لیکن مسکراتی ہوئی آواز میں سلام کیا تھا۔

"کیا آپ مسلمان نہیں؟" اس سوال پر اس نے گھبرا کر سر ہلایا تھا "تو سلام کا جواب تو دیں۔"

"وعلیکم السلام!" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولی۔

"گڈ۔ اس سے پہلے مزید سسپنس رہے میں اپنے بارے میں بتا دیتا ہوں کہ میں ضرار ہوں۔ زید کا بڑا بھائی۔ شادی میں شریک نہیں ہو سکا کیونکہ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ آج کی ٹکٹ مل تو گئی لیکن فلائٹ لیٹ ہو گئی لیکن دیکھو پھر بھی پہنچ گیا۔"

وہ ابھی تک اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

"اچھا کیا میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں؟" وہ کہتا ہوا تھوڑا آگے آیا تھا "تعبیر نے اضطرابی انداز میں اپنا دوپٹا ٹھیک کیا۔"

"ماما بتا رہی تھیں۔ تم بہت خوفناک ہو' سوچا دیکھ لوں۔ یہ نہ ہو کہ دیکھتے ہی ڈر کر بے ہوش ہو جاؤں۔" وہ کہتا ہوا ایک دم اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بالکل بے اختیار اس کی آنکھیں اس کی طرف اٹھی تھیں۔

اس کے سامنے بیٹھا شخص اتنا ہینڈسم تھا کہ ایک پل کے لیے اس کی نظریں ٹھہری گئی تھیں لیکن دوسرے ہی پل اس نے نظریں جھکالی تھیں لیکن وہ اب بھی اس کی نظریں مسلسل اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی اور اس کی طویل خاموشی پر گھبرا کر اس نے دوبارہ نظریں اٹھائیں۔ سامنے بیٹھے شخص کے تاثرات اسے بہت سخت لگے تھے۔ اس نے کسی کے آنے کی دعا کی تھی۔ تب ہی دروازہ کھول کر ناہید بیگم اندر داخل ہوئی تھیں۔

ضرار! ملے اپنی بھابھی سے کیسی لگی؟" وہ اس کے قریب آکر پوچھنے لگیں تو وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو ضرار؟" اسے یوں تیزی سے باہر نکلتے ہو دیکھ کر وہ حیرانی سے آواز دیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگی تھیں جبکہ وہ وہیں بیٹھی اپنی عجیب و غریب شادی اور عجیب و غریب سسرالیوں کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی لیکن لگتا تھا سب اسے یہاں بٹھا کر بھول گئے تھے۔ کل سے اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا اب تو اسے بہت شدید بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر متلاشی نظروں سے کھانے کی کسی چیز کو تلاش کیا۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ وہ ڈر کے مارے اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اندر آنے والے نے دروازہ بند کر دیا اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگا اور اس کے مڑتے ہی وہ پہچان گئی کہ وہ زید ہے۔ وہ اب اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اس کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور بے حد ناگوار بو تعبیر کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹی تھی' لیکن اس نے ایک دم اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔ تعبیر حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا۔

"مما کہہ رہی تھیں بہت خوب صورت ہو تم۔" اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"ویسے ہو تو سہی۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ بھی تھام لیا تھا۔ وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ ہلنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس نے مسکرا کر اسے چھوڑ دیا اور ان ہی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ دیوار گیر الماری کی طرف بڑھا الماری کھول کر اس کے اندر سے ایک بوتل نکالی اور جب وہ پلٹا تو تعبیر کی آنکھیں جیسے پھٹ گئی تھیں۔ تعبیر بے ساختہ دیوار کے ساتھ جا لگی اور وہ اس کے سامنے رکھے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

"لیکن مجھے عورت کے خوب صورت چہرے سے نفرت ہے۔ دل چاہتا ہے تیزاب ڈال کر اس خوب صورتی کو تباہ کردوں۔" اس نے اسے دیکھا جو باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور ایک بار پھر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ تعبیر کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

"رو اور زور سے رو کیوں کہ خوب صورت لڑکیوں کو روتے دیکھ کر مجھے بہت سکون ملتا ہے۔"

وہ کہتے ہوئے اس کی طرف جھکا تو وہ ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا ارادہ باہر جانے کا تھا اور وہ اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اس نے تیزی سے ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تھا۔ اتنا بھاری دوپٹا اور لہنگا وہ لڑکھڑا کر اس کے ساتھ لگی تھی۔

"ایسی بدتمیزی مجھے بالکل نہیں پسند۔" وہ خون خوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو تعبیر سہم کر رہ گئی۔ "پلیز مجھے جانے دیں۔"

"جانے دوں۔" وہ ہنسا تھا۔ "کہاں جانا ہے۔ کسی کو ٹائم دیا ہوا ہے یا باہر تمہارا کوئی بوائے فرینڈ کھڑا ہے؟"

اس نے اس الزام پر چیخ کر آنکھیں بند کرلیں۔

"چلو رونا بند کرو' اور یہ پیو۔" اور تعبیر کو کرنٹ لگا تھا۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے گلاس کو دیکھا۔

"پیو۔" وہ زبردستی گلاس اس کے منہ سے لگا رہا تھا۔ تعبیر نے پورا زور لگا کر اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا تھا' اور گلاس ماربل کے فرش پر گر کر چور چور ہوگیا تھا۔ گلاس کے ٹوٹتے ہی اس نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور وہ نازک سی لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کے ساتھ جاکر ٹکرائی۔ درد کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ چیخ اٹھی تھی' لیکن وہ جیسے پاگل ہوچکا تھا۔ اس کے قریب آتے ہی اس نے اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کردیا تھا۔ اس کی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا۔ جھٹکے سے اس کا دوپٹا سر سے کھینچا جو پنوں کے ساتھ بالوں سے جڑا تھا۔ کھینچنے پر اسے یوں لگا جیسے اس کے سر کی کھال کسی نے اتار لی ہو۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا' وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہوگئی۔ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے اسے بیلٹ نکالتے دیکھا۔ اس کی روح تک کانپ اٹھی۔ اس نے ٹھنڈے فرش پر جہاں اس کا جسم اکڑ چکا تھا' ہلنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"زید!" باہر کسی نے بری طرح دروازہ پیٹا تھا اور ساتھ اس کے نام کی پکار بھی جاری تھی۔

"یااللہ!" وہ اللہ کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔ دروازہ کھل چکا تھا اور کوئی اس کی طرف بڑھا تھا۔

"او میرے خدا!" اس نے ناہید کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ انہوں نے آکر اسے ٹھنڈے فرش سے اٹھا کر سیدھا کیا' لیکن وہ مزید کچھ دیکھ اور سن نہیں سکی کیوں کہ سب کچھ تاریک ہوگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی کمرے میں تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ بستر پر تھی اور اس کے کپڑے بدلے جاچکے تھے۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ ناہید اور اعجاز صاحب اندر داخل ہوئے تھے۔ اس کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر ناہید مسکرائی تھیں۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آگیا۔ پورے دو دن بعد ہوش آیا ہے تمہیں۔" وہ اس سے ایسے بات کررہی تھیں جیسے دو گھنٹے کی بات کررہی ہوں۔

"پہلے جوس پیوگی یا کھانا منگواؤں؟"

"مجھے گھر جانا ہے۔" ناہید کے چہرے پر نظر آتی مسکراہٹ لمحوں میں غائب ہوئی تھی اور چہرے پر بےگانگی چھاگئی تھی۔

"کون سا گھر۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔"

"یہ میرا گھر نہیں ہے۔" وہ چیخ کر بولی۔ "مجھے

ماموں کے پاس جانا ہے۔" اپنی بے بسی پر وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

"ایسی حالت میں جاؤگی اپنے ماموں کے پاس؟ کیا جتاؤگی انہیں؟"

"آپ کا بیٹا ایک نارمل انسان نہیں۔ اس نے جانوروں کی طرح مجھے مارا ہے۔" وہ بری طرح رورہی تھی۔ پیچھے کھڑے اعجاز صاحب نے پشیمان ہوکر سر جھکالیا۔

"وہ ایک ذہنی مریض ہے۔"

"ہاں وہ ایک ذہنی مریض ہے۔" ناہید نے اس کے بیان کی تائید کی تھی وہ رونا بھول کر ان کا چہرہ یوں دیکھنے لگی جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"ہاں وہ ایب نارمل ہے۔ اس میں بہت سی برائیاں ہیں اور ڈاکٹر نے ہی تجویز کیا ہے کہ اگر اس کی شادی ہوجائے اور اسے ایک پیار کرنے والی بیوی مل جائے تو وہ ٹھیک ہوسکتا ہے۔ اسی لیے ہم نے تمہارا انتخاب کیا تھا۔"

اور تعبیر کو اپنے دماغ میں دھماکے ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھی عورت کا ظاہر کتنا خوب صورت تھا' لیکن اس کا باطن اس کی سوچ کتنی گھناؤنی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کی خاطر اس کی پوری زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ اس کے یوں دیکھنے پر انہوں نے نظریں گھما کر سامنے دیکھنا شروع کردیا۔

"اور یہ بات تمہارے گھر والے جانتے ہیں۔"

"یہ نہیں ہوسکتا میں نہیں مانتی۔" وہ زور زور سے سر نفی میں ہلانے لگی۔

"جو ہوا ہے اسے یہیں تک رہنے دو تو اچھا ہے۔ اس میں تمہاری بھی عزت ہے اور ہماری بھی۔ یہاں تمہیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ دولت' عیش و آرام سب ملے گا جبکہ واپسی کی صورت تم دوبارہ ان ہی حالات کا شکار ہوگی' ساتھ میں طلاق جیسا دھبہ بھی لے کر جاؤگی۔ زید کو ایسے دورے کبھی کبھار ہی پڑتے ہیں۔ ویسے وہ ٹھیک رہتا ہے۔ تم اس کے ساتھ تعاون کرو تو یہ بھی کم ہوجائیں گے۔" وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے جو سمجھانا تھا سمجھادیا۔ آگے تمہاری مرضی۔" وہ کندھے اچکا کر کھڑی ہوگئیں اور ان کے پیچھے سر جھکائے اعجاز صاحب بھی نکل گئے۔ جب کہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ انہوں نے اس کی زندگی کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا' لیکن بجائے نادم ہونے کے' وہ اسے مصالحت کا مشورہ دے رہی تھیں' وہ کیسے ایک

ایب نارمل شخص کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے' جس سے اسے جان کا بھی خطرہ ہو۔

"اور میرے گھر والے۔۔۔ماموں وہ کبھی ایسا نہیں کرسکتے' جھوٹ بولتی ہیں یہ۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے خود کو باور کروایا۔ ٹیلی فون کی تلاش میں اس نے نظریں گھمائیں۔ وہاں کوئی فون نہیں تھا اور نہ ہی اس کا موبائل' وہ چکراتے سر کے ساتھ اٹھی اور بمشکل باہر آئی تھی۔ اندازے سے دائیں طرف چل پڑی۔ سامنے بڑا سا لاؤنج تھا۔ اس کے بائیں طرف ڈائننگ روم اور ۔۔۔ پھر شاید کچن تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے فون نظر آہی گیا۔ اس نے کسی کے نہ ہونے کا یقین کرکے قدم فون کی طرف بڑھائے۔ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد جب وہ مایوس ہو کر فون رکھنے لگی تھی تو فون اٹھالیا گیا۔ شاہدہ کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر سسکنے لگی تھی۔

"کون؟" دوسری طرف سے حیرت کا مظاہرہ ہوا تھا۔

"ممانی میں تعبیر۔"

"تعبیر! تم رو کیوں رہی ہو۔" وہ اب واقعی حیران ہوئی تھیں۔

"ممانی! ماموں سے کہیں مجھے یہاں سے لے جائیں۔" وہ بری طرح رونے لگی۔

"ہیں ہیں لڑکی۔۔۔ حواسوں میں تو ہو۔ کیا کہہ رہی ہو۔ دو دن ہوئے تمہاری شادی کو اور تم لڑ جھگڑ بھی بیٹھی ہو۔"

"نہیں ممانی! زید نارمل انسان نہیں۔ اس نے مجھے مارا ہے' بہت مارا ہے۔ وہ ڈرگز بھی لیتا ہے۔" وہ بچوں کی طرح ان سے شکایت کررہی تھی۔ دوسری طرف خاموشی چھاگئی تھی۔

"آنٹی کہہ رہی ہیں کہ آپ لوگوں کو سب پتا ہے' لیکن میں جانتی ہوں ممانی! یہ سچ نہیں۔ آپ لوگ میرے ساتھ ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔" کچھ لمحے خاموش رہ کر ممانی نے گلا کھنکھار کر بات شروع کی تھی۔

"دیکھو تعبیر! جو ہونا تھا۔ وہ ہوگیا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہماری اپنی بیٹی بھی ہے جو ہمیشہ تمہاری وجہ سے نظر انداز ہوتی رہی ہے اور اتنی مشکل سے تم سے جان چھوٹی ہے تو اب کیا پھر تم ہمارے سروں پر سوار ہونا چاہتی ہو؟"

"ممانی!" اس کی آواز جیسے کنویں سے آئی تھی۔

"اب تمہارا مرنا جینا اسی گھر میں ہے وہ تمہیں پھولوں کی طرح رکھتا ہے یا جوتی کی نوک پر۔ تمہیں اب وہیں رہنا ہے اور جہاں تک اس کے دماغی خلل کا تعلق ہے تمہاری ساس نے مجھے بتایا تھا' لیکن یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں کہ تم دوسرے دن طلاق کا لیبل لگوا کر پھر ہمارے سروں پر سوار ہوجاؤ اور اب یہ رونے دھونے کے لیے بھی فون مت کرنا۔ خوشی سے آنا ہے ضرور آؤ' ورنہ یہاں آنے سے پہلے کسی گاڑی کے نیچے آجانا اور ایک بات اور ۔۔۔ ماموں تک یہ باتیں پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر ان تک یہ بات پہنچی اور وہ تمہیں اس گھر میں دوبارہ لے کر آئے تو یہ یاد رکھنا میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا دبادوں گی۔"

کھٹاک سے فون بند ہوگیا تھا اور وہ بالکل ساکت تھی۔ اس کا وجود جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھا تو اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے نظر گھما کر دیکھا ۔ زید کا بھائی ضرار اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی۔ اس کی اس حرکت پر اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے تک آئی اور دروازہ بند کرکے اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی بے قابو ہوتی چیخوں کو روکا۔

☼ ☼ ☼

اسے یہاں آئے پانچواں دن تھا۔ شادی والے دن کے بعد اس نے زید کو نہیں دیکھا تھا اور یہ بات اس کے لیے سکون کا باعث تھی۔ ولیمہ تو ان لوگوں نے کیا نہیں تھا۔ ماموں کو پتا نہیں کیا کہہ کر وہ لوگ ولیمہ منسوخ کرچکے تھے' لیکن اس کے باوجود ان پانچ دنوں میں کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ ممانی تو خود بتا چکی تھیں' لیکن ماموں اور ثمرین بھی اسے ملنے نہیں آئے تھے۔ وہ سب سے بدگمان ہوگئی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا اس کی بربادی میں سب شامل ہیں ماموں بھی' جو ساری عمر اس کی محبت کا دم بھرتے رہے اور اپنی بیٹی کی محبت کے لیے انہوں نے اس کی بربادی کا سودا کردیا۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بغور اپنا چہرہ دیکھا' جو پانچ دنوں میں مرجھا کر رہ گیا تھا۔ اس کی گردن پر اور بازوؤں پر ابھی بھی زخموں کے نشان تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر اپنا رخ موڑلیا۔ جب وہ باہر آئی تو لاؤنج سے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ وہیں رک کر سننے لگی۔

"آپ کو کیا حق پہنچتا ہے' آپ کسی معصوم کی زندگی کے ساتھ کھیلیں۔" یہ آواز ضرار کی تھی۔

"میں آپ سے پوچھ رہا ہوں مما!" ان کو خاموش دیکھ کر وہ زور سے بولا تھا۔

"کیا پوچھ رہے ہو؟" اس کے برعکس وہ بڑے تحمل سے بولی تھیں۔ ضرار ان کے انداز پر گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"آپ کو زید کی ذہنی کیفیت کا پتا تھا پھر کیوں آپ نے کسی کی بیٹی کی زندگی خراب کی اور آپ پاپا! آپ نے بھی مما کو نہیں سمجھایا۔" وہ اب اعجاز صاحب کی طرف مڑا تھا۔

"بہت سمجھایا تھا۔ واسطے بھی دیے تھے' لیکن یہ عورت کتنی ضدی ہے تم جانتے ہو۔" ناہید نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"اس دن اس بچی کی حالت دیکھ کر میری روح تک کانپ گئی تھی۔" انہوں نے جیسے جھرجھری لی تھی۔

"آپ دونوں کیا میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کیا غلط کیا میں نے اپنے بچے کا فائدہ ہی سوچا ہے نا۔ ہر ماں سوچتی ہے۔ آپ کے سامنے زید کے ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟" انہوں نے اعجاز صاحب سے پوچھا۔

"اور جہاں تک برباد کرنے کی بات ہے۔" انہوں نے مڑ کر ضرار کی طرف دیکھا۔ "میں نے کسی کی زندگی برباد نہیں کی' میں نے اس کی ممانی کو پہلے ہی زید کی ذہنی حالت بتادی تھی۔"

"آئی کانٹ بلیو دس۔" ضرار نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"تو تمہارا مطلب ہے' میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"لیکن کوئی ماں باپ کیسے اپنی بیٹی کے لیے ایسا سوچ سکتے ہیں۔" ضرار جیسے بے یقینی سے بولا۔ ناہید طنزیہ انداز میں مسکرائی تھیں۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے وہ تعبیر کے ماں باپ نہیں ماموں ممانی ہیں اور دوسرا پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ میں نے تو انہیں چند آسانیاں دی تھیں' لیکن وہ تو جیسے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ یہ جو تین ہفتے تیاری کے لیے تھے۔ وہ بھی میں نے زبردستی لیے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسی دن اسے زید کے بغیر ہی ہمارے ساتھ رخصت کردیتے۔"

ان کے لہجے میں کتنی حقارت تھی۔ اس کے لیے' اپنی بے دقعتی اور بے عزتی پر اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ مزید کھڑے ہو کر اپنی ذات کی بے قدری کا سننے کا اس میں یارا نہیں تھا۔ وہ انہی قدموں سے پلٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دستک پر اس نے ۔۔۔ دروازے کی طرف دیکھا اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"کون!"

"باجی! بڑی بی بی آپ کو بلا رہی ہیں۔ کھانا لگ گیا ہے۔"

"اچھا۔" اس کا رکا ہوا سانس جیسے بحال ہوا تھا۔ وہ ہاتھوں سے بالوں کو سنوارنے کے بعد دوپٹا ٹھیک کرتی باہر آگئی تھی۔ آہستہ سے سلام کرکے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وسیع عریض ڈائننگ ٹیبل پر چاروں موجود تھے۔ لیکن سوائے چمچہ اور کانٹے کے کسی اور چیز کی آواز نہیں آرہی تھی۔

"پھر کیا سوچا تم نے؟" ناہید کے سوال پر ان تینوں نے ایک ساتھ ان کی طرف دیکھا تھا، لیکن وہ تعبیر سے مخاطب تھیں۔

"جی؟" تعبیر نا سمجھی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ تم نے کہا تھا تم یہاں رہنا نہیں چاہتیں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں کیا سوچا تم نے؟" تعبیر کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا۔ شرمندگی کے مارے وہ سر ہی نہیں اٹھا سکی۔ کتنے دعوے سے اس نے کہا تھا، وہ چلی جائے گی۔ اسے یاد ہونا چاہیے تھا جہاں سے وہ آئی ہے۔ وہاں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو ناہید! وہ کیوں کہیں جائے گی یہ گھر اس کا ہے۔" اعجاز صاحب نے اس کا چہرہ دیکھا تو بے اختیار بول اٹھے۔ ان کو پہلے دن سے اس لڑکی سے ہمدردی سی ہوگئی تھی اور اس کی وہ بے بس لاچار حالت انہیں اب بھی یاد آتی تو وہ کانپ سے جاتے تھے۔

"میں نے تو اس سے کہا ہے یہ اس کا گھر ہے، لیکن اس نے کہا تھا کہ اسے اپنے ماموں کے گھر جانا ہے۔ سب حالات اس کے سامنے ہیں اب یہ اس کی مرضی ہے۔"

تعبیر کو اتنی تکلیف تو کبھی ممانی کی مار سے نہیں ہوئی تھی، جتنی ان کے لفظوں سے ہو رہی تھی۔

"بس مما!" ضرار نے چمچہ زور سے پلیٹ پر پٹخا تھا۔

"کیا ہم سکون سے کھانا بھی نہیں کھا سکتے؟" اس نے غصے اور ناراضی سے ان کا چہرہ دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر پلیٹ پر جھک گئیں۔

☼ ☼ ☼

"تم اتنی بے حس کیسے ہو سکتی ہو ناہید!" وہ جو ڈائننگ روم میں بڑے ضبط سے بیٹھے تھے، کمرے میں آتے ہی پھٹ پڑے۔

"کیوں میں نے کیا کیا؟" وہ اپنے اسی ازلی مطمئن انداز میں پوچھنے لگیں۔

"کیا کیا ہے؟" انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔ "کیا ضرورت تھی تمہیں اس بچی سے اس طرح کی باتیں کرنے کی۔ اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہی تھیں تم۔"

"تو کیا ضرورت تھی اس بچی کو میرے منہ لگنے کی۔ بڑے رعب سے کہہ رہی تھی مجھے جانا ہے تو جائے اب۔"

"اس میں رعب کی بات کہاں سے آگئی۔ جو تمہارے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد وہ یہ سب کہنے میں حق بجانب ہے۔ اس کی جگہ اگر تمہاری ہائی سوسائٹی کی کوئی لڑکی ہوتی تو اب تک نہ صرف طلاق لے چکی ہوتی بلکہ تمہارے بیٹے کو جیل بھجوا چکی ہوتی اور میڈیا والے ہماری عزت کی دھجیاں اڑا چکے ہوتے۔" ان کے حقیقت پسندانہ تجزیہ کو انہوں نے ناک پر سے مکھی کی طرح اڑایا۔

"جانتی ہوں اسی لیے تو اس لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ ورنہ یہی ٹٹ پونجیے رہ گئے تھے ہمارے لیے اور ابھی دیکھا۔ کیسے بیٹھی تھی اپنے گھر والوں کو فون کیا تھا۔ صاف جواب ملا ہوگا اسی لیے تو کچھ بولی نہیں۔" انہوں نے جیسے اس کی بے بسی کا مزا لیا تھا۔ اعجاز صاحب نے افسوس سے سر ہلایا۔

"اللہ سے ڈرو ناہید بیگم!" ان کی بات بری طرح چبھی تھی انہیں۔ وہ تڑپ کر بولی تھیں۔

"ایسا کیا کیا میں نے جو اللہ کے عذاب سے ڈروں میں نے کسی کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں نے زید کی حالت اس کی ممانی کو بتائی تھی۔ زبردستی یا گن پوائنٹ پر لے کر نہیں آئے اس لڑکی کو۔ ان لوگوں کی رضامندی سے ہوا ہے یہ نکاح۔ دس لوگوں میں ساتھ لے کر آئے ہیں۔ لاکھوں کا زیور چڑھایا ہے اسے۔" اعجاز صاحب کے کہنے پر انہوں نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"پتا نہیں آپ کو کیوں اس لڑکی سے ہمدردی ہو رہی ہے اور میں تو ضرار کا رویہ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔ اس لڑکی سے اسے بھی ہمدردی ہو رہی ہے۔

بہرحال آپ لوگ جو بھی سمجھیں آپ کی مرضی۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بات ہی ختم کر دی۔

"میں تو اب اس دن کے انتظار میں ہوں جب ضرار شادی کے لیے ہاں کہے گا تو میں ساری حسرتیں پوری کروں گی۔ ان لوگوں کو تو میں اپنے حلقہ احباب میں کسی سے ملوا بھی نہیں سکتی۔"

"ضرار کسی کو پسند کر چکا ہے۔" اعجاز صاحب نے مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز اختیار کیا تو لپ اسٹک لگاتا ان کا ہاتھ ایک لمحہ کو رکا تھا۔

"تو؟" انہوں نے ابرو اچکا کر اعجاز صاحب سے پوچھا۔

"تو یہ کہ اگر وہ لڑکی تعبیر سے بھی گئی گزری ہوئی تو۔" اب بھی اعجاز صاحب کے انداز میں طنز کی مقدار کافی زیادہ تھی۔ ناہید بیگم نے غصے سے لپ اسٹک بند کی۔

"ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے ضرار کی پسند پر پورا یقین ہے۔ آپ جانتے ہیں اس کا معیار۔" وہ بڑے یقین اور فخر سے بولیں۔ "خیر معیار تو میرے زید کا بھی بہت اچھا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔" اب کہ انہوں نے اعجاز صاحب کو کچھ جتایا تھا۔

"اپنی عادتوں کی وجہ سے وہ مار کھا گیا اور اسی لیے مجھے تعبیر کی صورت میں کمپرومائز کرنا پڑا۔" انہوں نے بالوں میں برش کر کے اپنا تفصیلی جائزہ لیا۔

"میں جا رہی ہوں۔ رات کو تھوڑی دیر ہو جائے گی۔" ان کے جانے کے بعد اعجاز صاحب نے بھی گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے دو گھنٹے سے تعبیر کا نمبر ملا رہے تھے، مگر وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ اب تو انہیں فکر ہونے لگی تھی۔

"یہ لیں چائے۔" شاہدہ بیگم نے چائے کا کپ ٹیبل پر لا کر رکھا۔

"کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟" ان کے پوچھنے پر بھی وہ موبائل کی طرف ہی متوجہ رہے تو وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگیں جو پریشان نظر آ رہے تھے۔

"کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے۔" وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

"ہاں کب سے تعبیر کا نمبر ملا رہا ہوں۔ اس کا موبائل آف جا رہا ہے۔" شاہدہ نے چور نظروں سے انہیں دیکھا، پھر ایک دم چہرے کے تاثرات بدل کر مسکرا کر بولیں۔

"تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟" تنویر صاحب نے قدرے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"تمہارے لیے یہ پریشانی والی بات نہیں ہوگی۔ میرے لیے ہے۔ ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ میں نے اس لیے نہیں کہا اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ نئے لوگ ہیں۔ اچھا نہیں لگتا، لیکن اس کو تو مجھے فون کر کے اپنی خیریت بتا دینی چاہیے تھی۔ اب یہ موبائل آف ہے۔ مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔"

"ارے میں آپ کو بتانا بھول گئی۔" انہوں نے یوں اپنے سر پر ہاتھ مارا جیسے انہیں اچانک یاد آیا ہو۔

"دو دن پہلے تعبیر کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ وہ اور زید ہنی مون کے لیے پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ شاید ایک دو ماہ لگ جائیں آپ گھر پر نہیں تھے تو بات نہیں ہو سکی۔ کہہ رہی تھی آکر خود فون کرے گی۔"

تنویر صاحب ایک پل کے لیے خاموش رہ گئے۔

"کمال ہے اگر ایسی بات تھی تو میرے موبائل پر فون کر سکتی تھی۔" وہ کچھ الجھ کر بولے۔

"اب چھوڑیں بھی، آپ کو ہر وقت تعبیر کی فکر رہتی ہے۔ اب وہ اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں وہ وہاں مزے کر رہی ہوگی اور آپ سوچ سوچ کر اپنا خون جلا رہے ہیں۔ چائے پئیں میں آپ کے لیے کباب لاتی ہوں۔"

وہ جلدی جلدی بولتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر تنویر صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اب چائے پی رہے تھے۔ وہ خود کو داد دیتی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ اب کم از کم دو ماہ تو سکون

کے گزریں گے۔

☼ ☼ ☼

خالدہ کتنی دیر تک شاہدہ کا منہ دیکھتی رہیں۔ جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو۔ کچھ دیر بعد ان کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا تھا۔

"نہیں شاہدہ! یہ غلط ہے اور پھر جھوٹ بول کر ــــ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔" ان کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

"آپا! کہتے ہیں جس جھوٹ سے کسی کا نقصان نہ ہو وہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں فہد ساری عمر تعبیر کے نام پر بیٹھا رہے۔ وہ تو شادی کرکے عیش کررہی ہے۔ فہد اور ثمرین کو کس بات کی سزا ملے۔ جب تک فہد کا دل تعبیر کی طرف سے خراب نہیں ہوگا تب تک وہ کبھی ثمرین سے شادی کے لیے نہیں مانے گا۔ میں اپنی بیٹی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتی اور کیا آپ فہد کو ساری عمر تنہا دیکھ سکتی ہیں؟"

شاہدہ کے پوچھنے پر ایک بار پھر خالدہ کا سر نفی میں ہلا اور انہوں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

بیل جارہی تھی اور ہر بیل کے ساتھ ان کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ چھٹی ساتویں بیل تھی جب فون اٹھالیا گیا تھا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو فہد کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں امی! خیریت ہے آپ نے فون کیا، وہاں سب ٹھیک ہے نا۔" ان کی آواز سن کر پہلے وہ حیران اور پھر پریشان ہوگیا تھا۔

"ہاں سب خیریت ہے بس تم سے بات کرنے کو دل کررہا تھا۔ اتنے دن سے تم نے فون بھی نہیں کیا۔"

"جی امی بس کام ڈھونڈ رہا تھا۔"

"فکر نہ کرو بیٹا! جاب ضرور مل جائے گی۔" وہ اس کی آواز کی پریشانی محسوس کرکے تسلی آمیز انداز میں بولیں۔

"جی وہ میں خالہ کی طرف فون کررہا تھا۔ کوئی ریسیو نہیں کررہا۔" اب کہ خالدہ نے شاہدہ کی طرف دیکھا جنہوں نے اشارے سے انہیں اپنی بات جاری رکھنے کو کہا تھا۔

"ہاں ان کا فون خراب ہے۔ تم ثمرین کے موبائل پر کرلیتے۔"

"میں نے تعبیر کے موبائل پر کیا تھا۔ اس کا موبائل آف تھا۔ کیا اس کا فون ابھی بھی صحیح نہیں ہوا۔"

"ارے ہاں تعبیر سے یاد آیا۔ میں اتنی اہم بات تمہیں بتانا بھول گئی۔ تعبیر کی شادی ہوگئی۔"

"جی۔" اس کی چیخ نما آواز سنائی دی تھی انہیں۔

"کیا کہا آپ نے؟" اتنی دور سے بھی وہ محسوس کرسکتی تھیں، فہد کی آواز کانپ رہی ہے۔ انہوں نے بڑی بے بسی سے شاہدہ کی طرف دیکھا جنہوں نے ان کے قریب آکر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں ڈھارس دی تھی۔

"امی! آپ مذاق کررہی ہیں نا۔" اس نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

"میں کیوں مذاق کروں گی بلکہ میں نے تو شاہدہ سے بات بھی کرلی تھی لیکن اس نے صاف انکار کردیا وہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس کا کسی کے ساتھ افیئر چل رہا تھا۔"

"نہیں امی! یہ ممکن نہیں۔ وہ بالکل ایسی نہیں۔ وہ ٹھیک سے کسی سے بات نہیں کرسکتی، افیئر کیسے چلا سکتی ہے۔" وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ پھر صرف ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی شادی کیوں کردی تنویر نے۔ میں غلط ہوسکتی ہوں شاہدہ ہوسکتی ہے لیکن کیا تنویر بھی غلط ہوسکتا ہے۔ وہ اس کے لیے بھاگنے کو تیار تھی، صرف بدنامی کے ڈر سے بچنے کے لیے تنویر نے اس کے ساتھ سادگی سے رخصت کردیا۔"

"نہیں امی! میں نہیں مانتا۔" وہ جیسے رو دینے کو تھا۔

"وہ کیسے کسی اور سے شادی کرسکتی ہے۔ میں تو اسے کہہ کر آیا تھا کہ میرا انتظار کرے۔"

"بیٹا دولت اچھے اچھوں کا ایمان بدل دیتی ہے۔ وہ لڑکا بہت دولت مند ہے۔" فہد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس کی خاموشی پر انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

"تم جس کے لیے رو رہے ہو، وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون پر گئی ہوئی ہے۔"

"امی! میں بعد میں فون کروں گا۔" اس نے کچھ مزید سنے بغیر فون بند کردیا۔ خالدہ نے فون رکھ کر افسوس سے شاہدہ کو دیکھا۔

"مجھے بالکل اچھا نہیں لگا شاہدہ! میرا بچہ پردیس میں پریشان رہے گا۔" پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"آپا! یہ رونا ساری عمر رونے سے بہتر ہے۔ ہم نے بالکل جھوٹ نہیں بولا۔ شادی تو ہوگئی نا اس کی، خوش بھی ہوگی اتنے امیر لوگ ہیں۔ ہاں صرف وہ بھاگنے والی بات غلط ہے۔ آپا! ثمرین اور فہد کی شادی کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔"

"اور اگر اسے پتا چل گیا تو؟" شاہدہ نے سر نفی میں ہلایا۔

"اول تو اسے پتا نہیں چلے گا اور چل بھی گیا تو کیا ہوسکتا ہے شادی تو ہوگئی تعبیر کی۔ بس آپا! آپ مزید مت سوچیں اور دعا کریں کہ فہد کے سر سے اس کا بھوت اتر جائے اور وہ ثمرین سے شادی کے لیے مان جائے۔"

"ہوں۔" انہوں نے شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دی تھی، لیکن اندر سے وہ فہد کے لیے پریشان تھیں۔

☼ ☼ ☼

فون بند کرکے وہ کتنی دیر تک اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ بتائے سارے لمحوں کو کھنگال ڈالا تھا، لیکن کوئی بھی ایسا لمحہ اس کی گرفت میں نہیں آیا تھا جب اسے لگا ہو کہ اس کے دل میں کوئی اور ہے۔ وہ کبھی اس سے بھی نظر ملا کر بات نہیں کرتی تھی، پھر کیسے وہ کسی کے ساتھ.....

اس نے اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں دبالیا۔ ضبط کرنے کے چکر میں اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ہر احساس پر یہ احساس حاوی تھا کہ وہ اس کے لیے پرائی ہوگئی۔ وہ ایک دم اٹھا۔ اس نے ایک نظر کمرے پر ڈالی اور دوسرے پل اس نے ہر چیز تہس نہس کردی۔

"میں تمہیں کہہ کر آیا تھا تعبیر! میرا انتظار کرنا۔" وہ چیخ اٹھا۔ "میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ اکیلے کمرے میں ٹوٹی ہوئی چیزوں کے درمیان کھڑا خود بھی ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جب وہ چیخ چیخ کر تھک گیا تو وہیں زمین پر بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

☼ ☼ ☼

اسے لگ رہا تھا وہ یوں مزید اکیلی بیٹھی رہی تو پاگل ہوجائے گی۔ وہ ہفتوں سے بھی زیادہ ہوگئے تھے اسے یہاں آئے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہیں تھا اور وہ لوگ بھی اسے یہاں لاکر بھول گئے تھے۔ اس دن ناہید بیگم نے جو باتیں سنائی تھیں۔ اس کے بعد سے وہ خود ہی دو دن تک ان سے کتراتی رہی، لیکن یہ ان کا گھر تھا۔ وہ کب تک یوں کرسکتی تھی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت مجبور ہوکر خود ہی کمرے سے نکل آتی۔ لیکن ڈائننگ ٹیبل پر کوئی نہیں ملتا تھا۔ ناہید سے وہ خود سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اعجاز صاحب سے دن میں ایک دو بار ملاقات ہوجاتی۔ صرف ایک وہی تھے جو اس گھر میں کم از کم اسے انسان کا درجہ دینے کو تیار تھے اور اس گھر کا تیسرا فرد زید کا بھائی تعبیر کو اس سے سخت خوف آتا تھا۔ اس سے بھی کم از کم اس کا تین چار بار سامنا ہوا تھا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری چھا جاتی تھی اور جس کے حوالے سے وہ یہاں آئی تھی وہ تو پتا نہیں کہاں تھا۔ وہ خود کو اس گھر میں بہت غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ وہ زید کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی، لیکن اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا

کس سے پوچھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا فون جان بوجھ کر غائب کیا گیا ہے' لیکن اگر فون ہوتا بھی تو کیا؟ ہر رشتے پر سے اس کا بھروسہ اٹھ گیا تھا۔

"اور اگر آج میری شادی فہد سے ہوئی ہوتی تو کیا میں یوں بے رنگ اجڑی ہوئی ہوتی۔"

اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ "اگر میں فہد سے رابطہ کروں تو کیا وہ میری مدد کریں گے؟ اور اگر انہوں نے بھی باقی سب کی طرح مجھے ناامید کر دیا تو؟"

وہ خود ہی سوال جواب کرنے لگی اور کوئی جواب نہ ملنے پر بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ باہر لاؤنج میں آئی تو ہمیشہ کی طرح روشنی سے جگمگاتا ہوا لاؤنج خالی تھا۔ کچن سے کھٹر پٹر کی آواز آرہی تھی جس کا مطلب تھا بلقیس ابھی تک اپنے کوارٹر میں گئی نہیں۔ وہ سیدھی کچن کی طرف آگئی لیکن اندر داخل ہوتے ہی۔ رک گئی کیوں کہ وہاں بلقیس کی جگہ ضرار کھڑا تھا۔

وہ شاید کھانے کے لیے کچھ ڈھونڈ رہا تھا' اس سے پہلے کہ وہ اندر جاتی یا باہر مڑتی ضرار مڑا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی پہلے وہ حیران ہوا پھر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے وہ فریج کی طرف مڑ گیا اور بریڈ نکال کر کاؤنٹر پر رکھی اور مائیکرو ویو کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے سالن کا ڈونگا نکالا۔ وہ بریڈ کے ساتھ کل کا سالن کھانے والا تھا۔ وہ بے ساختہ اندر آئی۔

"میں چپاتی بنا دیتی ہوں۔" ضرار نے مڑ کر نہیں دیکھا اور چیزیں وہیں کاؤنٹر پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ تعبیر نے تیزی سے چپاتیاں بنائیں کباب فرائی کیے۔ دھنیے کی چٹنی اور کیچپ ٹرے میں رکھ کر باہر نکل آئی۔ پہلے اس نے ٹرے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی لیکن جب وہ نہ آیا تو ٹرے اٹھا کر کاریڈور کی طرف آگئی۔ اتنے دنوں میں اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کس کا کمرا کون سا ہے۔ وہ اندازے سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہاں سے بولنے کی آواز آرہی تھی جو یقیناً ضرار کی تھی۔ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر دو انگلیوں سے ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر جھانکا۔ وہ فون پر بات کرتے کرتے مڑا اور اس پر نظر پڑتے ہی اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" اس نے فون بند کر کے بہت غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کھانا۔" اس نے گھبرا کر ٹرے اس کے سامنے کی۔ ضرار نے ایک نظر ٹرے کو دیکھا اور پھر اس کا چہرہ۔

"کس نے کہا تھا تمہیں کھانا لے کر آؤ۔" تعبیر لاجواب سی ہو کر سر جھکا گئی۔

"لے جاؤ اسے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بولا تو تعبیر میں ہمت ہی نہیں رہی کہ مزید کوئی بات کرے۔

"اور ایک بات۔" وہ اس کے پیچھے آکر بولا تو اس نے صرف سر گھمایا تھا۔

"آئندہ میرے کمرے میں آنے کی غلطی نہ کرنا۔" تعبیر خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اپنے پیچھے اس نے بڑے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

☼ ☼ ☼

جب وہ اندر داخل ہوا تو وہ دونوں کسی بات پر بحث کر رہے تھے لیکن اس پر نظر پڑتے ہی خاموش ہو گئے۔

"گڈ مارننگ۔" کہتا ہوا وہ ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"گڈ آفٹر نون بیٹا!" اعجاز صاحب کے کہنے پر وہ بس مسکرا دیا تھا۔ ناہید نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" ضرار نے ایک نظر انہیں دیکھ کر سامنے رکھا اخبار اٹھا لیا۔

"جی میں ٹھیک ہوں۔"

"تو آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں تمہاری اور چہرہ بھی اترا اترا لگ رہا ہے؟" ناہید کے لہجے سے تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

"رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔"

"کیوں۔"

"میں نے نیند سے نہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آرہی۔" اس کے جلے انداز پر اعجاز صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جب کہ ناہید نے ناراضی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"نیند نہ آنے کا مطلب سمجھتی ہو بیگم!" اعجاز صاحب کا انداز شرارتی تھا۔ جسے سمجھ کر ناہید مسکرا دیں۔

"لگتا ہے صاحبزادے کے دل میں کوئی آن بسا ہے۔"

"پلیز پاپا اسٹاپ اٹ۔" اب کے وہ ناگواری سے بولا تو اعجاز صاحب اور ناہید دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا کیوں کہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ یہ غصہ' یہ چڑچڑاپن اس کے مزاج کا خاصا نہ تھے۔

"کوئی پرابلم ہے ضرار۔" اعجاز صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ضرار نے گہرا سانس لے کر اخبار واپس رکھ دیا۔

"کوئی پرابلم نہیں پاپا! کل میری سنی سے بات ہوئی تھی۔" اس نے زید کے دوست کا نام لیا۔ "زید اسی کے ساتھ ہے۔"

"او تھینکس گاڈ! وہ ٹھیک ہے۔" ناہید نے بے ساختہ شکر ادا کیا۔

"تمہاری بات ہوئی اس سے؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں' لیکن میں نے سنی کو بتا دیا تھا کہ میں آج اسے لینے آؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"اس کی ضرورت نہیں مما! میں لے آؤں گا اسے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

"کچھ الجھا الجھا لگ رہا ہے اور پریشان بھی۔"

"آپ پوچھیں نا آپ سے تو ہر بات کرتا ہے۔" ناہید نے اعجاز سے کہا۔

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر رہ گئے۔

"پتا نہیں میرے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ ایک پریشانی ختم ہوتی نہیں' دوسری آجاتی ہے۔" ان کی آواز بھرا گئی تو اعجاز صاحب کو انہیں تسلی دینی پڑی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ان کے انتظار میں بیٹھی ناہید بے تابی سے اٹھیں اور زید کے گلے لگ کر رونے لگیں۔

"یہ کیا طریقہ تھا زید! کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ کہاں چلے گئے تھے؟" انہوں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"تم جانتے ہو زید! ہم لوگوں کو ہمیشہ تمہاری وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کتنی مشکل سے لڑکی ڈھونڈی تھی تمہارے لیے' کتنے جھوٹ بول کر یہ شادی ہوئی۔ تمہیں اندازہ ہے؟" ناہید زیادہ دیر تک اپنا غصہ کنٹرول نہیں رکھ سکیں۔

"اور تم اس حد تک گر چکے ہو کہ تم نے ایک معصوم لڑکی کو یوں جانوروں کی طرح مارا؟ اس نے کیا کہا تھا تمہیں۔" اب کے اعجاز صاحب نے اپنا غصہ نکالا۔ زید مسلسل سر جھکائے بیٹھا تھا جبکہ تینوں کی سوالیہ نظریں اس پر جمی تھیں۔

"کچھ پوچھا ہے تم سے زید؟" اعجاز صاحب کی آواز غصے کے مارے اونچی ہو گئی تھی۔

"آئی ایم سوری پاپا! میں بالکل ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مما سے کہا تھا مجھے اب شادی نہیں کرنی' لیکن مما نے میری بات نہیں مانی۔ مجھے غصہ تھا اس لیے اس دن میں نے زیادہ ڈرنک کر لی تھی۔ لیکن میرا اس کو مارنے کا ارادہ نہیں تھا۔ بس وہ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ سر جھکا کر اتنی معصومیت سے بولا کہ ناہید زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکیں۔

"زید بیٹا! ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم نارمل زندگی گزارو۔ یہ جان لیوا چیزیں ہیں تم خود بھی جانتے ہو۔ میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔"

"میں سمجھتا ہوں مما! اور میں پرامس کرتا ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ اب ایسا نہ ہو' میں اسی لیے یہاں سے چلا گیا تھا۔"

"دیکھا میں نے کہا تھا نا زید ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے جتاتے ہوئے انداز میں اعجاز صاحب کو دیکھا۔

"اور دیکھو بیٹا۔ وہ لڑکی تمہاری بیوی ہے عورت پر ہاتھ کمزور مرد اٹھاتے ہیں۔"

"سوری پاپا! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"ویری گڈ! تمہاری پسند کا کھانا بنوایا ہے ابھی لگواتی ہوں۔ بلقیس۔" ساتھ ہی انہوں نے کام والی کو آواز دی۔

"جی۔" وہ بھاگنے والے انداز میں آئی تھی۔

"جاؤ تعبیر کو بلا کر لاؤ اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا بھی لگوا دو۔"

دستک دے کر بلقیس اندر داخل ہوئی۔

"آپ کو بڑی بی بی بلا رہی ہیں۔"

وہ "کیوں" کہتے کہتے رک گئی اور دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سر ہلا کر اسے لگا زمین اور آسمان گھوم گئے۔ اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ ضرار اسی کو دیکھ رہا تھا اس نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔

"تعبیر! دیکھو تو کون آیا ہے؟" اعجاز صاحب نے خوشی سے بتایا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کسی نے بھی کچھ نہ کہا ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے۔ سب ہی بڑے اچھے موڈ میں کھانا کھا رہے تھے سوائے اس کے اور ضرار کے' اس کی خاموشی کی وجہ تو وہ ڈر تھا جو اسے زید سے محسوس ہو رہا تھا' لیکن ضرار کی خاموشی کی وجہ پتا نہیں کیا تھی۔ اس دن کی نسبت وہ آج نارمل نظر آ رہا تھا۔ کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

وہ لان میں آ گئی۔ وہ کمرے میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ باہر کا موسم سرد تھا اور سردی اس کی ہڈیوں میں گھس رہی تھی' لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ آنکھیں بند کیے سردی کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی' جب ضرار کی آواز پر اس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا ضرار نے بغور اس کے کانپتے ہونٹوں کو دیکھا اور تیزی سے نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

"اندر جاؤ یہاں بہت سردی ہے۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" خود پر اس کا کنٹرول ختم ہو گیا۔ وہ رو پڑی۔ ضرار کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"کیا ہوا۔" ناہید بھی وہیں آ گئیں۔

"آنٹی! مجھے کمرے میں نہیں جانا مجھے ڈر لگتا ہے ان سے۔" اس کی بات پہ ناہید نے بڑے ضبط سے کام لیا تھا۔

"دیکھو تعبیر! وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہیں ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس کی اچھی بری باتوں کی عادت ڈالنی ہوگی تمہیں۔ بہر حال ابھی تم جاؤ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ وہ ڈرگز نہیں لے گا اور جب وہ ڈرگز نہیں لیتا تو ٹھیک رہتا ہے اور تمہیں خود پتا چل جائے گا' وہ کتنا اچھا ہے۔ چلو شاباش۔"

اسے پچکار کر اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اس کے کمرے کی طرف لے جانے لگیں اور اسے لگ رہا تھا اس کے قدموں سے جان نکل رہی ہے۔ دروازہ کھلتے ہی ان دونوں کی پہلی نظر زید پر پڑی تھی' جو بیڈ پر لیٹا ریموٹ سے چینل بدل رہا تھا۔

ان کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ساتھ ہی اس کی نظر تعبیر پر پڑی تھی۔

"لو سنبھالو اپنی بیوی کو' باہر کھڑی تھی اور تم سے ڈر رہی تھی۔" زید نے ماں کی بات سن کر تعبیر کی طرف دیکھا' جو مسلسل سر جھکائے ہوئے تھی۔

"زید! اب مجھے شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"جی مما!" ان کے کہنے پر وہ تابعداری سے بولا تو وہ مسکرا کر دروازہ بند کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ وہ دونوں اپنی جگہ پر بالکل خاموش تھے۔ اس خاموشی کو زید نے توڑا۔

"تعبیر!" اپنے نام پر اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہاں آؤ پلیز۔" اس نے ہاتھ سے اپنے قریب اشارہ کیا۔ تعبیر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"پلیز۔" اس نے پھر پلیز کہا تو وہ من من کے قدموں کے ساتھ چلتی اس سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے اس دن جو بھی کیا میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ پتا نہیں ایسا کیسے ہو گیا' لیکن میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر بولا اور ایسی شکل بنائی کہ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"تھینک یو۔ ٹی وی دیکھو گی۔" اس نے ریموٹ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے انکار کر دیا۔

"اچھا پلیز مائنڈ مت کرنا۔ میں بہت تھک گیا ہوں اور دوسرا میں میڈیسن لے رہا ہوں تو مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ میں سو جاؤں' تم مائنڈ تو نہیں کرو گی؟"

اس نے جلدی سے سر نفی میں ہلایا۔

"تھینک یو۔ تم واقعی بہت اچھی ہو۔" وہ ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر لیٹ گیا۔

تعبیر کو جب اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ کہ وہ سو گیا ہے تو وہ بیڈ کے بالکل کنارے پر چوکنے انداز میں لیٹ گئی۔ وہ اس کی اتنی بڑی اور اچانک تبدیلی پر بے حد حیران تھی۔ کیا آنے والا وقت اس کے لیے خوشیاں لانے والا ہے؟ سونے سے پہلے یہ اس کی آخری سوچ تھی اور اسی سوچ کا اثر تھا کہ صبح وہ دیر تک سوئی۔ اس نے پلٹ کر دوسری طرف نظر ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر ویسے ہی دیکھتی رہی جیسے کل اس کا آنا اور اس کی مہذبانہ گفتگو ایک خواب تھی۔ اس کی نظریں تکیے سے ہوتی ہوئی سائیڈ ٹیبل تک گئیں۔ اس کی گھڑی وہیں پڑی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آج اسے ناشتے کے لیے بھی کوئی بلانے نہیں آیا تھا۔ وہ خود ہی باہر آ گئی۔ کچن سے ناہید کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس کے سلام پر انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

"وعلیکم السلام!"

"سوری! مجھے آج دیر ہو گئی۔" وہ شرمندہ ہو کر بولی تو ناہید مسکرا دیں۔

"کوئی بات نہیں۔ تم ناشتا کر لو۔ بلقیس کو بتا دو جو تمہیں کھانا ہے۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئیں' لیکن وہ خود ہی اپنے لیے ڈبل روٹی اور چائے کا کپ لے کر ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی۔ یہاں سے لاؤنج کا منظر بالکل واضح تھا۔ جہاں بالکل سامنے ضرار بیٹھا تھا۔

"ناشتا لگواؤں تمہارے لیے۔" ناہید نے ضرار سے پوچھا تھا۔

"نہیں صرف چائے۔"

"کیا بات ہے ضرار! کوئی پریشانی ہے۔"

"کتنی مرتبہ آپ کو کہوں مما! مجھے کوئی پریشانی نہیں' پھر آپ ہر روز کیوں پوچھتی ہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"پریشانی نہیں تو پھر یہ کیا ہے کھانا ٹھیک طرح سے تم نہیں کھاتے' نیند تمہیں نہیں آتی۔ چڑچڑے ہو گئے ہو۔ تمہاری وجہ سے تو اس گھر میں رونق تھی۔"

"میں ٹھیک ہوں مما!" وہ اب دھیمی آواز میں بولا۔

"میں بس سوچ رہا ہوں آسٹریلیا واپس چلا جاؤں۔"

"کیوں۔" ناہید بے ساختہ بولیں۔ "اور وہ لڑکی جس کے لیے تم واپس آئے تھے وہ۔۔۔"

"میں نے اسے کھو دیا۔" اس کی آواز میں پتا نہیں کیا تھا' تعبیر نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا۔ کھونے کا درد تو وہ بھی جانتی تھی۔

"میں سمجھی نہیں۔" ناہید الجھ کر بولیں۔

"کچھ نہیں چھوڑیں۔ پاپا اور زید کہاں گئے ہیں۔"

"وہ دونوں بتا کر نہیں گئے' تم نے دیکھا زید میں کتنا چینج آیا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا شادی اس پر اچھا اثر ڈالے گی۔ اسے بھی شاید احساس ہو گیا ہے اپنی ذمہ داری کا' اسی لیے باقاعدہ اپنا ٹریٹمنٹ کروا رہا ہے۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر مجھے ضروری کام سے بھی جانا ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے قریب سے گزرنے پر تعبیر نے اس کی طرف دیکھا' لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے گزر گیا۔

☆ ☆ ☆

"تعبیر۔" اعجاز صاحب کے پکارنے پر وہ تیزی سے باہر نکلی۔

"جی انکل۔" اعجاز صاحب کے ساتھ زید، ناہید اور ضرار بیٹھے تھے۔

"یہاں آؤ بیٹا۔" وہ چلتی ہوئی ان کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ لو۔" انہوں نے ایک شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ زید تمہارے لیے لایا ہے۔" اس نے زید کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ اس سے زیادہ اعجاز صاحب خوش تھے کہ زید اس کے لیے گفٹ لایا ہے۔

"تھینک یو۔" اتنے عرصے میں وہ شاید پہلی بار مسکرائی تھی۔

"ویلکم۔" زید نے بھی مسکرا کر کہا۔ تب ہی گیٹ بیل ہوئی ضرار کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ تنویر صاحب اور شاہدہ بیگم تھے۔ وہ بے ساختہ کھڑی ہوئی۔ گود میں رکھا شاپر نیچے گر گیا۔ وہ اسی بے ساختگی کے ساتھ تنویر صاحب کی طرف بڑھی، ان کے گلے لگتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے خود وہ بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

"تعبیر! ماموں سے ہی ملتی رہو گی ممانی بھی تمہاری یہیں ہیں۔" شاہدہ نے بظاہر یہ بات مسکرا کر کی تھی، لیکن ان کے لہجے کی چبھن وہ سمجھتی تھی۔ تنویر ماموں سے محبت کا مظاہرہ انہیں پسند نہیں آیا تھا۔

ناہید انہیں یہاں دیکھ کر پریشان تھیں۔ انہیں امید ہی نہیں تھی کہ وہ اچانک یوں یہاں آجائیں گے۔ اوپر سے تعبیر کے آنسو۔

"کیسی ہو بیٹی۔" تنویر صاحب نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آج بھی ان کے چہرے پر وہی محبت تھی۔

"کمزور لگ رہی ہو؟"

"آپ بھی کیسی باتیں لے بیٹھے۔" شاہدہ نے مسکرا کر حاضرین پر نظر ڈال کر تنویر صاحب کو ٹوکا۔

"نئی نئی جگہ ہے۔ دل لگنے میں وقت تو لگتا ہے کیوں ناہید جی۔" شاہدہ نے بت بنی ناہید کو جیسے جگایا۔

"جی بالکل ہم تو بہت خیال رکھتے ہیں۔ پوچھ لیں تعبیر سے" کیوں بیٹا بتاؤ اپنے ماموں کو۔" ناہید کے کہنے پر اس نے بمشکل مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"تعبیر! مجھے تم سے اس لاپروائی کی امید نہیں تھی۔ تم ہنی مون پر گئیں تو بتا کر نہیں گئیں اور آ بھی گئی ہو تو بھی نہیں بتایا۔" تنویر صاحب کے شکوے پر اس نے حیرت سے انہیں دیکھا اور اسی حیران نظروں سے اس نے اعجاز صاحب ناہید اور زید کو دیکھا۔

"چھوڑیں تنویر! اب تعبیر کی اپنی زندگی ہے۔ وہ بچی نہیں جو ہر بات آپ کو بتا کر اور پوچھ کر کرے۔" ایک بار پھر شاہدہ بیگم نے لقمہ دیا تو وہ سمجھ گئی کہ ماموں کو یہاں آنے سے روکنے کے لیے ممانی نے کیا جھوٹ بولا ہوگا۔ تب ہی بلقیس ٹرالی گھسیٹتی ہوئی وہاں آئی۔ اس کے پیچھے ضرار تھا۔ یقیناً "اسے ہی مہمان نوازی کا خیال آیا ہوگا۔ باقی سب تو پریشان تھے کہ بات نہ کھل جائے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بچپن سے ہر زیادتی پر خاموش ہی رہی تھی۔ اب بھی اس نے یہی کیا تھا۔ "سب ٹھیک ہے" جیسی مسکان اس نے ہونٹوں پر سجالی۔ کل رات زید کے رویے نے اسے امید کا ایک سرا تو تھما دیا تھا۔

"گھر کب آؤ گی؟" جاتے ہوئے گیٹ کے قریب پہنچ کر تنویر صاحب نے تعبیر سے پوچھا۔ تعبیر نے جواب دینے کے بجائے شاہدہ بیگم کا چہرہ دیکھا تھا۔ ناہید کے اشارہ کرنے پر زید آگے آگیا۔

"انکل! آپ فکر نہ کریں۔ میں تعبیر کو لے کر آؤں گا۔" کہنے کے ساتھ اس نے تعبیر کو بازو کے گھیرے میں لیا۔ تعبیر کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ سب کے سامنے مزاحمت بھی نہیں کر سکی تھی۔ جب کہ شاہدہ بیگم جو توقع لے کر آئی تھیں، سب اس کے برعکس تھا۔ تعبیر تو عیش کر رہی تھی۔ انہوں نے بغور زید کو دیکھا جو بالکل نارمل تھا اور اس کے سلوک سے لگ رہا تھا، وہ تعبیر کے ساتھ اور تعبیر اس کے ساتھ بہت خوش ہے۔ واپسی پر تنویر صاحب پر سکون اور شاہدہ بے چین تھیں۔

☆ ☆ ☆

"سردیوں کی دھوپ کا اپنا ہی مزا ہے۔" ناہید نے سر اٹھا کر آسمان پر چمکتے سورج کو دیکھ کر کہا تو پاس بیٹھی تعبیر مسکرا دی۔

"میں نے کل تمہارے لیے شاپنگ کی تھی تمہیں پسند آئی؟"

"جی سب کپڑے بہت اچھے تھے۔"

"تو تم پہنتی کیوں نہیں؟" اب کہ ناہید کا لہجہ سنجیدہ تھا جس پر وہ گھبرا گئی۔

"پہنتی ہوں۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا۔ یہ سوٹ چار دفعہ تم پہن چکی ہو۔ پہلے کی بات اور تھی۔ زید تب گھر پر نہیں تھا۔ اب تو وہ آچکا ہے۔ شادی کو بمشکل ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے اور تم یوں رہتی ہو جیسے دس سال گزر چکے ہوں۔"

"جی۔" ناہید کے طویل لیکچر پر وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"سنو۔" ان کی سرگوشی پر وہ پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"زید ٹھیک ہے تمہارے ساتھ؟"

"جی ٹھیک ہیں۔"

"میرا مطلب ہے تم دونوں نارمل زندگی گزار رہے ہو نا لائیک۔۔۔ ہزبینڈ وائف؟" ان کا مطلب سمجھ کر تعبیر کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

"بھئی اس میں شرمانے والی کیا بات ہے، میں تمہاری ماں کی طرح ہوں۔" اس کا سر نفی میں ہل گیا۔

"کیا مطلب؟" ناہید کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئی تھیں۔

"آنٹی! ویسے تو وہ ٹھیک ہیں مجھ سے بات کرتے ہیں، لیکن ایسی کوئی بات نہیں جیسا آپ پوچھ رہی ہیں۔" وہ یوں شرمندگی سے بولی جیسے سارا قصور اس کا ہو۔

"پر کیوں، تم نے پوچھا؟"

"نہیں۔" اس کا سر پھر نفی میں ہلا۔

"احمق!" وہ غصے سے بولیں تو وہ مزید گھبرا گئی۔

"وہ کہتے ہیں ان کا ٹریٹمنٹ چل رہا ہے اور میڈیسن کی وجہ سے انہیں نیند آجاتی ہے۔"

ناہید نے بغور اس کا چہرہ دیکھا آیا کہ وہ معصوم ہے یا معصوم بن رہی ہے۔ اس کے چہرے پر سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

"ضرار۔" انہوں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ضرار کو آواز دی۔ ان کی آواز سن کر وہ اسی طرف آگیا تھا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

"ایئرپورٹ۔"

"کیوں؟"

"فرینڈ کو ریسیو کرنے۔"

"اچھا مجھے بھی شاپنگ پر جانا ہے مجھے ذرا مال تک ڈراپ کردو۔"

"اوکے۔" تب ہی اس کا موبائل بجا۔ وہ موبائل کان سے لگا کر بات کرنے لگا۔ تعبیر بالکل غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے لگی۔ سیاہ جینز، سیاہ ہائی نیک کے ساتھ ڈارک گلاسز، چھ فٹ سے نکلتا قد خوب صورت نقوش کا حامل وہ شخص بہت شاندار تھا۔

"کیا یہ شخص میری قسمت نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر مجھے اس گھر میں ہی آنا تھا تو زید کیوں ضرار کیوں نہیں۔" زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے لیے اللہ سے کوئی شکوہ کیا تھا اور شاید پہلی بار کوئی خواہش۔ لیکن سب لاحاصل تھا اس نے سر جھٹکا۔ "مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے" خود کو سرزنش کرنے کے بعد اس نے توبہ کی تھی۔ گہرا سانس لے کر اس نے سامنے دیکھا، وہ اسی کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ گلاسز کی وجہ سے وہ اندازہ نہیں کر سکی کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے یا کہیں اور۔ وہ کچھ گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

ان دونوں کے جاتے ہی اعجاز صاحب آگئے۔

"زید کہاں ہے؟"

"ان کا کوئی فون آیا تھا تو وہ باہر چلے گئے۔"

"تم نے پوچھا نہیں کس کا فون تھا۔" اس نے سر

نفی میں ہلایا۔

وہ خاموش ہو گئے پھر اس کا چہرہ دیکھنے لگے جو اپنے دھیان میں سامنے رکھے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

"پتا ہے تعبیر! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ دنیا میں ابھی معصومیت باقی ہے۔" اپنی تعریف پر وہ شرما کر سر جھکا گئی۔

"پہلے تو نہیں لیکن اب دل کرتا ہے تمہارے جیسی ہماری بھی ایک بیٹی ہوتی۔"

"میں آپ کی بیٹی ہی ہوں انکل!"

"ہاں بیٹا میں مانتا ہوں۔ بیٹی ہو تب ہی تو ہماری عزت رکھ لی تم نے اپنے ماموں کے سامنے' ورنہ کوئی اور ہوتا تو تماشا لگ جاتا ہمارا۔ لیکن کل جو تنویر صاحب کہہ رہے تھے ہنی مون پر جانے کا' کیا ایسا تم نے ان سے کہا تھا۔" اس نے سر تیزی سے نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔ میری ممانی نے کیوں کہ وہ نہیں چاہتیں کہ میں ماموں کو کچھ بتاؤں۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں اور نہ چاہتی ہیں کہ میں ان کے گھر میں رہوں۔" آج کافی عرصے بعد اسے کوئی ایسا ملا تھا جس کے سامنے وہ اپنی بھڑاس نکال سکے۔

"میں حیران ہوں کہ کیا کوئی ایسا ہو سکتا ہے جو تمہیں ناپسند کرے۔" ان کی بات سن کر وہ خود اذیتی کے تحت مسکرا دی تھی۔

"آپ سے ایک بات پوچھوں؟" اس نے بڑے جھجکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"ہاں بیٹا پوچھو' بلا جھجک پوچھو۔"

"انکل! زید ایسے کیوں ہیں؟" اس کے سوال پر اعجاز صاحب نے گہرا سانس لیا تھا۔

"تمہارے اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں بیٹا! میں آج تک خود سمجھ نہیں سکا وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟ ہماری تربیت میں اور ہماری محبت میں کیا کمی رہ گئی تھی۔" ان کا لہجہ رنجیدہ ہو گیا تھا۔

"بچپن میں وہ بہت شرارتی تھا' لیکن بد تمیز نہیں۔ تمہاری آنٹی کو شروع سے ہی اپنی پارٹیز بہت عزیز تھیں۔ ضرار اور زید کا زیادہ وقت میڈ کے ساتھ گزرتا۔ ناہید کو شروع سے ہی ضرار کی نسبت زید سے زیادہ پیار تھا۔ بچپن کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے لے کر جوانی کی بڑی بڑی غلطیوں پر وہ پردہ ڈالتی رہی۔ اس کی بے جا ڈھیل سے زید کو اتنی جرأت ملی تھی۔ اس کے برعکس ضرار نے کبھی کوئی حد پار نہیں کی۔ اس نے ڈرگز لینی شروع کر دی۔ لیکن ہمارے علم میں یہ بات نہیں تھی' لیکن یہ پتا تھا کہ اس کی کمپنی اچھی نہیں اسی لیے ہم نے اسے پڑھنے کے لیے امریکا بھیج دیا تو صحیح معنوں میں آزادی مل گئی۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن جب سب بیکار جانے لگا تو ہم نے اس کی شادی اس لڑکی سے کروا دی جس کے ساتھ وہ ان دنوں رہ رہا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد زید واپس آ گیا کیوں کہ وہ لڑکی اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی تھی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے تھے۔

"واپس آ کر زید بہت ڈپریس رہا۔ ہم اس کو سائیکالوجسٹ کے پاس لے جانے لگے تب ہی مختلف سیشن کے بعد ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے کسی اچھی لڑکی سے۔ وہ ہی اپنی محبت اور خلوص سے اسے سدھار سکتی ہے۔"

بات مکمل کر کے وہ گہرے سانس لینے لگے جیسے طویل مسافت طے کر کے آئے ہوں اور تعبیر کو اپنی قسمت پر رونا نہیں ہنسی آ رہی تھی۔ اسے یوں بالکل خاموش دیکھ کر اعجاز صاحب کو بہت دکھ ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں تعبیر! یہ سب باتیں بہت تکلیف دہ ہیں' زید کی شادی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور نہ کبھی ہمارے گھر میں ذکر ہوا ہے اس بات کا' لیکن میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تمہیں ہر بات کا علم ہونا چاہیے۔"

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔

"لیکن میری تم سے گزارش ہے تعبیر! تم اس رشتے کو نبھانا۔ تم ہماری آخری امید ہو۔" وہ اب بھی خاموش تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر کھڑے ہو گئے جبکہ وہ یونہی دونوں ہاتھ گود میں رکھے کتنی دیر تک ساکت بیٹھی رہی۔

"کیا زید کے دل میں ابھی تک اس لڑکی کی محبت ہے۔ اسی لیے وہ مجھے بیوی کی جگہ دینے کو تیار نہیں' مجھے زندگی کمپرومائز کے تحت گزارنی ہے' لیکن کیا میں اتنی ہمت رکھتی ہوں کہ ساری زندگی بغیر محبت کے گزار دوں؟ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو تعبیر!" اس کے سوال پر اس کے اندر سے جواب آیا تھا۔ کسی کی زندگی میں ان چاہا بن کر رہنا بہت اذیت ناک ہے' لیکن اس سے زیادہ اذیت ناک یہ بات ہے کہ وہ شخص جو اس کا شوہر ہو' وہ کسی اور کو چاہتا ہو۔ وہ اس کی زندگی کا حصہ تھی اور اب تک اس کی یادوں کا حصہ ہے۔

اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

"تعبیر!" زید آواز دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"جی۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" اس نے حیرت سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔

"جی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تو پھر موڈ آف ہے۔" تعبیر نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ "چلو تمہارا موڈ ٹھیک کرتے ہیں۔" وہ وارڈ روب میں سے کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"جانا کہاں ہے؟"

"تمہارے ماموں کی طرف۔" اب کہ ہونے والی حیرانی پہلے سے بڑھ کر تھی۔

"پاپا کہہ رہے تھے تم کافی اداس ہو تمہیں باہر لے جاؤں۔" اور تعبیر نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"یہ خیال بھی انکل کو ہی آیا تھا۔"

"چلو اب سوچنا بعد میں جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ سر ہلا کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی۔ آنٹی کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے اس نے ایک سوٹ کا انتخاب کیا۔ سوٹ کی مناسبت سے ہلکی پھلکی جیولری کے ساتھ ——— وہ بالکل تیار تھی۔

"تم ایسے جاؤ گی؟" اسے سر سے پیر تک دیکھ کر زید نے پوچھا تھا تو وہ بے اختیار مڑ کر آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔

"تم فرسٹ ٹائم انکل کی طرف جا رہی ہو اتنی سادگی سے جاؤ گی تو انہیں لگے گا ہم تمہارا خیال نہیں رکھتے۔ تمہاری شادی کی جیولری کہاں ہے؟"

"آنٹی کے پاس ہے۔"

"تمہاری جیولری امی کے پاس کیا کر رہی ہے؟" وہ ناراضی سے بولا جیسے اس کو برا لگا ہو۔ اب وہ کیا کہتی کہ انہوں نے دو دن بعد ہی سارا زیور اس سے لے لیا تھا۔

"میں مما سے لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں۔" تعبیر نے بے اختیار ٹوکا۔

"کیوں۔" وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آنٹی کو لگے گا کہ شاید میں نے کہا ہے۔"

"تو کیا فرق پڑتا ہے تمہارا زیور ہے تو تمہارے پاس ہونا چاہیے۔"

"نہیں میں خود لے کر آتی ہوں۔" مزید کسی معرکے سے بچنے کے لیے خود ہی ذلیل ہونے چل دی۔ دروازہ کھٹکھٹا کر وہ اندر داخل ہوئی تو کمرے میں ناہید کے علاوہ ضرار بھی موجود تھا' وہ جھجک کر وہیں رک گئی۔

"آنٹی! زید کہہ رہے ہیں ماموں کے گھر جانا ہے۔"

"اچھا۔" انہوں نے اچھا پر زور دے کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" ان کے کہنے پر وہ ہاتھ مسلتی ہوئی وہیں کھڑی رہی۔

"آنٹی! کچھ جیولری چاہیے تھی۔ زید کہہ رہے ہیں جیولری پہن کر جاؤ۔"

"زید نے کہا ہے؟" ناہید کے ساتھ ساتھ ضرار نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

"جی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ ناہید نے ضرار کی طرف دیکھا اور اٹھ کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گئیں۔ انہوں نے تین ڈبے اس کی طرف بڑھائے۔

"یہ ٹھیک ہے آنٹی!" اس نے ایک ڈبا لے کر باقی دو واپس کر دیئے۔ کمرے میں داخل ہوئی تو زید اس کا منتظر تھا اس کی نظریں سیدھی ہاتھ پر گئیں۔

"بس یہ۔" اس نے ڈبا کھول کر سوالیہ نظروں سے

اسے دیکھا۔

"جی باقی کافی وزنی تھے اس لیے میں نے واپس کردیے۔" زید نے ایک سنجیدہ نظر اس پر ڈالی۔

"یہ پہن کر آجاؤ میں گاڑی میں ویٹ کررہا ہوں۔" وہ اپنا موبائل لے کر باہر نکل گیا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ خاموش تھا۔ تعبیر نے دو تین بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی، جس کا جواب ہوں ہاں میں آیا تھا۔ اس نے گاڑی گیس اسٹیشن پر روکی اور باہر نکل گیا۔ تعبیر نے اسے کسی سے بات کرتے دیکھا اور کچھ دیر بعد وہ اسی شخص کے ساتھ کار کی طرف آیا تھا۔

"یہ میری وائف تعبیر اور تعبیر یہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے نجم۔" زید کے تعارف کروانے پر تعبیر نے اس کے دوست کی طرف دیکھا، جو بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں کچھ دور جا کر بات کرنے لگے۔ زید کے دوست کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں اس کی نظروں میں کیا تھا کہ تعبیر نے غیر محسوس طریقے سے رخ موڑنے کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بائیں رخسار پر رکھ کر اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔ زید کے آنے پر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

گیٹ ثمرین نے کھولا تھا اور اس کو دیکھتے ہی وہ بے ساختہ چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔

"بدتمیز لڑکی! تمہاری کیا دنیا سے نرالی شادی ہوئی ہے کوئی یوں بھی بھول جاتا ہے۔" وہ اسی طرح اس سے لپٹے ڈانٹنے والے انداز میں شکایتیں کررہی تھی۔

اس نے الگ ہو کر اسے آنکھوں سے پیچھے کھڑے زید کی طرف اشارہ کیا اور زید پر نظر پڑتے ہی ثمرین ایک پل کے لیے شرمندہ ہوئی اور اگلے ہی پل ہنس پڑی۔

"سوری زید بھائی! میں تعبیر کو دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ سوری! کیسے ہیں آپ اور پلیز آپ لوگ چلیں اندر" ماموں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ ممانی بھی کافی پیار سے ملی تھیں اور یہی غنیمت تھا۔

وہ پہلی بار زید کے ساتھ آئی تھی تو ماموں اور ثمرین کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز نیمل پر چن دیں۔

"زید بھائی آپ بیٹھیں پاپا کے پاس ہم ذرا آتے ہیں۔" ثمرین زید سے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" ثمرین نے پیار سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ ہنی مون پر تم لوگ کہاں گئے تھے اور میں تم سے سخت ناراض تھی بتا کر بھی نہیں گئیں۔ پتا ہے پاپا کتنے پریشان تھے۔" وہ جو اس کے ہنی مون کے سوال پر پریشان ہوگئی تھی کہ اسے کیا بتائے کہاں گئی تھی اس کے اگلے سوال پر اس نے گہرا سانس لیا۔

"سوری! میری غلطی ہے مجھے بتا کر جانا چاہیے تھا' لیکن بس جلدی میں بتا نہیں سکی خیر! تم چھوڑو یہ بتاؤ یہاں سب ٹھیک ہے۔"

"ہاں اب تو سب ٹھیک ہے۔" ثمرین کے چہرے پر مسکراہٹ اطمینان بخش تھی۔

"فہد سے میری بات ہوتی ہے۔ وہ اب میرے ساتھ بالکل پہلے جیسا ہے تم نے صحیح کہا تھا' وہ شاید مجھے تنگ کررہا تھا' ہاں لیکن اسے تمہاری شادی کا پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہورہا تھا اور ٹھیک ہے نا اس کا ناراض ہونا بنتا بھی ہے کسی نے اس کو نہیں بتایا تھا۔"

"ہوں۔" وہ سرہلا کر رہ گئی۔

"اچھا تم کو ایک منٹ بیٹھو میں آتی ہوں۔" ثمرین کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی تو وہ حسرت سے ان در و دیوار کو دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں لو بات کرو۔" ثمرین کے فون بڑھانے پر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"فہد کا فون ہے۔" اور اس کا کلیجہ اچھل کر جیسے اس کے حلق میں آگیا۔

"ارے پکڑو نا۔" اس کے یونہی منہ دیکھنے پر ثمرین نے ٹوکا تو اس نے دھڑکتے دل سے فون پکڑ کر کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو۔" اس کے ہیلو کے جواب میں دوسری طرف مکمل خاموشی تھی' لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ دوسری طرف سن رہا ہے۔

"سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں' تمہارے اس کارنامے پر تالیاں بجاؤں یا تھپڑوں کے ساتھ تمہارا منہ توڑ دوں؟" کچھ دیر بعد اس کی سنجیدہ لیکن کرخت آواز سنائی دی تو تعبیر نے بے ساختہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ ساتھ ہی اس نے ثمرین کی طرف دیکھا جو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ میرا انتظار کرنا۔ ابھی مجھے گئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ اگر کسی اور کو دل میں بسایا ہوا تھا تو مجھ سے پیار کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی' کہہ دیتیں کہ تمہارے نزدیک دولت پہلے ہے اور مجھے بھی اندازہ ہونا چاہیے تھا جس لڑکی نے ساری عمر کچھ دیکھا نہ ہو' وہ تو دولت کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے کسی بھی حد تک گرسکتی ہے۔" تعبیر نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو دبا رکھا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ تم نے شادی کرلی تو تم خوش رہوگی۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں خوش نہیں تو اللہ کرے تم بھی خوش نہ رہو۔ برباد ہوجاؤ اور اگر ایسا نہ ہوا نا تعبیر! تو میں خود تمہیں برباد کردوں گا۔" مزید سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے فون بند کردیا۔ اس کے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔

"ہوگئی بات۔" ثمرین نے اس کے ہاتھ سے فون لیتے ہوئے پوچھا' لیکن وہ خاموش رہی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"مبارک باد دے رہا تھا۔" وہ کہہ کر کھڑی ہوگئی۔

"کہاں جارہی ہو؟" ثمرین نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"گھر جانا ہے۔ زید کو کام بھی ہے اور آنٹی نے بھی کہا تھا جلدی آجانا۔" وہ جلدی جلدی بولتی اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔

"اتنے دنوں بعد آئی ہو' مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔" ثمرین اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"میں پھر آؤں گی ثمرین! ابھی مجھے جانا ہے۔" بمشکل مسکرا کر اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور تیزی سے چلتی ہوئی باہر آئی۔

"چلیں۔" اس کے کہنے پر زید نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بیٹا! تمہاری ممانی نے کھانا بنالیا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔" تنویر صاحب کھڑے ہوگئے تھے۔

"نہیں ماموں! پھر کبھی ابھی جانا ہے۔" زید نے غور سے اسے دیکھا۔

"او کے انکل! ہم واقعی لیٹ ہورہے ہیں پھر جلد ہی دوبارہ آپ سے ملاقات ہوگی۔" وہ تنویر صاحب سے ہاتھ ملا رہا تھا' لیکن وہ کسی سے ملے بغیر باہر نکل آئی۔ تنویر صاحب کے ساتھ ثمرین اور شاہدہ نے بھی حیرت سے اس کے رویے کو دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" کار ڈرائیو کرتے ہوئے زید نے گردن موڑ کر تعبیر سے پوچھا جو مسلسل گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔

"ہوں۔" وہ آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش میں اتنا ہی بول سکی۔ زید نے پھر سارا راستہ اس سے بات نہیں کی۔ اسے گھر چھوڑ کر زید خود کہیں چلا گیا تھا اور اس نے شکر کیا تھا کہ اسے مزید سوالوں کے جواب نہیں دینے ہوں گے۔

اپنے کمرے میں جاتے ہی خود پر بٹھائے ضبط کے پہرے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ کم از کم فہد سے اسے یہ امید نہیں تھی۔ اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ کم از کم وہ تو سمجھتا' لیکن وہ بھی دوسروں کی بتائی ہوئی کہانی پر یقین کرکے بیٹھ گیا۔

"کیا میں دولت کی بھوکی تھی؟ تم کیا مجھے برباد کروگے' میں تو پہلے سے برباد ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔

☼ ☼ ☼

"یار! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اتنی جلدی کیسے اتنی بڑی رقم کا انتظام کروں گا۔" یہ آواز

یقیناً" زید کی تھی۔ وہ وہیں رک گیا۔

"او کے! میں جانتا ہوں میری غلطی ہے، لیکن پلیز کچھ تو مہلت دو نا۔ میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔ پہلے تو تمہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ یہ دو دن میں تمہیں کیا ایمرجنسی ہوگئی؟" زید کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔

"کیا؟" زید چیخا تھا۔

"تم جانتے ہو کیا بکواس کر رہے ہو۔ بھاڑ میں جاؤ۔" ضرار دو قدم آگے بڑھا تو زید اضطرابی انداز میں ٹیرس پر چکر لگا رہا تھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے زید نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی ضرار نے تیزی سے سگریٹ اس کے ہونٹوں سے نکال کر دور پھینکی۔ ایک لمحے کے لیے زید سمجھ ہی نہیں سکا، لیکن ضرار پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر غصہ دکھائی دینے لگا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ ضرار سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ میں تم سے بھی پوچھ سکتا ہوں یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اس کا اشارہ سگریٹ کی طرف تھا۔

"میری مرضی میں جو چاہوں کروں تم میرے باپ بننے کی کوشش نہ کرو۔" زید نے بڑی بدلحاظی سے جواب دیا تھا۔

"اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو علاج کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرار میں نے کہا نا تم میرے معاملے سے دور رہو۔ میری مرضی میں جو چاہے کروں۔" اب کہ وہ چیخ کر بولا اور پاس پڑی کرسی کو ٹھوکر مار کر تیزی سے نکل گیا۔ جبکہ ضرار ماتھے پر بل ڈالے کتنی دیر تک وہیں کھڑا اس کے رویے اور ٹیلی فون کال کے بارے میں سوچتا رہا۔

☼ ☼ ☼

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کتنی دیر تک وہ غائب الدماغی سے چھت کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں درد کر رہی تھیں اسے یاد آیا کہ وہ رات کو کافی دیر تک روتی رہی تھی۔ کیوں؟ اس نے سر گھما کر اپنے دائیں طرف دیکھا زید نہیں تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ رات آیا نہیں تھا اور بے شکن بستر ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ باہر آئی تو کچن سے ناہید اور بلقیس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے لان میں آکر کرسی کے بجائے گھاس پر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اپنے قریب بھاری آواز سن کر وہ اچھل پڑی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ضرار حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں پر زور ڈال کر اٹھی اور سر جھکا کر مجرموں کی طرح کھڑی ہوگئی جیسے یہاں بیٹھ کر اس نے بہت بڑی غلطی کی ہو۔ ضرار نے بغور اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔

"تم روتی رہی ہو؟" اس کا پوچھنے کا انداز بے ساختہ تھا۔ تعبیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ سر جھکا کر سر نفی میں ہلایا۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"جی۔" اسے اب اس کے سوالوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"زید نے کچھ کہا؟" اب کہ انداز کھوجتا ہوا تھا۔ تعبیر نے اب غور سے اس کی طرف دیکھا، وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔

"نہیں"

"زید کہاں ہے؟" وہ شاید اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"وہ کل رات سے گھر نہیں آئے۔"

"او۔" اس کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکڑے، ۔اس نے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف مڑ گیا اور اگلے ہی پل اس کی گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔ وہ دوبارہ اسی انداز میں بیٹھ گئی۔

"باجی کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔" بلقیس پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"زید بھائی آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"زید آگئے۔" اس نے حیرت سے بلقیس کو دیکھا اور اسی حیرانی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھی۔

"کہاں تھیں تم۔" کاریڈور میں ہی اس کی ملاقات ناہید سے ہوگئی۔

"لان میں تھی۔"

"تم نے بتایا کیوں نہیں زید رات کو گھر نہیں آیا؟" وہ غصے سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں وہ خاموش رہی کیا جواب دیتی۔

"جاؤ پوچھو کہاں تھا وہ۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں، جبکہ وہ ڈھیلے قدموں سے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ سامنے ہی بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" وہ پریشانی سے دو قدم آگے بڑھی۔

"ہوں۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا اور سر دوبارہ بیڈ پر رکھ دیا۔

"رات کو آپ کہاں تھے؟" وہ مضطرب انداز میں بیڈ کے قریب کھڑی ہوگئی۔

"دوست کی طرف تھا۔"

"آپ کو کم از کم ایک فون تو کر دینا چاہیے تھا۔ ہم کتنا پریشان تھے۔" زید نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"تم پریشان تھیں۔" اس کے کہنے پر تعبیر نے غور سے اسے دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہاں آؤ تعبیر!" تعبیر خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ زید نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے،

"تم بہت اچھی ہو تعبیر!" تعبیر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور یہ خوشی کے آنسو نہیں ۔ دکھ کے تھے۔

"تو پھر یہ درست ہے کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے۔"

"سوری میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں وہ خوشی نہیں دے سکا جو تم ڈیزرو کرتی ہو، لیکن اب میں کوشش کروں گا، لیکن ابھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"جی۔" وہ کہنا چاہتی تھی وہ اس کی کیا مدد کر سکتی ہے، لیکن وہ جی ہی کہہ سکی۔ زید نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر اضطرابی انداز میں ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔

"مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" وہ کہنے کے بعد تعبیر کی شکل دیکھنے لگا، لیکن اس کے چہرے سے اسے یہی اندازہ ہوا کہ وہ اس کا مطلب نہیں سمجھی۔

"کیا تم مجھے پیسے دے سکتی ہو؟"

"کتنے چاہئیں آپ کو۔" اس نے ذہن میں حساب کتاب لگانے کے بعد پوچھا۔

"چالیس، پچاس لاکھ"

"جی۔" تعبیر کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

"چالیس پچاس لاکھ۔ میرے پاس اتنے زیادہ روپے نہیں۔"

"تمہارا زیور۔"

"وہ آنٹی کے پاس ہے، لیکن پھر بھی وہ چالیس پچاس کے نہیں ہوں گے۔" زید کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ "لیکن اتنے زیادہ روپے کیوں چاہئیں آپ کو؟"

"بس چاہئیں۔" وہ ایک دم پریشان ہوگیا تھا۔

"آپ انکل آنٹی سے بات کیوں نہیں کرتے۔"

"پاگل ہو۔" وہ ایک دم غصے سے ٹوک گیا۔ "اور تم بھی ان سے بالکل ذکر مت کرنا۔"

"لیکن۔"

"بحث نہیں کرو مجھ سے۔" وہ غصے سے بولتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تعبیر بھی پریشانی سے اسے دیکھنے لگی پھر وہ ایک دم رک کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"کیا تم اپنے ماموں سے بھی نہیں لے سکتیں؟" تعبیر مزید پریشان ہوگئی۔

"زید! ماموں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوں گے اور میں ان سے لے بھی نہیں سکتی۔ میرے پاس دو تین لاکھ ہوں گے وہ آپ لے لیں۔"

"بھکاری سمجھ رکھا ہے مجھے۔" وہ ایک دم پھٹ

پڑا۔

"مجھے زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا تھا' لیکن بڑبڑاہٹ اتنی اونچی تھی کہ تعبیر نے صاف سنی تھی۔

"اب تمہاری قسمت۔" وہ تعبیر کی طرف دیکھ کر عجیب انداز میں بولا اور مزید کچھ سنے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

"زید!" وہ تقریباً" بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے گئی لیکن لاؤنج میں پہنچ کر رک گئی۔ لاؤنج میں ناہید اور اعجاز صاحب کے ساتھ ضرار اور ایک لڑکی اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس نے تیزی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر خود کو نارمل کیا تھا۔

"اس دن میں اسارہ کو لینے ائرپورٹ گیا تھا۔" ضرار' ناہید کو اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"تم نے پہلے کبھی اسارہ کا ذکر نہیں کیا۔" ناہید نے مسکرا کر اسارہ کو دیکھا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا آنٹی! ضرار نے میرا ذکر نہیں کیا ہوگا۔" اسارہ نے مصنوعی ناراضی سے ضرار کو دیکھا۔

"یہ میں ہی ہوں جو اس کے پیچھے پاکستان تک آگئی۔ یہ تو میری میلز کا جواب بھی بمشکل دیتا ہے۔" اسارہ کے شکوے پر اعجاز صاحب اور ناہید نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اعجاز صاحب کی نظر پہلے تعبیر پر پڑی تھی۔

"تعبیر آجاؤ بیٹا' وہاں کیوں کھڑی ہو۔" اعجاز صاحب کے کہنے پر وہ بمشکل مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

"یہ تعبیر ہے ہماری بیٹی' زید کی بیوی۔"

"ہیلو۔" اسارہ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"اور تعبیر! یہ اسارہ ہے ضرار کی فرینڈ' آسٹریلیا سے آئی ہے۔" اعجاز صاحب نے تعارف کی رسم نبھائی تھی۔ بلقیس کے چائے لگانے کے دوران وہاں خاموشی چھائی رہی۔

"اور اسارہ تم کیا کرتی ہو۔"

"آنٹی میں لاء کر رہی ہوں۔"

"ویری گڈ۔" اعجاز صاحب متاثر ہوئے۔

"اور تمہارے گھر میں کون کون ہے؟"

"میں ممی اور ڈیڈی بس۔" اس دوران تعبیر بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اتنی خوب صورت کہ کوئی بھی اس کو دیکھے تو دیکھتا رہے۔ اوپر سے اس کو پہننے اوڑھنے کا طریقہ آتا تھا۔ اس نے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ضرار کو دیکھا جو چائے پیتے ہوئے اس کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگا رہی تھی' جب اسارہ کے قہقہے پر اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔

"اسارہ! تم کہیں انگیجڈ تو نہیں۔" ناہید کے پوچھنے پر اس نے قہقہہ لگایا تھا۔

"نہیں آنٹی!"

"پلیز مما! یہ کیسے سوال پوچھ رہی ہیں آپ' میں اسارہ کو یہاں آپ سے ——— ملوانے لایا ہوں نہ کہ اس لیے کہ آپ انٹرویو شروع کردیں۔"

"ارے بابا انٹرویو کب ہے' ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ اسارہ بیٹا تم یہیں رہو ہماری طرف۔ ہمیں مہمان نوازی کا موقع دو۔"

"تھینک یو آنٹی! لیکن میں ہوٹل میں کمرا لے چکی ہوں اور آنٹی! میں نے ضرار سے کہا تھا جب میں پاکستان آؤں گی تو تمہارے گھر رکوں گی' لیکن اس نے منع کردیا۔ آپ سب تو اتنے اچھے ہیں۔ یہ کس پر گیا ہے۔" اس کی بات پر سب ہنس پڑے تھے۔

"چلو اٹھو باتیں کر کر کے تمہارا پیٹ ——— بھر گیا ہوگا۔" ضرار کھڑا ہوگیا تھا۔

"ارے کہاں جارہے ہو' میں کھانا لگوا رہی ہوں۔" "نہیں اٹھتا دیکھ کر ناہید نے ٹوکا۔

"نہیں مما! اسارہ کو کچھ شاپنگ کرنی ہے اور ایک دو جگہ وزٹ کرنا ہے۔"

"آنٹی! میں کچھ دن یہیں ہوں۔ آؤں گی کھانا بھی کھاؤں گی۔" وہ ناہید سے گلے ملتے ہوئے بولی۔ اعجاز صاحب سے مل کر وہ تعبیر کی طرف آئی۔

"تم بہت کم بولتی ہو۔" اسارہ کی بات پر وہ بس مسکرا دی۔

"بٹ یو آر سو کیوٹ۔" اسارہ نے اس کے گال پر چٹکی کاٹی۔ وہ دونوں چلے گئے۔

"اعجاز! آپ نے دیکھا کتنی خوب صورت لڑکی ہے اور کتنی ہنس مکھ اور ملنسار لڑکی ہے۔"

"ہاں لڑکی واقعی بہت اچھی ہے۔" اعجاز صاحب نے ناہید کی بات کی تائید کی۔

"ضرار کے ساتھ سوٹ کرے گی۔" وہ خوشی سے بولیں۔

"پہلے ضرار سے پوچھنا پڑے گا۔"

"مجھے تو لگتا ہے ضرار بھی اسے پسند کرتا ہے میرا خیال ہے یہ وہی لڑکی ہے جس سے ضرار شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"ہوں۔" اعجاز صاحب نے سرہلایا۔

"میں ضرار سے بات کرتی ہوں۔ اگر وہ ہاں کہتا ہے تو اسارہ کے والدین سے مل کر بات طے کرلیتے ہیں۔ گھر میں رونق ہوجائے گی۔" تعبیر نے بے ساختہ ناہید کی طرف دیکھا جو اپنی ہی دھن میں بول رہی تھیں' جبکہ اعجاز صاحب تعبیر کو دیکھ رہے تھے جو گم صم ہوگئی تھی۔

"تعبیر۔"

"جی انکل۔" وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہیں اسارہ کیسی لگی۔"

"بہت اچھی اور بہت خوب صورت۔" اس نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

"چلو ضرار کی بیوی کے طور پر سب نے اسارہ کو ون کردیا۔" ناہید جوش سے بولیں۔ اب انہیں ضرار کی رضامندی کا انتظار تھا۔

"زید کچھ زیادہ لیٹ نہیں آنے لگا۔" ناہید نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا جہاں رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"تم نے پوچھا نہیں تھا تعبیر!"

"آنٹی وہ مجھے بتا کر نہیں جاتے۔"

"تم اس کی بیوی ہو تعبیر! یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ کتنی دفعہ تمہیں بتاؤں یہ بات۔" وہ غصے سے بولیں۔

"ناہید! کیوں ہر وقت تم تعبیر کو بلیم کرتی ہو۔ زید کوئی بچہ نہیں جس کی وہ ہر وقت نگرانی کرے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بتا کر جائے۔ وہ پریشان نہیں ہوتی کیا۔" اعجاز کا انداز ڈپٹنے والا تھا۔ تب ہی باہر کار رکنے کی آواز آئی تھی۔

"میرا خیال ہے زید ہوگا۔" ناہید کے کہنے پر وہ دونوں بھی دروازے کی طرف دیکھنے لگے' لیکن اندر آنے والا زید نہیں ضرار تھا۔

"آپ لوگ سوئے نہیں؟"

"بس یونہی ٹی وی دیکھ رہے تھے۔" اعجاز صاحب کے کہنے پر وہ سرہلاتا ہوا ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "کھانا لگواؤں تمہارے لیے۔"

"نہیں۔ کھانا کھا کر آیا ہوں۔" وہ ہاتھ پر بندھی گھڑی اتارتے ہوئے بولا۔

"ضرار تم نے پہلے کبھی اسارہ کے بارے میں نہیں بتایا۔" وہ ناہید کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بتاتا؟"

"یہی کہ وہ اتنی خوب صورت ہے' اتنی اچھی ہے اور سب سے بڑی بات تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔" ضرار کا سنجیدہ چہرہ مزید سخت ہوگیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ صرف میری فرینڈ ہے جسٹ فرینڈ۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"لیکن یہ کس نے کہا کہ دوست سے شادی نہیں ہوسکتی۔"

"مما! آپ شادی کے علاوہ کسی اور ٹاپک پر بات نہیں کرسکتیں؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"ضرار! شادی کی عمر ہوتی ہے۔ زید تم سے چھوٹا ہے۔ اس کی شادی ہوگئی۔ اب تم ہو تو تم سے کہوں گی

نا اور پھر میں نے محسوس کیا ہے اسمارہ تمہیں پسند کرتی ہے اور مجھے لگتا ہے تم اس کے ساتھ خوش رہو گے۔"

"مما! اسمارہ اچھی نہیں، بہت اچھی ہے، لیکن وہ وہ لڑکی نہیں جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہہ کر سر جھٹکا۔

"اور پلیز! آئندہ میری شادی کی بات نہ کریں کیوں کہ مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا جبکہ اعجاز اور ناہید کے ساتھ تعبیر نے بھی حیرت سے اس کے دوٹوک انداز کو سنا تھا۔

★ ★ ★

وہ جب کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر وہ مسکرایا۔

"تم نے بھی مما کی طرح مجھے ڈانٹنا ہوگا۔ ڈانٹ لو۔ ابھی میرا موڈ ہے ڈانٹ سننے کا۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کے جوتے اتارنے لگا۔ وہ ابھی ناہید بیگم سے دیر سے گھر آنے پر ڈانٹ کھا کر آرہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ جوتے اتار کر وہ لیٹ گیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ناراض ہو۔" تعبیر خاموش رہی۔ "اچھا بابا سوری! آئندہ ایسا نہیں ہوگا دوستوں کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔ بہت تھک گیا ہوں۔" وہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"اچھا سنو! کل تیار رہنا شام میں، میرے فرینڈ کی طرف پارٹی ہے اور بہت اچھی طرح تیار ہونا۔ اس دن کی طرح نہیں، جب ماموں کے گھر گئی تھیں۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے سر گھما کر دیکھا وہ سو چکا تھا۔ اسے رشک آیا تھا یہاں اسے رات گزر جاتی تھی نیند نہیں آتی تھی اور کہاں وہ لیٹتے ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آف کی اور ہمیشہ کی طرح کونے میں آکر لیٹ گئی۔

وہ صبح اسے ایک بار پھر دعوت کی یاددہانی کروا کر خود چلا گیا۔ دو گھنٹے تو اسے اپنے کپڑے منتخب کرنے میں لگے تھے۔ جتنا زید نے اس کے تیار ہونے پر زور دیا تھا اس سے اندازہ ہوگیا تھا یہ پارٹی خاص ہے۔ اس نے گلابی فراک نکالی۔ جس پر سفید موتیوں کا کام تھا۔ جیولری پہن کر اس نے اپنے بالوں میں برش کیا۔ میک اپ کے بعد اس نے غور سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ تب ہی دروازے پر دستک دے کر بلقیس اندر داخل ہوئی تھی۔

"واہ باجی! آپ تو بہت پیاری لگ رہی ہیں بالکل شہزادیوں کی طرح۔" اسے دیکھتے ہی بلقیس بے ساختہ انداز میں بولی تو وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی آپ کی بہن کا فون ہے۔"

وہ حیران ہوئی اور تیزی سے باہر نکلی۔

"ہیلو کیسی ہو تعبیر۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ سب خیریت ہے نا۔"

"ہاں سب ٹھیک ہے تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو جیسے میں خیریت کے بغیر فون نہیں کر سکتی۔ ایک گڈ نیوز تھی۔ فہد نے شادی کے لیے ہاں کردی ہے اور خالہ اور انکل آج مجھے انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔" ایک پل کے لیے تعبیر بول ہی نہیں سکی۔

"تعبیر!" اس کی خاموشی پر وہ زور سے بولی۔

"بہت بہت مبارک ہو ثمرین! ماموں ممانی کو بھی میری طرف سے مبارک باد دینا، میں بعد میں تمہیں فون کروں گی۔" اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پتا نہیں اسے دکھ کیوں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اگر اس نے شادی کرلی تھی تو فہد بھی کر سکتا تھا۔ اسے پلٹتے ہی جھٹکا لگا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ضرار کھڑا بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جب بھی پریشان ہوتی تھی، پتا نہیں پہلا سامنا اسی سے کیوں ہوتا، وہ اسے نظرانداز کر کے نکل جانا چاہتی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" یقیناً اس کا مطلب اس کی تیاری سے تھا۔

"زید کے ساتھ ان کے دوست کے گھر پارٹی پر۔"

"زید کے ساتھ؟" وہ حیران ہو کر بڑبڑایا۔

"کہاں۔"

تعبیر نے چونک کر اسے دیکھا وہ اتنے سوال کیوں کر رہا ہے۔

"یہ انہوں نے نہیں بتایا۔" وہ مزید کوئی بات کیے بغیر تیزی سے مڑ گئی تھی۔ ابھی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی جب بلقیس دوبارہ اس کے پیچھے آئی۔

"باجی! زید بھائی باہر گاڑی میں آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے سر ہلا کر تیزی سے سینڈل پہنی اور باہر نکلی۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" کار میں بیٹھتے ہی زید نے اس کی تعریف کی۔ کچھ دیر پہلے جو فہد کی منگنی کا سن کر دل پر بوجھ تھا وہ کم ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا اسے اب زندگی زید کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس سے تعاون کرے گی تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ سارا راستہ یہی جوڑ توڑ کرتی رہی۔ اس نے محسوس نہیں کیا۔ زید نے سارا راستہ اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کافی دیر بعد اس نے باہر دھیان دیا تو غور کیا علاقہ غیر آباد تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔" تعبیر نے کچھ پریشان ہو کر زید سے پوچھا۔

"بتایا تو تھا میرے فرینڈ کے گھر پارٹی ہے۔"

"لیکن یہ علاقہ جنگل کی طرح لگ رہا ہے۔"

"ہاں اس کا ریسٹ ہاؤس شہر سے کافی دور ہے۔"

"اتنی رات کو ایسی جگہ پر نہیں آنا چاہیے۔" وہ اردگرد کی خاموشی اور اندھیرا دیکھ کر واقعی ڈر گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر اسے ریسٹ ہاؤس نما جگہ نظر آگئی۔ جہاں کافی روشنی تھی۔ اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔

"آؤ۔" گاڑی سے اترتے ہی زید نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ اندر اسے کسی پارٹی کے آثار محسوس نہیں ہوئے تھے۔

"نجم کہاں ہو۔" زید نے شاید اپنے دوست کو آواز دی تھی اور سامنے کمرے سے جو شخص نکلا تھا وہ اسے پہلی نظر میں پہچان گئی تھی۔ یہ زید کا وہی دوست تھا جو کچھ دن پہلے گیس اسٹیشن پر ملا تھا۔

"ویلکم۔" اس نے مسکرا کر تعبیر کی طرف دیکھا، اس کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ وہ سہم کر زید کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہاں پہنچنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔" وہ پوچھ تو زید سے رہا تھا، لیکن دیکھ تعبیر کو رہا تھا۔

"کیا خدمت کریں آپ کی؟" اب اس نے ڈائریکٹ تعبیر کو مخاطب کیا تھا جو گھبرا کر زید کو دیکھنے لگی۔

"نجم پلیز! یہ ڈراما اب بند کرو۔ میری رقم اور میری چیزیں مجھے واپس دو مجھے جانا ہے۔" زید کی بات اور انداز دونوں عجیب تھے۔ تعبیر کے اردگرد جیسے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"تمہاری یہی جلد بازیاں تمہیں لے ڈوبتی ہیں۔ بیٹھو تھوڑی دیر بہت اچھا سیمپل منگوایا ہے وہ تو ٹرائی کرو۔" وہ ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"نہیں ابھی نہیں۔ تم نے جو کہا تھا، میں لے آیا ہوں۔ مجھے میرے روپے دے دو۔" زید کھڑا ہو گیا۔ تعبیر بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"ارے۔" نجم نے مسکراتی نظروں سے تعبیر کو دیکھا۔

"آپ کہاں؟ آپ تو ہماری خاص مہمان ہیں۔ آج تو آپ کہیں نہیں جا سکتیں۔" تعبیر نے ایک دم زید کے قریب جا کر اس کا بازو تھام لیا۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

"رفیق۔" نجم نے دائیں طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی۔

"وہ بریف کیس لے آؤ۔" کچھ لمحے بعد دائیں کمرے کا دروازہ کھول کر ایک دیو قامت شخص بریف کیس لے کر اندر داخل ہوا اور نجم کے صوفے کے قریب رکھ کر دوبارہ اسی کمرے میں چلا گیا۔ تعبیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ ہو کیا رہا ہے۔ نجم نے بریف کیس کھول کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس میں پانچ ہزار اور ہزار کے بہت سے نوٹ تھے اور کچھ پیکٹس میں

کیپسولز اور سرنج تھیں۔
"یہ تمہاری امانت۔" نجم کے کہنے پر زید چیل کی طرح اس بریف کیس پر جھپٹا تھا جب کہ تعبیر کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ زید نے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔
"زید!" اس کے آگے بڑھتے ہی وہ چیخ کر اس کے پیچھے گئی۔
"زید! تم نے انہیں بتایا نہیں۔" اپنے پیچھے نجم کی آواز سن کر وہ میکانکی انداز میں گھومی۔
"چہ چہ چہ۔" اس کے چہرے پر ڈر دیکھ کر نجم نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔
"کتنی بری بات ہے زید! کوئی خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ یوں بھی کرتا ہے۔ دیکھو یہ کتنا ڈری ہوئی ہے۔" اس کے قریب آکر اس کے گال کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔
اس کے یوں ڈرنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"زید! پلیز چلیں یہاں سے۔" اس نے روتے ہوئے جیسے ساکت کھڑے زید کو جگانے کی کوشش کی تھی۔
"زید! تم نے اسے بتایا نہیں اب یہ یہیں رہے گی۔"
زید نے بریف کیس پکڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔
"تعبیر! میں نے کہا نا تم بہت اچھی ہو، لیکن میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا مجھے خوب صورت چہروں سے نفرت ہے۔ کیوں کہ بے وفائی ان کی فطرت ہوتی ہے، میں نے مما کو منع کیا تھا مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے تم میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔"
"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو زید!" نجم پھر بولا تھا۔
"بھئی سیدھی سی بات ہے مجھے تم میں دلچسپی نہیں، لیکن نجم کو تم بہت پسند آگئی ہو۔ میرے خیال میں تم میرے لیے بالکل بے کار تھیں، لیکن مجھے نہیں پتا تھا تم سے مجھے فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں جوئے میں چالیس لاکھ ہار گیا تھا۔ اب وہ لوگ مجھ سے ڈیمانڈ کر رہے تھے۔ رقم کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا تب نجم نے مجھے آفر کی کہ اگر میں تمہیں ایک رات کے لیے اسے دے دوں تو وہ مجھے چالیس لاکھ کے ساتھ میری ڈرگز بھی مہیا کر دے گا۔" بات اس کی سمجھ میں آئی تو اسے لگا آسمان اس کے سر پر نہیں اور زمین اس کے قدموں کے نیچے نہیں۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت زید کے ہاتھوں پر ختم ہو گئی۔ اس کے رکھوالے نے اس کی عزت نیلام کر دی۔ اسے بیچ دیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔
زید نے ایک نظر اس کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالی اور دوسری نجم پر، جو دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے اسے دیکھ رہا تھا کہ "اب تم جاؤ۔"
زید نے دوبارہ نظر تعبیر پر نہیں ڈالی اور تیزی سے باہر کی طرف بڑھا تو تعبیر جیسے ہوش میں آئی۔
"زید۔" وہ چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔
"زید! آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ خدا کے لیے زید۔" وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی، لیکن وہ اسے ٹھوکر مار کر پیچھے کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ جونہی دروازہ بند ہوا اس کی چیخوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نجم نے اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا تھا۔
تعبیر کو لگا اس کا سانس بند ہو جائے گا۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس نے اپنے ناخن اس کے بازو میں گاڑ دیے، بلبلاتے ہوئے اس نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا اور وہ اس کے نرغے سے چھوٹتے ہی دروازے کی طرف بھاگی، لیکن پریشانی میں دروازہ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ تب تک وہ دوبارہ اس تک پہنچ گیا تھا وہ دوسری طرف بھاگی۔ اس کے دوپٹے کا کونا اس کے ہاتھ آگیا۔ جس کو کھینچنے پر اس کی گردن کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا تو تعبیر نے اسے مارنے کے لیے کسی چیز کی تلاش کی۔ پاس پڑا اسٹیل کا گلدان اس نے اٹھا کر اس کی طرف اچھالا، لیکن اس کے جھکتے ہی وہ زوردار آواز کے ساتھ زمین پر گرا تھا اور اب کی بار اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ پڑا تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ وہیں گر گئی۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا تب ہی دروازے پر تیز دستک سے وہ چونک کر رک گیا۔ اس نے ایک نظر نیم بے ہوش تعبیر پر ڈالی اور اسے صوفے کے پیچھے پھینک کر، وہ اپنا حلیہ درست کرتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم۔" دروازہ کھولتے ہی وہ حیران ہوا۔ اندر آکر متلاشی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ "زید تو کب کا چلا گیا۔"
ضرار نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تعبیر کہاں ہے؟"
"کون تعبیر۔" نجم نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ضرار نے ہونٹ بھینچ لیے۔
"تعبیر۔" اس نے اونچی آواز میں اسے پکارا۔
"یہاں کوئی نہیں ضرار۔" نجم نے گھبرا کر صوفے کی طرف دیکھا۔ تعبیر نے آنکھیں کھولیں۔ اسے لگا کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔ بچاؤ کا آخری راستہ یہ خیال آتے ہی وہ پورا زور لگا کر اٹھی اور اٹھتے ہی اس کی پہلی نظر ضرار پر پڑی۔ اسے دیکھ کر پہلے وہ چونکا اور پھر تیر کی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔
"تعبیر تم ٹھیک ہو۔" وہ اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر بے چینی سے پوچھنے لگا۔ اس کے چہرے پر انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ لیکن اس وقت اس سارا دھیان تعبیر کی ذہنی کیفیت کی طرف تھا جو اسے بھی اجنبیوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔
"تعبیر!" اب کے اس نے زور سے اسے پکارا، تعبیر نے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جو اس کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔ وہ ایک دم روتے ہوئے اس کے ساتھ لگ گئی تھی۔ ضرار ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا، پھر اسے بازو کے گھیرے میں لیے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔
"ضرار تم اسے لے کر نہیں جا سکتے۔ میں نے زید کو اس کی قیمت ادا کی ہے۔" نجم نے ایک دم اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس کا وہ دراز قامت آدمی بھی باہر آگیا تھا۔
"نجم! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں اپنے ساتھ پولیس لے کر آیا ہوں۔ اگر تم نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو بہت بری طرح پھنسو گے تم، تمہارے ریسٹ ہاؤس کے اندر جو ناجائز سامان ہے وہ پولیس کے ہاتھ لگا تو ساری عمر جیل میں گزارو گے۔"
نجم نے کھا جانے والی نظروں سے ضرار اور اس کے پہلو سے لگی تعبیر کو دیکھا ضرار مزید کوئی بات کیے بغیر تعبیر کو لے کر تیزی سے باہر نکلا۔
تعبیر کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر اس نے تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔
وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ نجم سے بچنے کے لیے اس نے صرف پولیس کا نام استعمال کیا تھا، ورنہ جس بوکھلاہٹ میں وہ یہاں پہنچا تھا پولیس تو دور کی بات اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ اسے زید کی پچھلے دنوں کی مشکوک حرکتوں نے چوکنا کر دیا تھا اور آج جب تعبیر اس کے ساتھ جا رہی تھی، نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس نے اسے کچھ غلط ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ جوں جوں زید کی گاڑی سنسان علاقے کی طرف بڑھ رہی تھی، ویسے ہی اس کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن تھوڑی دیر بعد جب زید تیزی سے اکیلا باہر نکلا تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا اور اندر آکر جو اس نے سنا اور دیکھا، وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ زید نے تعبیر کو بیچ دیا ہے۔ وہ اس حد تک گر گیا تھا۔
کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اس نے کافی دور جا کر کار روکی اور اس کی طرف دیکھا جو بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ وہ کار سے اتر کر سامنے دکان پر گیا۔ پانی کی بوتل لے کر جب وہ واپس آیا تو وہ کار میں نہیں تھی۔ ایک پل کے لیے وہ ہل ہی نہیں سکا، وہ تیزی سے سیدھا ہوا اور متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھنے لگا۔ سامنے جاتی لڑکی پر اسے تعبیر کا گمان ہوا تو اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور پھر بھاگنے کے انداز میں اس کے پیچھے گیا۔ اس کے قریب پہنچنے پر اس نے آواز دی وہ تب بھی رکی نہیں۔
اس نے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا

تھا۔ اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"ہاتھ چھوڑیں میرا۔" وہ جواب دینے کے بجائے ہاتھ چھڑانے لگی تھی۔

"میرے سوال کا جواب دو کہاں جا رہی ہو۔"

"مجھے نہیں پتا، لیکن مجھے آپ کے گھر نہیں جانا۔"

"پاگلوں جیسی بات مت کرو، چلو گاڑی میں بیٹھو۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

"میں پاگل ہی ہوں، میں پاگل خانے چلی جاؤں گی۔ چھوڑ دیں مجھے۔" وہ اب زیادہ زور سے اپنا بازو چھڑانے لگی۔ ضرار نے اردگرد نظر گھمائی۔ وہ سڑک پر کھڑے تھے۔ زیادہ رات کی وجہ سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں، لیکن جس طرح کی صورت حال میں وہ دونوں کھڑے تھے کوئی بھی تماشا بن سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے تمہیں گھر نہیں جانا اوکے! میں تمہیں تمہارے ماموں کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں۔ مجھے ماموں کے گھر بھی نہیں جانا۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ میرے لیے کہیں بھی کوئی جگہ نہیں مجھے مرنا ہے۔ خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔" اب کے اس نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تعبیر پلیز۔" اب کہ ضرار بے بسی سے بولا۔ "اس طرح سڑک پر کھڑے ہو کر یہ معاملہ سلجھ نہیں سکتا۔ ہم گھر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔" تعبیر نے روتے ہوئے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات کرنے کو اب رہ کیا گیا ہے۔ پہلے دن سے یہ سب ہو رہا ہے۔ پہلے مجھے جانوروں کی طرح مارا گیا، لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا۔ الٹا مجھے کہا گیا کہ میں بیوی ہوں، میرا فرض ہے کہ میں مار کھاؤں۔ اس نے کبھی مجھے بیوی کا درجہ نہیں دیا۔ گھر میں مجھے آنٹی تھرڈ پرسن کی طرح ٹریٹ کرتی ہیں اور آج۔۔۔ آج تو حد ہی ہو گئی۔۔۔ مجھے بیچ دیا۔ میں کیا ہوں۔" اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ دیا۔

"دنیا کی فالتو ترین چیز۔۔۔ ہر کوئی اپنے مطلب کے لیے مجھے استعمال کرتا ہے۔ کوئی مجھے کہیں بیچ دیتا ہے اور کوئی کہیں، کوئی کتنا بھی گرا ہوا ہو اتنا پھر بھی کوئی نہیں گرتا۔" وہ غصے سے بولتے بولتے پھر رونے لگی۔ ضرار کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لیکن اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے جیسے وہ بہت ضبط سے کام لے رہا ہو۔

"میری عزت اتنی معمولی ہے؟" وہ روتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔ "بتائیں۔" اس کو خاموش دیکھ کر اس نے پھر پوچھا۔

"مجھے پتا ہے آپ کے پاس جواب نہیں ہو گا۔ آپ بھی اسی کے بھائی ہیں، مجھے اب وہاں نہیں جانا۔" اس نے ایک بار پھر اپنا بازو کھینچا، لیکن اب ضرار نے بات نہیں کی اس کا بازو کھینچتا ہوا اسے گاڑی کی طرف لے آیا۔

"آپ ایسے میرے ساتھ نہیں کر سکتے۔ مجھے نہیں جانا مجھے اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا۔" ضرار نے اسے اندر دھکیل کر دوسری طرف بیٹھتے ہی دروازہ لاک کر دیا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اس نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا، لیکن وہ یونہی پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔ ضرار نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالا اور اسی طرح اسے کھینچتے ہوئے اندر لے آیا۔ اعجاز صاحب اور ناہید جیسے ان کے انتظار میں تھے۔ ان کو دیکھتے ہی وہ دونوں بے اختیار ان کی طرف بڑھے تھے۔

"بلقیس۔" خاموشی میں ضرار کی اونچی آواز بہت زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی کچن سے نکلی۔

"پانی لے کر آؤ۔"

وہ وہیں سے واپس پلٹ گئی۔

ناہید نے اس کا بازو پکڑا تو وہ معمول کی طرح صوفے پر بیٹھ گئی۔ بلقیس نے حیرت سے تعبیر کا چہرہ دیکھا اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ جب اس نے نہ تھاما تو وہ ضرار کا منہ دیکھنے لگیں۔

"پانی پیو۔" ضرار نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر بڑھایا، لیکن جب وہ یونہی بیٹھی رہی تو اس نے زبردستی گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ دو گھونٹ پی کر اس نے ہاتھ سے گلاس پرے ہٹایا۔

"زید کہاں ہے۔" ناہید نے ضرار سے پوچھا۔

"اسی کا انتظار ہے۔" ضرار کے انداز پر ناہید کو اپنے دل کی دھڑکن سست ہوتی محسوس ہوئی۔

"دیکھو ضرار! جو بھی بات کرنی ہے آرام سے کرنا۔"

"آرام سے۔" وہ پھٹ پڑا تھا۔

"آرام سے بات کرنے کے لیے بچا کیا ہے۔ کسی کی عزت داؤ پر لگا دی۔ کسی کی بھی نہیں اپنی بیوی کی۔ اگر اس کو کچھ ہو جاتا تو۔" اس نے تعبیر کی طرف اشارہ کیا۔

"کول ڈاؤن ضرار! اچھی بات تو یہ ہے کہ کچھ ہوا تو نہیں۔" اس کے ساتھ اعجاز صاحب نے بھی دکھ اور بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"ویل ڈن مما ویل ڈن! تو آپ انتظار کر رہی تھیں کچھ ہو جاتا۔ اگر ہو جاتا تو کیا تلافی کر سکتی تھیں آپ اس کی عزت کی۔"

"اب ہو گیا نا ضرار! ہو گئی زید سے غلطی۔ میں سمجھاتی ہوں اسے۔"

"بس کرو ناہید۔" اعجاز صاحب نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "بس کرو! بچپن سے لے کر آج تک اس کی غلطیوں پر پردہ ڈال ڈال کر تم نے اسے عادی مجرم بنا دیا ہے۔ اس میں گناہ نام کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ وہ اتنا گر چکا ہے کہ اپنی عزت کو اپنے دوست کے پاس چھوڑ آیا۔۔۔ تھو! میں سوچتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ موت آ جائے مجھے اتنے رذیل لڑکے کا باپ ہوں میں۔۔۔" اعجاز صاحب کا لہجہ درد سے چور تھا۔

ناہید نے ایک نظر خاموش بیٹھی تعبیر کو دیکھا اور دوسری نظر اپنے طیش میں کھڑے بیٹے اور تیسری نظر اپنے سر جھکائے بیٹھے شوہر پر ڈالی اور اٹھ کر تعبیر کے پاس آ گئیں۔

"دیکھو تعبیر! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ تم بھول جاؤ سب۔" تعبیر نے دکھ سے ان کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کوئی آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسا کرتا تو آپ بھول جاتیں؟" اس کے سوالیہ انداز پر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"تم ڈائیورس چاہتی ہو؟" ناہید کے سوال پر ضرار اور اعجاز صاحب تعبیر کو دیکھنے لگے۔

"جی۔" اس کا لہجہ مستحکم تھا۔ ناہید طنزیہ انداز میں مسکرائی تھیں۔

"جانتی ہو ہمارے معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کا کیا مقام ہے۔ دنیا پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتی ہے ایسی عورت کو۔ زید سے طلاق لو گی تو کہاں جاؤ گی۔ یہاں کم از کم چھت اور روٹی تو میسر ہے۔ وہاں تو تمہارے گرد زندگی کا دائرہ تنگ ہو جائے گا۔ طعنے دے دے کر لوگ تمہارا جینا محال کر دیں گے۔ کیا فیوچر ہو گا تمہارا؟"

"زید کے ساتھ رہ کر میرا فیوچر کیا ہو گا۔ ایک شخص جو میرے منہ پر کہہ چکا ہے، وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ آج اس نے ایک رات کے لیے مجھے بیچا کل پھر بیچے گا۔ میں یتیم ہوں لیکن بدکردار نہیں ہوں۔" اعجاز صاحب نے بے ساختہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا جبکہ ضرار کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی، لیکن زید بھی تمہیں طلاق نہیں دے گا لٹکتی رہو درمیان میں۔" ان کے لہجے کی رعونت پر وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا عجیب سے شور سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ شاید صوفے پر بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر نکلی۔ لاؤنج میں سے ناہید کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ نا سمجھنے والے انداز میں آگے بڑھی۔ ناہید کے علاوہ وہاں کچھ اور عورتیں بھی تھیں۔

"بلقیس! کیا ہوا ہے۔" اس کے سہمے ہوئے لہجے میں اندیشے صاف محسوس ہو رہے تھے۔

"باجی!" وہ اس کے گلے لگ گئی۔ "زید بھائی نہیں رہے۔" وہ اس سے الگ ہو کر یوں دیکھنے لگی جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"وہ کیسے مر سکتا ہے۔ صرف چند گھنٹوں پہلے تو وہ اسے موت کے حوالے کر کے آیا تھا۔ وہ خود کیسے۔۔۔" اسے یوں ساکت دیکھ کر بلقیس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"کسی نے گولی مار دی انہیں۔ سڑک پر کئی گھنٹوں تک ان کی لاش پڑی رہی' ضرار بھائی گئے ہیں پولیس اسٹیشن۔ کارروائی پوری ہونے کے بعد ان کی لاش ملے گی۔" وہ یونہی خشک آنکھوں کے ساتھ ساکت بیٹھی رہی۔ آہستہ آہستہ لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ ماموں ممانی اور ثمرین بھی آ گئے تھے۔ اس کی خاموشی تب بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ اس گھر کا کوئی بھی فرد اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ زید کی لاش کو غسل دے کر لان میں رکھا گیا تھا ثمرین اسے بھی لان میں لے آئی تھی۔ سب جوان موت پر افسوس کر رہے تھے اور اتنا ہی افسوس ایک مہینے کی نو بیاہتا بیوہ کے لیے بھی کر رہے تھے۔ اس کی پتھرائی آنکھوں کو لوگ صدمہ سمجھ رہے تھے۔ ثمرین اسے رلانے کی کوشش کر رہی تھی' لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ رو رو کے تھک چکی ہے۔

"ماموں!"

"جی بیٹا!" زید کے مرنے کے تین دن بعد اس نے کسی سے بات کی تھی۔

"مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

"ہاں بیٹا! چلو وہ بھی تمہارا گھر ہے میں اعجاز صاحب سے بات کر لیتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ وہ جانتی تھی جب ممانی کو پتا چلے گا تو انہیں اچھا نہیں لگے گا لیکن وہ ان کی ناپسندیدگی برداشت کر سکتی تھی لیکن یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ تنویر صاحب کی بات سن کر اعجاز صاحب خاموش رہ گئے۔ ان کا چہرہ دیکھ کر تنویر صاحب خود شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

"میں جانتا ہوں مجھے ابھی یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ ابھی تو آپ کا غم تازہ ہے لیکن تعبیر کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ کچھ دن کے لیے اسے لے جائیں۔"

"پتا نہیں اعجاز صاحب! وہ کتنی دیر رہنا چاہتی ہے۔" اعجاز صاحب نے چونک کر تنویر صاحب کو دیکھا جو ان سے نظریں چرا رہے تھے۔

"تنویر صاحب! تعبیر ہماری بیٹی ہے اگر زید نہیں رہا تو کیا تعبیر سے ہمارا رشتہ ختم ہو گیا؟" یہ کہتے ہوئے اعجاز صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ تنویر صاحب مزید شرمندہ ہو گئے۔

"میں آپ کا درد سمجھتا ہوں لیکن تعبیر کی ذہنی حالت بھی دیکھیں۔ اس کا بھی تو بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں جو روگ لگا ہے آپ سمجھ سکتے ہیں۔" ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

وہ اٹھ کر تعبیر کے پاس آئے۔

"بیٹا! مجھے حق تو نہیں لیکن میں پھر بھی کہوں گا۔ اس گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ تمہیں جب بھی میری ضرورت ہو' مجھے آواز دینا تمہارا باپ حاضر ہو جائے گا۔

تعبیر! تم ہمیں معاف کر دینا اور کوئی بددعا مت دینا۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تو اس نے روتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں کون ہوتی ہوں کسی کو بددعا دینے والی۔ میں نے سب کو معاف کیا' اللہ کی اس مہربانی کے لیے جو اس نے میری عزت بچا کر کی۔"

"جیتی رہو اللہ تمہیں بانصیب کرے۔" ان کی دعا پر اسے رونا آ گیا۔ اس نے آنکھیں صاف کیں تو نظر سامنے کھڑے ضرار پر پڑی۔

"جانا ضروری ہے؟" اس کے سوال پر تعبیر کے ساتھ اعجاز صاحب نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں کیونکہ میرا یہاں اب کچھ بھی نہیں۔" وہ اب کی بار کچھ نہیں بولا تھا۔

"میں آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کی وجہ سے

میں حرام موت مرنے سے بچ گئی۔"

☆ ☆ ☆

وقت کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا گزر جاتا ہے۔ بس یہ ہے کہ اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی اچھے کبھی برے۔ اس کی زندگی تو پہلے بھی اتنی خوشگوار نہیں تھی لیکن اب تو جیسے ہر آس ہی ٹوٹ گئی تھی۔

زید کی موت کے بعد ناہید بہت اپ سیٹ رہنے لگی تھیں اسی لیے وہ سب آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ کبھی کبھی اعجاز صاحب اسے فون کرتے تھے۔ یہاں آئے اسے ایک سال ہونے کو تھا۔ وہ اکثر رات میں ڈر کر اٹھ جاتی تھی اور پھر ساری رات نیند اس پر مہربان نہیں ہوتی تھی۔

اس دن بھی ایسا ہوا تھا وہ ساری رات سو نہیں سکی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ باہر سے باتوں اور قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ کسی مہمان کا سوچ کر اس نے باہر جانے کا ارادہ موقوف کر دیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ وہ جانتی تھی کہ ۔۔۔ ثمرین اسے بلانے آئی ہوگی' لیکن جونہی اس نے مڑ کر دیکھا' کتنی دیر تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔ سامنے فہد کھڑا تھا۔

"جیسا میں نے سوچا تھا تم اس سے بھی زیادہ برے حال میں ہو۔" تعبیر نے گہرا سانس لے کر نظریں جھکا لیں۔

"سنا ہے تمہارے شوہر کو کسی نے گولی مار دی۔ چہ چہ ۔۔۔ بڑا افسوس ہوا۔" طنزیہ انداز میں بولتے بولتے اس کے لہجے سے طیش جھلکنے لگا۔

"اچھا ہوا تم ہو ہی اس قابل۔ تم کیا سمجھتی تھیں' تم میرے ساتھ دھوکا کر کے خوش رہ سکو گی۔ دیکھو کتنی جلدی تمہیں سزا مل گئی۔"

"فہد پلیز۔"

"نام مت لو اپنی زبان سے میرا۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا تھا مگر دروازہ کھلنے پر ایک دم خاموش ہونا پڑا۔ آنے والی ثمرین تھی۔ اسے روتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اسے ساتھ لگا لیا۔

"دیکھا تم نے فہد! کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ اسی طرح ہر وقت روتی رہتی ہے۔"

"ہاں لگتا ہے بڑا پیار تھا دونوں میں۔"

"ہاں نیچرل سی بات ہے۔ شادی ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں نا ابھی ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں اترا تھا۔" ثمرین کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"دوسری شادی کروا دو اس کی۔" فہد اس پر نظریں جما کر بولا۔

"ہاں یہی سوچا ہے پاپا نے۔"

"پلیز ثمرین۔ بند کرو یہ سب۔" وہ ایک دم اسے ٹوک کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

"شادی کے موضوع سے یونہی بھاگتی ہے' لیکن زندگی ایسے تو نہیں گزرتی۔"

"تو کوئی ہے نظر میں۔"

"ابھی تو نہیں لیکن مل جائے گا۔"

"ہوں۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"چلو باہر چلتے ہیں ذرا اپنی شادی بھی ڈسکس کر لیں۔" فہد کے کہنے پر وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ باہر آ گئی اور پھر جیسے یہ فہد کا معمول بن گیا تھا۔ وہ روز کسی بھی وقت آ جاتا اور پھر اس کے سامنے بیٹھ کر ثمرین سے ایسی باتیں کرتا کہ وہ سرخ چہرہ لیے وہاں سے اٹھ جاتی۔ کبھی کبھی اسے یقین نہیں آتا تھا یہ وہی فہد ہے جس نے کبھی اس سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ جو اس کا سب سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔

اس روز ثمرین فہد اور ممانی کے ساتھ شاپنگ پر گئی تھی۔ گھر میں صرف وہ اور تنویر صاحب تھے وہ ان کے لیے چائے بنا کر لائی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

"ماموں چائے۔" اس کے پکارنے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"تم اپنا خیال نہیں رکھتیں؟"

"خیال رکھ کر کیا کرنا ہے ماموں! آپ نے سنا نہیں کل ممانی کی بہن کیا کہہ رہی تھیں۔ طلاق یافتہ اور بیوہ کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ ان کا کوئی حق نہیں کسی بھی

خوشی پر۔"
"جاہل لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ غصے سے بولے۔
زندگی کی ہر خوشی پر تمہارا حق ہے۔"
"چھوڑیں ماموں مجھے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنی۔"
"گھر میں ثمرین کی شادی کی تیاریاں جتنے جوش و خروش سے ہو رہی ہیں تم سوچتی ہو گی ماموں مجھ میں اور اپنی بیٹی میں فرق کر گئے۔"
"نہیں ماموں! میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔"
اس نے سر جھٹکا۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔
"ماموں! مجھے آپ سے اجازت لینی تھی۔ ایک اسکول میں ویکنسی ہے میں وہاں انٹرویو دینے جانا چاہتی ہوں۔"
"ہوں۔" انہوں نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔
برتن دھو کر جب وہ لاؤنج میں آئی تو وہاں ماموں کے علاوہ ممانی اور خالدہ آنٹی بھی تھیں۔ وہ ان لوگوں کو دیکھ کر کمرے کی طرف بڑھنے لگی جب شاہدہ نے آواز دے کر اسے بلایا۔
"آپ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تعبیر سے پوچھ لیں۔ اب وہ کوئی کنواری نہیں کہ اس کے فیصلے آپ کریں۔" شاہدہ کے تلخ انداز پر وہ سوالیہ نظروں سے تنویر صاحب کو دیکھنے لگی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔
"آپا! آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے تعبیر کے لیے سوچا لیکن یہ رشتہ جو آپ نے بتایا ہے۔ مجھے یہ تعبیر کے لیے موزوں نہیں لگتا۔" تعبیر نے گہرا سانس لیا۔
"کیوں حرج کیا ہے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اپنا کاروبار ہے۔"
"آپا وہ آدمی تعبیر سے ڈبل عمر کا ہے۔ دو بچے ہیں وہ بھی دس، بارہ سال کے اور کاروبار کی خوب کہی۔ کپڑے کی چھوٹی سی دکان کو آپ کاروبار کہتی ہیں۔"
"یہ ساری باتیں اپنی جگہ اب اس کو کسی کنوارے اور کروڑ پتی کا رشتہ نہیں ملے گا۔ اگر اس کے نصیب میں کروڑ پتی کی بیوی بننا ہوتا تو بیوہ نہ ہوتی۔" تعبیر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔
"میری بھانجی مجھ پر بوجھ نہیں جو میں اسے دو بچوں کے باپ سے بیاہ دوں۔ آپ نے اتنا سوچا تعبیر کے لیے اس کے لیے شکریہ۔"
"بھلے کا تو زمانہ ہی نہیں۔" خالدہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئیں اور شاہدہ ان کے پیچھے گئیں۔
"تعبیر! جب تک میں زندہ ہوں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔
"جی۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

☼ ☼ ☼

اپنے کپڑے استری کر کے وہ باہر آئی تو فہد بیٹھا تھا، وہ گہرا سانس لے کر پلٹ گئی۔ لیکن اس نے شاید اس کو مڑتے دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے اس کے پیچھے آگیا۔
"مبارک ہو۔ سنا ہے مس تعبیر کے لیے رشتہ آیا ہے اور اس سے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ شادی میں دولہے کے ساتھ دو بچے گفٹ میں ملیں گے۔" کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا تو تعبیر نے ہونٹ بھینچ لیے۔
"لیکن تم نے انکار کر دیا۔ کیوں، کیا کسی اور سے تمہارا چکر چل رہا ہے جو اس رشتے سے منع کر دیا۔"
اس کا ضبط جواب دے گیا۔
"آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ مجھ سے ایسے بات کریں۔"
"وہی تو پوچھ رہا ہوں، کس کو یہ حق دے رہی ہو۔" وہ اس کے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔
"ایک طرف تم مجھے محبت کا جھانسا دیتی رہیں اور دوسری طرف کہیں اور بھی چکر چل رہا تھا تمہارا۔"
"آپ کچھ نہیں جانتے۔"
"میں صرف یہ جانتا ہوں تم نے شادی کر لی۔"
"تو کیا آپ شادی نہیں کر رہے؟"

"میں یہ شادی اس لیے کر رہا ہوں کہ تمہیں تکلیف ہو۔"
"مجھے آپ کی اور ثمرین کی شادی سے تکلیف نہیں خوشی ہو گی۔" فہد نے ایک دم اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔
"وہی جاننا چاہتا ہوں میں، کیوں تمہیں تکلیف نہیں ہوتی۔" اس کی اتنی جرأت پر وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔
"چھوڑیں مجھے۔" وہ چلائی۔ اس نے اس کے بازوؤں پر ہاتھ کی گرفت اور بڑھا دی۔
"میں ثمرین سے شادی کروں گا، لیکن چھوڑوں گا تمہیں بھی نہیں۔" وہ اس کی طرف جھکا تو اس نے زور سے اسے دھکا دیا۔
"پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر آپ میرے قریب آئے تو میں چیخ کر سب کو بلا لوں گی۔"
"یہ بھی کر کے دیکھ لو۔" اس کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر بھاگی۔
"یا اللہ اور کتنے روپ انسانوں کے دکھانے ہیں؟" اس سے پہلے وہ کسی کمرے میں جا کر چھپتی لاؤنج کا دروازہ کھلا اس نے مڑ کر دیکھا اور سامنے نظر آنے والا چہرہ اسے اپنی آنکھوں کا دھوکا لگا تھا۔
وہ جب بھی پریشان ہوتی تھی وہ سب سے پہلے اس کے سامنے آ جاتا اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ہاتھوں سے صاف کر کے دوبارہ دیکھا۔ وہ چہرہ بدلا نہیں تھا بلکہ اور واضح ہو گیا تھا۔ اس کی حیرانی دیکھ کر وہ مسکرایا اور جب اس کے پیچھے اعجاز صاحب کا چہرہ نمودار ہوا تو پھر وہ رکی نہیں۔ ان کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔
"ارے مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا میری بیٹی اتنی اداس ہے، میں تو سمجھتا رہا بس میں ہی اداس ہوں۔" اعجاز صاحب اسے ساتھ لگائے ہوئے بولے۔
"ساری باتیں۔۔۔ یہیں کریں گے یا اندر بھی چلیں گے۔" ان کے پیچھے کھڑے تنویر صاحب نے کہا تو وہ لاؤنج میں آ گئے۔ جہاں ثمرین اپنی شاپنگ پھیلائے بیٹھی تھی۔ باہر نکلتے فہد نے غور سے ضرار کو دیکھا تھا۔
"ثمرین! سمیٹو اپنی چیزیں یہاں سے۔" شاہدہ نے پھیلے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ثمرین کی مدد کے خیال سے اس نے شاپر پکڑنے چاہے کہ شاہدہ بول اٹھیں۔
"تم ان کپڑوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ شادی کے کپڑے ہیں۔" تنویر صاحب کا دل چاہا ایک تھپڑ مار کر اس عورت کا منہ بند کر دیں۔ تعبیر کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس طرح کی باتیں وہ روز سنتی تھی، لیکن ضرار اور انکل کے سامنے اسے بہت سبکی محسوس ہوئی تھی۔ فہد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جبکہ ثمرین تو مہمانوں کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گئی۔
"پاپا! میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔" ضرار کی سنجیدہ آواز سنائی دی تھی۔ اعجاز صاحب تعبیر کو دیکھ رہے تھے، جو ان کے جانے کا سن کر اداس ہو گئی تھی۔ وہ تو صرف اسے ایک نظر دیکھنے آئے تھے، لیکن اب ان کا ارادہ بدل گیا تھا۔
"تنویر صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ دیر کے لیے تعبیر کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔" تنویر صاحب نے تعبیر کا چہرہ دیکھا جہاں صاف لکھا تھا وہ جانا چاہتی ہے۔
"جی آپ لے جائیں۔"
"چلو تعبیر۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ وہ اسی طرح ان کے ساتھ نکل آئی تھی۔
"کمال کرتے ہیں آپ کیا ضرورت تھی تعبیر کو ان کے ساتھ بھیجنے کی۔" ان کے جانے کے بعد شاہدہ نے ناراضی سے تنویر صاحب سے کہا جواباً انہوں نے بہت غصے سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
"کیوں ضرورت نہیں تھی ان کا بھی رشتہ ہے اس سے۔"
"رشتہ ہے نہیں تھا۔ اتنا ہی رشتہ تھا تو رکھتے نا اسے، تیسرے ہی دن نکال دیا تھا اور اب سال بعد آ گئے ہمدردی جتانے۔" تنویر صاحب کتنی دیر انہیں

دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ شرمندہ ہو کر نظریں چرانے لگیں۔

"اللہ کے قہر سے ڈرو شاہدہ بیگم! اپنی زبان کے جوہر محدود رکھا کرو۔ یہ نہ ہو اس صابر بچی کی آہ لگ جائے تمہیں۔" کہہ کر وہ اٹھ گئے تھے جبکہ وہ ثمرین اور فہد کے ساتھ یوں بے عزتی پر پاؤں پٹختی ہوئی اندر مڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"ضرار یہاں رکو' میں اور میری بیٹی یہاں کا برگر کھائیں گے۔"

"پاپا یہاں؟ کسی اچھی جگہ چلتے ہیں۔" وہ سڑک کے کنارے چھوٹی سی دکان کو حیرت سے دیکھ کر بولا۔

"تم وہاں سے کھالینا۔" وہ خود ہی کہہ کر ہنسے۔

"جاؤ آرڈر دے کر آؤ تب تک میں اپنی بیٹی سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرلوں۔" وہ اتر کر چلا گیا۔

"خوش رہا کرو تعبیر! تمہیں خوش دیکھ کر تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔" تعبیر سر جھکا کر مسکرا دی تھی۔

"آپ ماموں کے بعد دوسرے شخص ہیں انکل جن کو مجھے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے ورنہ مجھے تو اپنا آپ بے کار لگتا ہے!"

"ایسا مت کہا کرو۔ تم جانتی ہو' میں نے تم سے حوصلہ صبر اور درگزر کرنا سیکھا ہے۔"

ضرار آیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ دیر بعد اسے گھر ڈراپ کر گئے۔

"ضرار اب میں تھک گئی ہوں۔ تم آخر میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔ شادی کرلو ہم میاں بیوی بھی تمہاری خوشی دیکھ لیں۔" ضرار نے نظر اٹھا کر باری باری انہیں دیکھا۔

"ٹھیک ہے میں شادی کے لیے تیار ہوں۔"

"واقعی۔" وہ دونوں بے حد خوش ہو کر بولے۔

"میں ابھی اسمارہ کی ممی سے بات کرتی ہوں۔ یہ نہ ہو کل پھر تمہارا موڈ بدل جائے۔" ناہید بڑی خوشی سے کھڑی ہوئی تھیں۔

"مگر میں نے یہ کب کہا میں اسمارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ناہید کے ساتھ اعجاز صاحب بھی الجھ کر اسے دیکھنے لگے۔

"میں تعبیر سے شادی کروں گا۔" اس نے بڑے مطمئن انداز میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ اعجاز صاحب اس کے چہرے سے اس کے فیصلے کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ ناہید کو اب تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا میں تعبیر سے شادی کروں گا۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" ناہید کی آواز کے ساتھ چہرے سے بھی طیش جھلکنے لگا تھا۔

"وہ تمہارے بھائی کی بیوی تھی۔"

"تھی۔" اس نے ان کے جملے کا آخری لفظ دہرایا۔

"تم اس بیوہ کے ساتھ شادی کرو گے۔ ساری دنیا کی لڑکیاں مرگئی ہیں۔"

"کم از کم میرے لیے مرگئی ہیں۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تو وہ اعجاز صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔

اعجاز صاحب خود حیران تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ تعبیر سے ملاقات کے وقت بھی وہ نارمل تھا۔ ایسا کوئی لمحہ ان کی گرفت میں نہیں آیا جو اتنے بڑے فیصلے کی وجہ بنا ہو۔

"بھول جاؤ ضرار کہ ایسا ہو گا مجھے اس لڑکی سے نفرت ہے۔"

"لیکن مجھے اس سے محبت ہے۔" ناہید کا ہاتھ بے ساختہ اپنے ہونٹوں تک گیا تھا جبکہ اعجاز صاحب اپنے بیٹے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

"ضرار ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہے ہو۔ وہ تمہارے بھائی کی بیوی ہے۔"

"بیوی تھی وہ۔" اب وہ چیخ کر بولا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تعبیر وہ لڑکی ہے جس سے میں نے پہلی نظر میں محبت کی تھی۔"

"ضرار۔" ناہید پیچھے سے چیخی تھیں۔

"پاپا! تعبیر ہی وہ لڑکی ہے جس سے میں ایئرپورٹ پر ملا تھا۔ تعبیر ہی وہ لڑکی ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"کیسے بتاتا۔ دوسری مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ زید کی بیوی کے روپ میں تھی۔ وہ میرے لیے قابل احترام تھی' لیکن زید نے اسے قابل عزت نہیں سمجھا۔ اس کو اتنی تکلیف دی اور میں کچھ نہیں کرسکتا تھا سوائے صبر کے۔ میں اسے اپنا نام اپنی محبت اپنا سہارا دے کر اتنا مضبوط کردوں گا کہ لوگ اس کی طرف بری نظر سے دیکھ بھی نہیں سکیں گے۔"

"تم نے تو میرے دل سے بوجھ ہلکا کردیا۔ تعبیر کو اگر ہم عزت اور محبت کے ساتھ اس گھر میں لے کر آئے تو شاید اللہ اس گناہ کے لیے ہمیں معاف کردے' جو زید نے کیا ہے۔" اعجاز صاحب بہت تحمل سے مگر خوشی سے بولے۔

☼ ☼ ☼

کار ایک جھٹکے سے اس کے قریب آکر رکی۔ وہ جو اپنے دھیان میں چل رہی تھی ڈر کے مارے اچھل پڑی' لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر نظر پڑتے ہی حیران رہ گئی۔

"آپ۔"

"آؤ بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

اس نے کوئی سوال نہیں کیا' بس حیران ہوتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔

اس دن اس نے سرسری سا اپنے اسکول میں جاب کا ذکر کیا تھا' لیکن یہ بات اس کی یادداشت میں رہ گئی اور وہ یہاں پہنچ بھی جائے گا یہ اسے امید نہیں تھی۔ کافی دیر تک جب کار سڑک پر رواں دواں رہی اور اس نے بات بھی نہیں کی تو اسے پوچھنا پڑا۔

"آپ نے کچھ بات کرنی تھی۔"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہہ کر نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں جو حیرانی کے مارے اس کے چہرے سے نظریں ہی نہیں ہٹا سکی۔

"کیوں۔" کچھ دیر بعد جو لفظ اس کے منہ سے نکلا' وہ اس کے لیے عجیب تھا۔

"کیوں کا کیا مطلب ہے۔" اب کہ وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ مجھ پر ترس کھا کر ایسا کہہ رہے ہیں؟" اس کا چہرہ دہکا۔

"کافی عقل مند ہو۔"

"جو آپ کے بھائی نے میرے ساتھ کیا اس کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔

میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے مگر اس کے بدلے میں شادی نہیں کرسکتی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" اب کہ تعبیر کو لگنے والا جھٹکا بہت شدید تھا۔

"میں نے پہلی بار تمہیں ایئرپورٹ پر دیکھا تھا تب سے صرف تم کو سوچا اور تمہیں چاہا ہے اور دوسری بار تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھا لیکن زید کی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں اس قیامت کا جو مجھ پر گزری تھی' میں نے امید چھوڑ دی تھی کہ میں کبھی تمہیں پاسکوں گا' لیکن یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ تم نہیں تو کوئی نہیں۔" تعبیر کے ذہن میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ ہر بات پر اس کا ردعمل یاد آرہا تھا۔

"میں تمہیں جانے ہی نہ دیتا' لیکن اس وقت میرے پاس کوئی حق نہیں تھا اور عدت میں' میں تمہیں پرپوز نہیں کرسکتا تھا۔ اتنی دیر میں انتظار کر رہا تھا کہ تمہارا غصہ اور افسوس کم ہو جائے مجھے ڈر بھی تھا تم انکار نہ کردو۔"

"مجھے گھر چھوڑ دیں دیر ہو رہی ہے۔" اس کا سنجیدہ

چہرہ دیکھ کر ضرار مزید کچھ کہہ نہیں سکا۔
"میں آج مما اور پاپا کو بھیجوں گا۔"
"میں نے ہاں تو نہیں کی۔"
"نہ بھی نہیں کی۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

☼ ☼ ☼

"اللہ نے کیا قسمت بنائی ہے اس لڑکی کی، میں جتنا اس کا برا کرنے کی کوشش کرتی ہوں اس کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ فہد میرا بھانجا میری بیٹی کا بچپن کا ساتھی، لیکن فہد کی محبت بن مانگے تعبیر کی جھولی میں جاگری۔ فہد کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا کرنے کے لیے کتنے جھوٹ بولنے پڑے۔ تعبیر پر کتنے الزام لگانے پڑے۔ زید سے شادی کرواتے ہوئے میرا مقصد اس کی تباہی تھا پھر جب زید مرگیا تو میں سمجھ رہی تھی میرا بدلہ پورا ہوگیا، لیکن اس زید کا بھائی جو شہزادوں کی سی آن بان رکھتا ہے اس کا رشتہ آگیا۔ وہ کنوارا اس بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اتنی چاہت کے ساتھ ضرار کے باپ نے اس کا رشتہ مانگا ہے۔ اتنی عاجزی تو تب بھی نہ تھی جب وہ اپنے ایب نارمل بیٹے کے لیے تعبیر کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ میرا شوہر، میری بیٹی جشن منا رہے ہیں اس کی نئی زندگی کے لیے اور میں سوگ منا رہی ہوں اس کی کامیابی کا۔"

"چھوڑو شاہدہ! ان باتوں کو اب تم صرف فہد اور ثمرین کی فکر کرو۔ یہ بھی تو دیکھو فہد کا دھیان ہٹ گیا تعبیر سے۔" اور وہ جو اپنا موبائل لینے آیا تھا ہونٹ بھینچے کتنی دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ شاہدہ اور خالدہ اسے دیکھ کر چونک گئیں۔

"ویری گڈ خالہ!" اس نے تالی بجا کر انہیں داد دی۔

"آپ سے مجھے یہی امید تھی، لیکن امی! آپ کم از کم آپ میری خوشی کے بارے میں سوچ لیتیں۔ خالہ نے بھی تو اپنی بیٹی کا سوچا نا۔ یہ سب ڈراما آپ نے میری شادی ثمرین سے کروانے کے لیے کیا نا

تو توڑ رہا ہوں میں یہ رشتہ، میں شادی تعبیر سے ہی کروں گا۔" وہ اپنا فیصلہ سنا کر چلا گیا تھا جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہیں۔

"میں کبھی تمہیں قبول نہیں کروں گی۔ اس لیے بہتر ہوگا تم خود ضرار کو منع کردو۔" وہ اپنے پرانے تیور کے ساتھ تعبیر کے گھر میں تھیں۔ بہت دیر تک تعبیر کو برا بھلا بولنے کے بعد انہوں نے آخر میں یہ کہا۔ جس طرح غصے میں آئی تھیں اسی طرح باہر نکل گئیں۔ ثمرین نے افسوس سے تعبیر کو دیکھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لوگ کتنے خوش تھے، کتنے عرصے بعد اس نے تعبیر کو اتنا خوش دیکھا تھا۔ پتا نہیں اس کی اتنے اچھے دل والی کزن کی زندگی میں اتنی آزمائشیں کیوں تھیں۔ تعبیر کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ ثمرین کا ہاتھ ہٹا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ تنویر صاحب اور ثمرین نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ فہد بھی موقع کی نزاکت محسوس کرکے ان کے پیچھے گیا تھا۔

"تعبیر!" ثمرین نے چیختے ہوئے اس کے ہاتھ سے فنائل کی بوتل کھینچی تھی۔

"تعبیر میری بچی یہ کیا کررہی ہو تم۔" تنویر صاحب نے زور سے اسے کھینچ لیا۔

"ماموں پلیز! مجھے مرجانے دیں، میں تھک گئی ہوں۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"نہیں بیٹا تم تو میری بڑی بہادر بیٹی ہو۔"

"نہیں ماموں میں اتنی بہادر نہیں ہوں۔ انسان ہوں مجھے بھی درد ہوتا ہے۔ تھک گئی ہوں لوگوں کی باتیں سنتے سنتے۔ جب بھی کوئی خوشی میری طرف ہاتھ بڑھاتی ہے کوئی نہ کوئی اس ہاتھ کو کھینچ لیتا ہے۔" وہ زور زور سے رونے لگی۔

"فہد کہتے ہیں، میں نے ان کو دھوکا دیا۔ کیوں کہ میرا زید کے ساتھ چکر تھا۔ آپ کو پتا ہے، میں تو زید کو جانتی بھی نہیں تھی ساری دنیا کو لگتا ہے میں شادی کے بعد عیش کرتی رہی۔" وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ تنویر صاحب اس کی بے وجہ ہنسی دیکھ کر ڈر گئے تھے۔

"آپ کو پتا ہے ماموں! زید ذہنی مریض تھا، وہ ڈرگز لیتا تھا ڈرنک کرتا تھا۔ شادی کی پہلی رات اس نے مار مار کر میرے جسم پر ہی نہیں میری روح کو بھی نیل و نیل کردیا تھا، اور ممانی جانتی تھیں کہ زید ڈرگز لیتا ہے، میں نے شادی کے اگلے دن ممانی کو فون کرکے بتایا تھا تو انہوں نے مجھے آپ سے بات کرنے سے منع کردیا تھا۔"

اب وہ اونچی آواز میں رونے لگی ثمرین دروازے میں کھڑی اپنی ماں کی سنگدلی کو سن رہی تھی۔

"ایک دن زید نے مجھے چالیس لاکھ کے لیے اپنے دوست کو بیچ دیا ایک رات کے لیے۔" تنویر صاحب بے ساختہ زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ ثمرین نے مضبوطی سے اپنے ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر اپنی چیخ کو روکا تھا اور باہر کھڑے فہد کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

"تب ضرار نے میری عزت بچائی تھی۔ جنہوں نے زید کو پیسے دیے تھے انہوں نے ہی زید کو مارا اور آنٹی اس کا قصوروار مجھے ٹھہراتی ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے ماموں! کیا میں اپنی عزت نیلام کردیتی، میں نے بددعا بھی نہیں دی تھی یہ اللہ کا انصاف تھا۔ اب اگر اللہ نے ضرار کے دل میں میرا خیال ڈالا ہے تو یہ بھی میرا قصور ہوگیا؟" اس کا سر اچانک ایک طرف ڈھلک گیا۔

"تعبیر۔" ثمرین کے چیخنے پر تنویر صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہاری جیسی گھٹیا سوچ والی عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ اگر مجھے تمہارے بڑھاپے کا خیال نہ ہوتا تو ابھی تین لفظ کہہ کر تمہیں اس گھر سے ہی نہیں اپنی زندگی سے بھی نکال دیتا۔ تب تمہیں پتا چلتا منحوس کون ہوتا ہے۔" زندگی میں پہلی بار شاہدہ نے تنویر صاحب کو اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

"تم نے میری تعبیر کو جانتے بوجھتے ایک کنویں میں پھینک دیا۔ ایک بیٹی کی ماں ہوکر بھی تم اتنی پتھر دل ہوسکتی ہو۔" شاہدہ سر جھکائے مسلسل رو رہی تھیں۔

"تعبیر کو کچھ ہوا تو میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"اور مجھے تو آپ کو اپنی ماں کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔" ثمرین بھی ناراضی سے کہتی ہوئی باپ کے پیچھے بھاگی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ۔" تنویر صاحب کی آواز سنتے ہی وہ بڑی خوشی سے بولا تھا ابھی اعجاز صاحب اسے یہی بتا رہے تھے کہ وہ بات کرکے آئے ہیں۔

"میں تو ٹھیک ہوں، لیکن تعبیر ٹھیک نہیں۔ وہ آئی سی یو میں ہے۔" ضرار کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔

"اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے اور اس کی وجہ تمہاری والدہ ہیں، تمہاری ماں نے ایسی باتیں کیں کہ میری اتنی صابر اور بہادر بچی برداشت نہیں کرسکی۔ کیا ہم تم لوگوں کے گھر اپنی بچی کے رشتے کی بھیک مانگنے آئے تھے۔ اگر آج تمہاری والدہ نہ آتیں تو مجھے پتا ہی نہ چلتا میری بیٹی کیا کیا چپ چاپ سہہ کر آئی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ تعبیر کی شادی تم سے نہ ہو تو سن لو۔ میری بیٹی اتنی فالتو نہیں۔ یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اپنی والدہ کو بھی بتا دینا۔" فون بند ہوگیا تھا، لیکن وہ یونہی فون کان سے لگائے بیٹھا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا کہ اعجاز صاحب کے ساتھ خاموش بیٹھی ناہید بھی اسے دیکھنے لگیں۔

"ضرار خیریت ہے۔ کس کا فون تھا۔" اعجاز صاحب اٹھ کر اس کے پاس آگئے۔

"تعبیر کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔"

"میرے خدا۔" اعجاز صاحب نے بے اختیار ضرار کا ہاتھ تھاما تھا۔

"کیسے ہوا۔" وہ جواب دینے کے بجائے ناہید کو دیکھنے لگا جو نظریں چرا رہی تھیں۔

"چلو اسپتال چلتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے، لیکن اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"کس منہ سے جائیں پاپا! مما نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا۔" اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں تو ناہید نے تڑپ کر اسے دیکھا جبکہ اعجاز صاحب نے بے یقینی

سے ناہید کو دیکھا۔

"انہوں نے شادی سے منع کر دیا۔" اب کہ اس کا لہجہ بھر آگیا۔

"ضرار میرے بچے تم پریشان نہ ہو میں بات کرتا ہوں۔" اپنے جوان بیٹے کو یوں ٹوٹا دیکھ کر وہ خود بھی ٹوٹ گئے تھے۔

"پتا نہیں انہوں نے ایسا کیا کہا ہوگا جو وہ اس حال میں پہنچ گئی، لیکن اب اس گھر میں میری شادی کی بات نہیں ہوگی کیوں کہ دنیا میں کوئی لڑکی تعبیر کی جگہ نہیں لے سکتی اور میں اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ اس کے سامنے جاؤں۔ اگر مما میں انسانیت باقی ہے اور انہیں میری ضرورت ہے تو وہ خود جا کر تعبیر کو لے کر آئیں گی ورنہ کچھ نہیں۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ اعجاز صاحب نے افسوس سے ناہید کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو؟" فہد نے کیے اس کے پاس رکھا تو اس نے ایک نظر اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر خود بول پڑا۔

"میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں سب حقیقت جان گیا ہوں۔ امی نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی تمہارے بارے میں، انہوں نے مجھ سے کہا تمہارا۔"

تعبیر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، وہ چہرے سے شرمندہ لگ رہا تھا۔

"میں اپنی غلطی کا ازالہ کروں گا۔ میں امی سے کہہ آیا ہوں میں ثمرین سے شادی نہیں کروں گا، میں تم سے شادی کروں گا۔ خالہ کو بھی ان کے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔"

"آپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہوئی کہ میں آپ سے شادی کروں گی۔"

"میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

"لیکن میں آپ سے پیار نہیں کرتی۔ عزت کرتی تھی، اب وہ بھی نہیں کرتی۔" شرمندگی کے مارے وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

"آپ سے صرف میرا ایک ہی رشتہ ہے کہ آپ میری بہن کے ہونے والے شوہر ہیں بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کی قدر نہیں کریں گے تو پچھتائیں گے۔" فہد نے آخری بار حسرت بھری نظروں سے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"اپنے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"

"زندگی گزارنے کے لیے کسی کی محبت کا احساس ہی بہت ہے۔" وہ بند آنکھوں کے ساتھ بولی۔

"کیا وہ خوش قسمت ضرار ہے۔" وہ خاموش رہی لیکن بند آنکھوں کے دونوں کونوں سے قطرے نکل کر بالوں میں جذب ہو گئے۔ باہر کھڑی شاہدہ ندامت کے مارے رونے لگیں ان کا دل اس کی عظمت کے آگے جھک گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تعبیر۔"

"جی ممانی۔"

"بیٹا! وہ ایک دفعہ مہندی کے تھال دیکھ لو۔"

"جی۔" وہ تیزی سے باقی چوڑیاں پہن کر باہر صحن میں رکھی مہندی کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ تب ہی کوئی اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور سامنے کھڑی شخصیت پر نظر پڑتے ہی ہاتھ میں پکڑی ٹوکری گر گئی۔

"یہاں کس کی شادی ہو رہی ہے؟" یہ سوال تعبیر کے لیے حیران کن تھا۔

"ثمرین کی۔" ناہید نے بے اختیار گہرا سانس لیا پھر وہ ہنس پڑیں اور ساتھ ہی ان کے آنسو نکل آئے تھے۔ تعبیر نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔

"یہاں شادی دیکھ کر میں ڈر گئی تھی کہ میں نے تمہیں کھو تو نہیں دیا۔ کیوں کہ اگر آج تم نہ ملتیں تو میں اپنے بیٹے کو کھو دیتی۔ میں زیادہ باتیں نہیں کروں گی تعبیر! بس یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھو، میں نے تمہارے لیے جو الفاظ استعمال کیے، میں ان

کے لیے دل سے شرمندہ ہوں، میں اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے تمہیں الزام دیتی رہی، لیکن یقین کرو اگر میں نے تمہیں تکلیف دی تو خوش میں بھی نہیں رہی کیوں کہ میرا بیٹا تکلیف میں تھا۔" یہ کہتے ہوئے ان کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

"میں تمہاری ماں تو نہیں بن سکی، جو یہ کہوں کہ ماں سمجھ کر مجھے معاف کر دو، لیکن اگر تمہارے دل میں ضرار کے لیے ذرا سی بھی جگہ ہے تو اس کی ماں سمجھ کر معاف کر دو۔" وہ جو بڑے ضبط کے ساتھ کھڑی تھی ان کے گلے لگ کر کھل کر رو پڑی۔

"میرے ضرار کی دلہن بن کر میری بیٹی بن کر اپنے گھر آجاؤ۔"

ثمرین فہد کے ساتھ ساتھ اس کا اور ضرار کا نکاح بھی ہو گیا تھا۔ وہ سب کے ساتھ بات کر رہی تھی سوائے ضرار کے، جو بہانے بہانے سے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ اس سے ناراض تھی اور اس ناراضی کا اظہار ضروری تھا۔ وہ مسلسل نظر انداز کیے جانے پر اٹھ کر چلا گیا تعبیر زیر لب مسکرا دی۔

تنویر صاحب کے بلانے پر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی۔

"ماموں۔" دروازے سے تھوڑا اندر جھانک کر اس نے آواز دی اور ابھی وہ ٹھیک سے سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ ضرار کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چیخ کے لیے کھلا منہ کھلا رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ نظر ہی نہیں ہٹا سکی۔ اس کی محویت دیکھ ضرار نے کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے مزید نزدیک کر لیا اور اب کی بار اتنی قربت پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"یہ کیا طریقہ ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"جب تم بات نہیں کرو گی تو یہی طریقہ اپنانا پڑے گا۔"

"بڑی جلدی خیال آگیا آپ کو میرا۔" اس کی آنکھ سے نکلنے والے آنسو بے ساختہ تھے۔ ضرار کی مسکراہٹ دھیمی پڑ گئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"میں تم سے بے خبر نہیں تھا۔ ہر پل کی خبر تھی مجھے، لیکن یہ دوری ضروری تھی۔ نہیں تو آج مما جو تمہیں اتنے دل سے اپنانے کو تیار ہوئی ہیں، نہ ہوتیں اور یہ جو چند گھنٹوں میں ہمارا نکاح ہو گیا تو بس۔ اگر میں اتنی ناراضی نہ دکھاتا تو۔"

"کیا آپ مجھے نہیں بتا سکتے تھے اگر میں غصے میں کسی اور سے شادی کر لیتی تو؟" اس نے روٹھے انداز میں اسے دیکھا۔

"ہو ہی نہیں سکتا تھا کیوں کہ مجھے اپنی محبت پر یقین تھا اور مجھے تم پر یقین تھا۔" اس نے مسکرا کر اس کی ناک دبائی تو وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔ دونوں کچھ دیر یونہی خاموش کھڑے رہے۔ تعبیر نے ہی سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"باہر چلنا چاہیے سب ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

"تعبیر!" اس کی بوجھل آواز پر اس نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

ضرار کے خوب صورت چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کی ہر تکلیف کا ازالہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اس کا شریک حیات بنا کر کر دیا تھا۔ اب اسے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔

"اب میں ان آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔" وہ اس کے آنسو صاف کرتا ہوا بولا تو وہ مسکرا دی۔

"آپ مجھے رونے نہیں دیجیے گا۔"

"کبھی نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا اور وہ جانتی تھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ اسے رونے نہیں دے گا۔ باہر کیسی ہی رونق تھی۔ شادیانے بج رہے تھے اور ویسے ہی شادیانے اس کے دل میں بھی بج رہے تھے۔

او دیس سیاں اپنا

صباسحر

عمران شاہ کے اندازے کے برخلاف آج انہیں نکلنے میں دیر ہوگئی تھی۔ عموماً" یہ ملاقات دو گھنٹے کی ہوا کرتی تھی مگر آج خلاف معمول آدھا گھنٹہ اوپر ہوگیا تھا۔ اس کی نظریں مستقل سامنے سختی سے بند دروازے پر جمی تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا' اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر میں سارے فلیٹوں کی بالکونیوں میں لگے بلب جلنے شروع ہوجاتے۔ یوں تو اسے اس روشنی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کی بالکونی کا بلب ہمیشہ بند رہتا تھا اور وہ کسی کی بھی نظر میں نہیں آسکتا مگر پیلے بلبوں کی مصنوعی اور طلبی روشنی کے مقابلے میں دن کی روشنی میں اسے زیادہ تاخیر سے اپنی بالکونی میں پہنچا تھا۔ تب تک وہ دونوں اندر داخل ہورہی تھیں۔ اس وقت وہ پیچھے والی لڑکی کے لباس کا بس ذرا سا حصہ دیکھ پایا تھا۔ اب آگے پیچھے سیڑھیوں سے اترتی دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر بہا چلا کہ گلابی پیراہن میں وہ نہیں' اس کی چھوٹی بہن ملبوس ہے۔ جویریہ نام ہے شاید اس کا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ سلطان نے یہی بتایا تھا۔ اسے صحیح نام یقیناً" یاد آجاتا' اگر اس کے ہاتھ کو جھٹکا نہیں لگتا۔ ماچس کی تیلی پوری جل چکی تھی۔ تپش کے احساس سے بے ساختہ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک ڈالا۔ ہونٹوں میں دبے سگریٹ کی طرف البتہ اس کا دھیان ابھی تک نہیں گیا تھا۔ وہ یونہی اس کے ہونٹوں سے چپکا رہ گیا۔

آسانی رہتی تھی۔

اس نے اضطرابی انداز میں اپنی پیشانی مسلی۔ مسلسل ڈھائی گھنٹے سے اسٹول پر بیٹھے رہنے سے اس کی کمر اینٹھ چکی تھی۔ منڈیر پر جالی کے پاس رکھے ایش ٹرے میں سگریٹ کے آٹھ جلے ہوئے ٹوٹے پڑے تھے۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے نواں سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور ماچس کی ڈبیا سے تیلی نکال کر جلانے ہی لگا تھا کہ سامنے والا دروازہ کھلا اور وہ دونوں نکلتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کی تمام حسیات بیدار ہوگئیں۔ اس نے اپنی نظریں دوبارہ سامنے والے فلیٹ پر گاڑ دیں اور سگریٹ پینے کا ارادہ ترک کرنا چاہا مگر تب تک وہ تیلی ماچس کی ڈبیا پر رگڑ چکا تھا۔

ڈھائی گھنٹے قبل سلطان کے فون کی وجہ سے وہ کچھ

اسٹول سے اٹھ کر وہ جالی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے زینہ اترتی لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی چھوٹی بہن پیچھے پیچھے کچھ بولتی ہوئی جارہی تھی' جسے وہ پتا نہیں سن رہی تھی یا نظرانداز کررہی تھی۔ نیچے اترنے تک وہ دونوں پانچ مرتبہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھیں مگر اس کی نظروں نے ان کا تعاقب ہرگز نہیں چھوڑا تھا۔

اب وہ بے فکر ہو کر جالی میں بنی کھڑکی میں سے سر نکال کر نیچے جھانک رہا تھا۔ وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے جاکر مڑ گئیں تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ تب اس کے ہونٹوں سے چپکا ہوا سگریٹ گر گیا۔ وہ اپنی بے خیالی پر چونک سا گیا۔ اسی

کیفیت میں وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا مگر پھر گندگی کا احساس کرکے سیدھا ہو گیا اور قریب ہی پڑا پیکٹ اٹھایا جو اب خالی ہو چکا تھا۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔

☼ ☼ ☼

فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی کی وجہ سے وہ عجلت میں تولیہ لپیٹتا ہوا باتھ روم سے نکلا اور گھنٹی کے دم توڑنے سے پہلے ہی ریسیور اٹھالیا۔

"عمران شاہ۔" اس کی بھاری آواز ماؤتھ پیس تک پہنچی۔

"شام کو آنا پڑے گا۔" دوسری طرف سلطان تھا۔

"موڈ نہیں ہے یار! اور کچھ مصروفیت بھی تھی۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"تمہاری فائل اپروو ہو گئی تھی مگر اے ڈی صاحب نے کچھ اوبجیکشنز۔ کرکے اسے سائیڈ میں کر دیا۔ میں نے سوچا تمہاری ڈائریکٹ میٹنگ کروادوں ان کے ساتھ۔ دراصل مجھے پیسوں کی سخت اور فوری ضرورت ہے۔" وہ بغیر ہچکچائے بولا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ آتا ہوں۔" اس نے رضامندی دی۔

فون بند کرکے وہ اپنے کمرے میں گیا اور کپڑے تبدیل کرکے کچن میں چلا آیا۔ برقی کیتلی میں چائے چڑھائی اور ٹوسٹر کا پلگ لگایا۔ دس منٹ بعد وہ خوش گوار موڈ میں گنگناتے ہوئے ناشتا کر رہا تھا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اسے اپنے کپڑے دوبارہ تبدیل کرنے کا خیال آگیا۔

وہ ایسا ہی تھا نا قابل فہم۔

ناشتا کرنے کے بعد اس نے اپنے ناشتے کے مختصر برتن دھوئے اور کمرے میں آکر الماری سے دوسرے کپڑے نکال کر تبدیل کرنے چلا گیا۔ اب اس کا موڈ مزید اچھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یار! آج تو مُہر لگ گئی تمہارے بارے میں میرے خیالات پر۔"

سلطان نے کافی جوش سے کہا۔ عمران کے چہرے پر ایک مدبرانہ مسکراہٹ آگئی۔ اس کی یہ مسکراہٹ مصنوعی ہرگز نہیں تھی۔ وہ ایک بردبار، سنجیدہ اور شریف آدمی تھا۔

اونچا، لمبا، سرخ سفید، آواز انداز، طرز گفتگو اور نشست و برخاست کے لحاظ سے ایک بارعب، معزز اور ڈیشنگ آدمی تھا۔ اس کے متاثرین میں صرف خواتین ہی نہیں، حضرات بھی شامل تھے اور ان میں سلطان جیسے حریص اور کم ظرف ہی نہیں، خود عمران شاہ جیسے معزز اور سلجھے ہوئے افراد بھی شامل تھے۔

یہی وجہ تھی کہ اے ڈی صاحب نے دس منٹ کی مختصر سی ملاقات میں نہ صرف اس کی موجودہ فائل پاس کر دی تھی بلکہ آئندہ بھی انہوں نے براہ راست ڈیلنگ کی پیشکش کر دی تھی جو کہ سلطان کو خاصی ناگوار گزری تھی مگر وہ خاموش رہنے پر مجبور تھا اور اب باہر آکر اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی تعریف میں قلابے ملاتے ہوئے وہ آئندہ کے لیے بھی اپنی راہ ہموار کر رہا تھا۔

سلطان سے اس کی شناسائی زیادہ پرانی نہیں تھی۔ کے بی سی اے آفس میں اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اے ڈی کی عدم موجودگی میں اسے سلطان کے پاس کچھ دیر بیٹھنا پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے مقاصد کے لیے پسند کر لیا تھا۔ تھوڑے دنوں کی ملاقات میں وہ سلطان کو مزید اچھی طرح سمجھ گیا تھا مگر دوسری جانب سے ایسا دعوا ہرگز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان سے اسے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ اس کی فائلوں کو نمبر پر نہیں لگنا پڑتا تھا اور سلطان کو یہ فائدہ تھا کہ اسے ایک فائل آگے پہنچانے کے دس ہزار مل جاتے تھے۔ دس بیس ہزار عمران شاہ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھے۔ معاوضہ دینے میں وہ نہ بخل کرتا تھا نہ تاخیر، مگر بدلے میں اس کو جو فائدہ ہو رہا تھا اس کے لیے اگر وہ سلطان کو چائے پانی کے ایک دو لاکھ بھی دے دیتا، تب بھی گھاٹا نہیں تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد وہ دونوں ایک اچھے فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھاتے، پھر عمران شاہ اسے اس کے گھر چھوڑ دیتا۔ اکثر وہ اسے اس کے چچا کے گھر بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ وہ شہر کے ہر بڑے ہوٹل میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور کھانا کھائے، سو اس وقت وہ اس کی خواہش پر اسے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھلانے لایا تھا۔

"جویریہ کی بات چل رہی ہے آج کل۔" سلطان نے مٹن کڑاہی کا بڑا سا نوالہ لیتے ہوئے بتایا۔

"ہوں! مطلب مجھے صحیح یاد تھا۔ اس کا نام جویریہ ہی ہے۔" عمران سوچ کر مسکرا دیا۔

"اس کا معاملہ بھی جلد نمٹ جائے گا۔ جس طرح فائزہ کا نمٹ گیا تھا۔ لڑکیاں خوب صورت ہوں تو یہی آسانی ہوتی ہے۔" سلطان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"خوب صورت تو ان کی بڑی بہن بھی ہے۔" عمران نے سرسری انداز میں کہا۔

"وہ خوب صورت نہیں ہے..... حسین ہے حسین ..... مگر ذرا اوکھی ہے۔ دماغ نہیں ملتا اس کا۔ مجھے افلاطون قسم کی لڑکیاں پسند نہیں۔" سلطان نے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جانے پر فروٹ ٹرائفل سے پیالی بھری۔ عمران نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"کچھ اور منگواؤں؟" کچھ دیر بعد عمران نے اسے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں بس شکریہ۔ اب تم مجھے چچا جان کے گھر ڈراپ کردو۔"

عمران نے سر ہلا دیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اب اپنے چچا کے گھر ہی جائے گا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے جیسے چند اوباش دوستوں میں گھنٹہ دو گھنٹہ گزارنے کے بعد اپنے گھر جائے گا اور صبح آفس پہنچتے ہی آفس کے لینڈ لائن سے اسے فون کرکے اپنے چچا جان سے ہونے والی ہر وہ بات بتائے گا جو کل شام کو اس کے سامنے والے فلیٹ کے رہائشی سے ڈھائی گھنٹے میں ان کی چھوٹی بیٹی جویریہ اور بڑی بیٹی سنبل نے کی۔

عمران شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کے چچا جان کے گھر کی طرف گاڑی موڑلی۔

☼ ☼ ☼

الحبیب اسکوائر میں تقریباً" سو فلیٹس تھے، جو پانچ پانچ منزلہ عمارتوں پر مشتمل تھے۔ وہ ایک چھوٹا پروجیکٹ تھا۔ زیادہ تر سفید پوش لوگ رہتے تھے۔ ہر بلڈنگ کے درمیان فاصلہ تقریباً" سو گز تھا۔ سب فلیٹس ایک ہی رخ پر بنے ہوئے تھے۔ یعنی ایک بلڈنگ کی بالکونی کے سامنے دوسری بلڈنگ کا داخلی دروازہ تھا۔ سو سامنے والوں کے کچن اور بیڈ روم کی کھڑکی اس کی بالکنی کے سامنے کھلتی تھی۔ فاصلہ اتنا تھا کہ ایک شخص اپنے کچن سے سامنے والی بلڈنگ کی بالکونی میں کھڑے کسی بھی شخص کو نہ صرف باآسانی دیکھ سکتا تھا بلکہ چاہے تو بات چیت بھی کر سکتا تھا۔

وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ بہت چھوٹا تھا۔ جب اس کے والدین کی وفات ہوئی۔ اسے اس کی نانی نے پالا تھا۔ اس کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ نانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ بہت عرصے بعد آیا تو اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں رہائش اور بزنس شروع کیا۔ ہر چھ مہینے میں ایک دفعہ اس شہر میں اس کا آنا ہوتا تو اپنی نانی کے اسی پرانے فلیٹ میں ٹھہرتا جہاں اس کی بہت سی پرانی یادیں موجود تھیں۔ چونکہ یہاں اس کا قیام مختصر ہوتا، اس لیے وہ ملازم رکھنے کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ ویسے بھی اسے اپنے کام خود کرنے کی عادت تھی۔

عمران شاہ کی بالکونی کے سامنے ظفر دلاور کا فلیٹ تھا۔ جنہوں نے اپنے فلیٹ میں میرج بیورو کھولا ہوا تھا۔ ظفر دلاور کافی مہذب اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کے سر پر پچاس سے زائد کامیاب شادیوں کا سہرا بندھا تھا۔ اس کے ذاتی تجربے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا، سوائے فائزہ کے اور اب جویریہ کے، لیکن وہ بالواسطہ طور پر ان کی پروفیشنلزم کا قائل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ وہ اپنی تیاری کر کے بالکونی میں آبیٹھا۔ اس کی گیلری میں لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔ جب سے سلطان کی کزن یہاں آنے لگی تھی، عمران نے اس جالی پر بھی جالی کا پردہ ڈال دیا تھا۔ جس سے اندر سے دیکھنے والے کو تو باہر کے مناظر آسانی سے نظر آسکتے تھے مگر باہر والے کو بالکل پتا نہیں چلتا تھا کہ اس جالی کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا ہے اور اس صورت میں تو ہرگز نہیں کہ جب کسی کا دھیان اس طرف ہو ہی نہیں۔ مزید یہ کہ اس نے گیلری میں بندھی رسی پر کپڑے بھی پھیلا دیے تھے اور وہ خود بھی ملکے رنگ کے لباس میں ساری روشنیاں گل کر کے بیٹھتا تھا۔ وقت گزاری کا سامان اس کے پاس رکھا ہوا تھا۔ سگریٹ کا نیا پیکٹ اور ایش ٹرے۔

پہلا ہی سگریٹ جلایا تھا کہ سنبل اور جویریہ کی آمد ہوگئی۔ وہ انہیں چار منٹ تک دیکھ سکا۔ اس کے بعد وہ ظفر دلاور کے فلیٹ میں داخل ہوگئیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ہفتے پندرہ دن میں ایک بار تین چار منٹ آتے ہوئے اور تین چار مرتبہ انہیں جاتے ہوئے دیکھنے کی خاطر اسے دو گھنٹے اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یوں چوری چھپے دیکھنا اس کی عادت نہیں تھی مگر وہ مجبور تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اسے ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی نظر میں پچھلے چار ماہ کے واقعات گھوم گئے۔

☼ ☼ ☼

"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" سلطان نے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت ایک شان دار ہوٹل میں ڈنر کر رہے تھے۔

"کوئی ملی نہیں۔" اس نے سیدھا جواب دیا۔

"کیسی چاہیے؟" سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں بس میرے جیسی ہو۔"

"یعنی حسین اور ذہین۔ ہے نا؟" سلطان نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی ہنس دیا۔

"کتنی ذہین؟" سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ایک پلیٹ ذہین۔" عمران شاہ نے فوراً جواب دیا۔ سلطان نے بھنویں سکیڑ کر دیکھا۔

"یار! ذہانت کی بھی مقدار ہوتی ہے کیا۔ ذہین مطلب ذہین بس اور کیا؟" اس نے اپنی پلیٹ کھسکائی اور گلاس اٹھا لیا جبکہ سلطان اپنی پلیٹ میں مزید سنگاپورین رائس نکالتے ہوئے پرسوچ انداز میں سرہلا رہا تھا۔ عمران پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے ایک بھرپور چمچہ منہ میں انڈیلا اور اس کی طرف دیکھا۔

"میری ایک کزن ہے۔۔۔ سنبل۔۔۔ اس کے حسن کو کسی سے تشبیہ دینا اس کے حسن کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ غریب ہے اور کوئی اپروچ بھی نہیں، ورنہ جہاں جاتی تہلکہ مچا ہوتا۔ یوں سمجھو۔۔۔ فیمیل عمران شاہ ہے۔"

اس کی مثال پر عمران کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔ تاہم وہ خاموش رہا۔

"میری چچی ان پڑھ ہیں اور چچا بزدلی کی حد تک شریف اور سیدھے۔ انہیں بھی اپنی بیٹی کی غیر معمولی خوب صورتی کا احساس ہے۔ اس لیے انہوں نے ہمیشہ اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کی۔ گھر میں پڑھتی تھی۔ صرف ایگزام دینے جاتی تھی اور وہ بھی نقاب میں۔ اسی طرح ماسٹرز کیا۔ گھریلو حالات کی وجہ سے نوکری کی ضرورت پیش آئی تو چچا خود ساتھ لے کر جانے لگے۔ کافی عرصے تک تو وہ راضی ہی نہیں ہوئے تھے۔ بے چاری دو سال تک گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا پڑھا کر چچا کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اس کے مقدر میں باہر نکلنا تھا۔ چچا کو فالج ہوگیا۔ اس نے باقاعدہ نوکری کرنے کی ضد کی اور چچا کو اجازت دینی پڑی مگر پھر اس کے ساتھ مجھے بھیجنے لگے۔"

ڈکار لینے کی وجہ سے اس کی کہانی میں وقفہ آگیا۔ عمران شاہ کو اس کی کہانی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی، تاہم اس نے سلطان کو ٹوکا بھی نہیں۔ وہ ایک بہترین سامع تھا۔ اس نے کھانا ختم کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تو وہ سمجھ گیا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے۔ اس نے ویٹر کو بلا کر بل دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ دونوں پارکنگ تک آئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر عمران شاہ نے سوالیہ نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا۔

"چچا جان کے گھر۔" سلطان نے مسکرا کر کہا۔ عمران نے سرہلاتے ہوئے جونہی گاڑی اسٹارٹ کی، سلطان بھی دوبارہ شروع ہوگیا۔

"چچا کی سخت ہدایت کی وجہ سے مجھے بھی اسے نقاب میں لے کر جانا پڑتا۔ پھر ایک جگہ بات بن گئی۔ میں نے چچا جان کو وہاں کی ایک ایک بات بتائی مگر چچا مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ جاب ہاتھ سے گئی اور صرف وہی نہیں، ایسی دسیوں نوکریاں بس ایک چچا جان کے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے سنبل کو چھوڑنی پڑیں۔ پھر چچا کے کسی پرانے دوست نے اسے اپنے آفس میں جاب دے کر ان کا مسئلہ حل کر دیا۔ چچا کو اپنے دوست پر کافی اعتبار تھا اور صحیح بھی تھا۔ آج تین سال ہو رہے ہیں اسے وہاں جاب کرتے ہوئے۔ دوست پر بے پناہ اعتبار کے باوجود سنبل کو سخت ہدایتیں تھیں۔ جویریہ اور فائزہ نے بھی پرائیویٹ پڑھا۔ انہوں نے بھی جاب کرنے کی فرمائش کی مگر چچا جان نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ وہ ان دونوں کے لیے مزید رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ سنبل نے بھی کبھی ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ چچا فخر کرتے ہیں اپنی بیٹی پر۔ چچی کو بھی بڑا اعتماد ہے اور اس کی چھوٹی بہنوں کو بھی بہت مان ہے اس پر اور مجھے بھی۔" سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر گاڑی کی پشت پر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔

"وہ میری منگیتر بھی تھی۔" وہ آنکھیں موندے بڑبڑایا۔ اس پورے قصے میں عمران پہلی بار چونکا تھا۔

"تھی؟" اور پہلی ہی بار دلچسپی لے کر کوئی سوال کیا تھا۔

"ہاں تھی۔۔۔ بچپن کی منگیتر تھی۔ میں نے خود ہی منگنی توڑ دی۔" اس کا انداز لاپروا سا تھا۔

"کیوں۔۔۔ جب کہ تم نے ابھی، خود ہی بتایا کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔" اسے سخت تعجب ہوا تھا۔

"ہاں مگر شاید میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے افلاطون قسم کی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔" اس نے اسی اطمینان سے کہا۔ ایک لمحے کو عمران شاہ نے ڈرائیونگ پر سے توجہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

"میرے نزدیک عورت کو مرد سے کمتر ہونا چاہیے۔ وہ ہر معاملے میں مرد سے نیچے رہے تو زیادہ بہتر ہے۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اب کے سلطان نے گردن موڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ عمران شاہ خاموش رہا مگر اس کی بات سن کر اس وقت اس کا دل چاہا کہ سلطان کو اسپیڈ بریکر بنا کر اس پر گاڑی چڑھا دے۔ اس نے رفتار بڑھا دی اور اس کے چچا کے گھر پہنچنے تک کوئی بات نہیں کی۔ گھر کے قریب گاڑی رکی تو سلطان نے اتر کر مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جوابی مسکراہٹ نہیں دے سکا۔ جس کا سلطان نے کوئی نوٹس بھی نہیں لیا۔ اس نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھالی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے منگنی توڑنے پر تمہارے چچا نے وجہ تو پوچھی ہوگی۔ تم نے ان کو کیا بتایا؟" عمران کو اب کچھ کچھ دلچسپی ہو چلی تھی۔

"جو سچ تھا۔" سلطان نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

"مطلب تم نے یہی کہہ دیا تھا کہ تمہیں افلاطون قسم کی لڑکیاں پسند نہیں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا تھا، مجھے عورت مرد کے پیروں کے نیچے ہی اچھی لگتی ہے۔" اس کے جواب پر عمران نے ہونٹ بھینچ لیے۔ بعید تھا کہ وہ اتنی زور سے بریک لگاتا کہ سلطان ونڈ اسکرین توڑ کر باہر جا گرتا مگر اس نے قابو رکھا خود پر۔ اس کا سیلف کنٹرول غضب کا تھا۔ سلطان کو اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

"چچا کافی ناراض ہوئے۔ چچی نے تو خوب برا بھلا کہا

مجھے۔ اس کی بہنیں تو آج بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتیں مجھ سے۔ خود میرے گھر والوں نے بھی بڑی لعن طعن کی مجھ پہ۔" وہ ہنسا۔

"اور تمہاری منگیتر نے؟" اس نے سرسری سا پوچھا۔

"اس نے؟" وہ تلخی سے ہنسا۔ "اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس نے کہا' سلطان! تم نے مجھے گستاخ کہلانے سے بچالیا۔ لوٹس آف تھینکس۔"

"اس کو برا نہیں لگا کہ تم نے اسے ٹھکرا دیا ہے؟" عمران شاہ کو اس کی کزن کا جواب عجیب سا لگا تھا۔ سلطان بے ڈھنگے انداز میں ہنس دیا۔

"اس نے کہا تھا سلطان! دنیا میں دو ہی اصناف ہیں مرد اور عورت۔ اگر اللہ کسی ایک صنف کو دوسری پر برتری دیتا تو اس کے انصاف پر حرف آسکتا تھا۔ سو اس نے رشتوں کے تقدس میں درجہ بندی کرکے دونوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دے دی۔ ایسے مردوں کو پسند کرنا تو دور کی بات' میں تو انہیں مرد ہی نہیں مانتی جو دوسروں کے حقوق تسلیم نہ کرتے ہوں۔ اگر مرد عورت کو پیر کی جوتی سمجھتا ہے تو یہ بھی عورت کی اسے دی ہوئی عزت ہے' جس کا وہ غلط استعمال کرتا ہے۔ یہ محبت ہوتی ہے' جس کی وجہ سے عورت بیوی بن کر مرد کی تابع ہو جاتی ہے اور ماں بن کر مہربان۔ ورنہ عرش سے اٹھا کر مرد کو زمین پر پٹخنا اسے بھی آتا ہے اور سلطان...! مجھے ابھی تم سے ذرا بھی محبت نہیں ہوئی ہے۔"

اپنی کزن کا وہ جواب سلطان شاید بھولا نہیں تھا۔ اس لیے زیر زبر کی غلطی کے بغیر پورا جواب کہہ سنایا۔

"اسی لیے تو مجھے زیادہ پڑھ لکھ جانے والی عورتیں پسند نہیں۔"

اس کے دل و دماغ میں یقیناً "پرانی تلخی گھل گئی تھی مگر عمران شاہ کے سینے میں جیسے ٹھنڈ سی پڑ گئی تھی۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔ اس کو عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔ اس لمحے اسے سلطان کی وہ کزن بہت اچھی لگی' حالانکہ اس نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک فائل پہ دستخط کرکے اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا ہی تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا تو آواز سے پتا چلا' دوسری طرف سلطان ہے۔

"ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" وہ ہمیشہ بے وقت فون کر کے یہی پوچھتا تھا اور بیشتر مرتبہ مصروف ہونے کے باوجود اس نے کبھی اس کی دل شکنی نہیں کی تھی۔

"نہیں۔ کہو کیا چل رہا ہے؟" اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے اپنی دونوں بہنوں کی شادی کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک میرج بیورو سے رابطہ کیا ہے۔"

"اچھا۔" وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا مگر اتنا ہی کہہ سکا۔

"خاندان میں وہ کرنا نہیں چاہتی۔ آس پڑوس والوں کو بھی اس قابل نہیں سمجھتی۔ حلقہ احباب بھی نہیں ہے کوئی تو اس کے پاس یہی آپشن بچا تھا۔"

"ہوں۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"چچی کل پھر غصہ ہو رہی تھیں مجھ پر۔ مگر چچا مجھے ہر بات بتاتے ہیں۔ چچا بھول جاتے ہیں تو سنبل خود بتا دیتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ بااعتماد ہے وہ۔ منہ کے بل گرتی ہیں ایسی لڑکیاں۔ اسی زعم میں اکثر ناقابل تلافی نقصان بھی ہو جاتا ہے ایسی لڑکیوں کا۔" اس کا شاید حلق کڑوا ہو گیا تھا۔ اس لیے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تمہیں اس پر غصہ آرہا ہے؟" عمران شاہ نے سکون سے پوچھا۔ زیر لب مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

"اکثر آتا ہے۔ اس کی باتوں پہ میرا دل چاہتا ہے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دوں۔" عمران شاہ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ سلطان سے باتیں کرتے ہوئے اسے ہمیشہ کڑے ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

"کیوں اب اس نے ایسا کیا کہہ دیا؟" عمران نے تحمل سے پوچھا۔

"چچا ان کی شادیوں کے حوالے سے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سنبل بڑی ہے' پہلے اس کی ہو۔ جبکہ اس کا کہنا ہے کہ وہ جویریہ اور فائزہ کی شادی کرکے پھر اپنی کرے گی۔ چچا چچی اس کی اس بات پر پریشان تھے۔ اس نے کہا' ساری پریشانی اچھے رشتوں کی تلاش کی ہے۔ جیسے ہی ان کے لیے اچھے لوگ ملے' جھٹ پٹ شادی کردیں گے۔ چچا کہنے لگے ساری پریشانی ہی یہی ہے' اچھے رشتے ہی تو نہیں ملتے۔ ان کی یہ تکرار سن کر میں نے کہہ دیا کہ میں جویریہ سے شادی کرلیتا ہوں۔ بس پھر سمجھو گویا قیامت آگئی۔" ریسیور سے اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی' جو عمران شاہ کو شدید بری لگی۔

"چچی جان تو مجھے گالیاں دے کر خاموش ہو گئیں۔ جویریہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی۔ چچا جان اور سنبل کے تیور البتہ جارحانہ نہیں تھے۔ مجھے لگا شاید چچا جان راضی ہیں۔ بھئی آخر میں ان کا اکلوتا بھتیجا ہوں اور کماؤ پوت بھی ہوں اور یار! گھٹنا تو ہمیشہ پیٹ کی ہی طرف مڑتا ہے نا...... مگر شاید وہ سنبل اور چچی جان کی وجہ سے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کرپا رہے تھے۔ میں نے ان کا حوصلہ بڑھانے کو صرف اتنا کہا۔ چچا جان! میرا اعتبار کریں۔ میں جویریہ کو بہت خوش رکھوں گا۔ بس! غضب ہو گیا تھا اتنا کہنا......

"آپ اگر اتنے ہی باعث مسرت ہوتے ہمارے لیے تو منگنی ٹوٹنے پہ بجو یوں مسرور ہوتیں' نہ جویریہ یوں پاؤں پٹخ کر اندر جاتی۔ ابا کے غلط فیصلے پر بجو کی احتراماً" خاموشی کو اگر آپ ان کی رضامندی سمجھ رہے تھے تو غلطی پر تھے۔ وہ وقت تمام ہوا۔ ہماری طرف سے دوبارہ کوئی خوش فہمی پالیں گے تو پھر غلطی کریں گے۔ آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ خود کو ہمارا صرف تایا زاد کہلوائیے......" دوسرے کمرے سے فائزہ نکل کر بولی' پھر وہ بھی پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی۔ چچا جان کو اسی وقت کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ شہزادی...... وہ یوں آرام سے چچا جان کے لیے پانی لینے چل دی' جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

سلطان کے لہجے میں اتنا ہی غصہ تھا جتنا شاید اسے اس وقت آیا ہوگا۔ عمران شاہ نے خاموش رہنا بہتر جانا۔ اسے اس کے مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اسی گز کا دو منزلہ گھر سلیقے سے لگے برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ نیا روغن بھی مکینوں کی خوشی میں شامل ہو کر مکان کی خوب صورتی اور چمک میں اضافہ کر رہا تھا۔ عمران نے گھر سے کچھ دور گلی کے کونے پر گاڑی روکی۔

"یہ سلیم احمد ہیں۔ چچا جان کے وہ دوست جن کے پاس سنبل کام کرتی ہے۔"

سلطان نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترتے ہوئے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑے موبائل پر بات کرتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ عمران نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ وہ خاصے معزز اور شریف آدمی لگ رہے تھے۔ اس کے اندازے کے علاوہ سنبل کا ان کے پاس تین سال سے جاب کرنا بھی اس بات کا ثبوت تھا۔ گلی کے دوسرے کونے پر بنے بڑے سے میدان میں ایک بڑا اور خوب صورت شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس جگہ پر بھی بہت خوب صورت سی لائٹنگ کی ہوئی تھی۔ بہت سارے مہمان نظر آرہے تھے۔ دو باراتیں آئی ہوئی تھیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور چچا جان کا اکلوتا اور کماؤ پوت بھتیجا جو کچھ دن پہلے رشتے داروں' محبت اور خلوص پر بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا' اپنے سگے چچا کی بیٹیوں کی شادی میں کسی مہمان کی طرح شریک ہو رہا تھا۔ سلطان گاڑی سے اترا اور ہاتھ ہلاتا ہوا شامیانے کی طرف چل پڑا۔ اس نے اخلاقاً" بھی اسے شادی میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔ عمران نے گاڑی گھمائی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا۔

گراؤنڈ خاصا بڑا تھا۔ شامیانہ گراؤنڈ کے عین بیچ میں لگایا گیا تھا۔ چاروں طرف سے اچھی خاصی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ گراؤنڈ کی ایک فٹ کی دیوار پر تین فٹ کی لوہے کی گرل لگی ہوئی تھیں۔ جن کے ایک طرف سات آٹھ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ پانچ گاڑیاں اندر بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ جن میں دو گاڑیاں دولہا کی بھی تھیں۔ اندر کھڑی گاڑیوں میں ایک سیاہ ہنڈائی ریورس ہوئی اور میدان کے دوسرے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ عمران شاہ نے کار اسٹیریو آن کردیا۔

☼ ☼ ☼

"میں ایگری کرتا ہوں مگر تین مہینے بہت کم ہیں۔ کام بڑا ہے۔ میرا ویزا بڑھا دینا۔"

سلطان نے سرسری سا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا جبکہ دبئی میں ریٹرن ٹکٹ کے ساتھ تین ماہ کا قیام سن کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ دبئی کے بہترین ہوٹل ڈیزرٹ پام میں قیام اور پورا شہر گھومنے کی پیش کش پر وہ واضح طور پر اچھلا تھا مگر عمران کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے اس نے اپنی مسرت کا کھل کر اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور قدرے بے نیازی سے ہامی بھری۔

"پھر کب کی ٹکٹ کروا دوں؟" عمران شاہ نے سامنے کھلی فائل بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پرسوں کی صحیح رہے گی۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"اتنی جلدی؟" اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تمہیں اپنے آفس میں لیو دینی ہوگی۔ گھر میں بات کرنی ہوگی۔ پیکنگ بھی کرنی ہوگی اور بھی کئی کام ہو سکتے ہیں۔"

اس نے سلطان کے اتنی جلدی تیار ہو جانے پر حیران ہو کر کہا۔ اس کے خیال میں اسے غیر متوقع طور پر دبئی جانے میں کافی وقت لگے گا۔ چھوٹے موٹے سینکڑوں کام نمٹانے ہوں گے اسے۔

"آفس کی خیر ہے یار! نوکری سے زیادہ تمہارا کام اہم ہے۔ تمہارے کام کے لیے مجھے اپنی یہ جاب چھوڑنی بھی پڑے گی تو میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔"

اس کی جان نثاری پہ عمران شاہ نے صرف مسکرانے پہ اکتفا کیا۔ البتہ نوکری کی بابت اس نے سچ کہا۔ اس کو اس نوکری سے اتنا فائدہ نہیں تھا' جتنا اس کے دیے ہوئے کمیشن پہ وہ عیش کیا کرتا تھا۔

"ابھی جاتے کے ساتھ ہی پیکنگ کرلوں گا۔ پیکنگ بھی ایسی کوئی لمبی چوڑی نہیں ہے۔ وہیں جاکر تھوڑی بہت ضرورت کی چیزیں لے لوں گا۔" اس نے لہجے کو عام سا بنانے کی کوشش کی۔ عمران نے انٹرکام اٹھایا۔

"خالد! دبئی کی ایک سیٹ ریزرو کروا دو جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔۔۔ نہیں ریٹرن نہیں۔۔۔ ابھی واپسی کنفرم نہیں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کھل کر مسکرا دیا۔

"تم تیاری کرلو۔ خالد کل پرسوں کی ہی سیٹ بک کروائے گا۔" عمران کی یقین دہانی پر وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ خوب زور سے ہاتھ ملایا اور دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی عمران بے ساختہ زور سے ہنس پڑا۔

"کمینے لوگ بھی بڑے کام کے ہوتے ہیں۔"

وہ سلطان کو دبئی میں مقیم کالج کے زمانے کے ایک بہترین دوست احمد مجتبیٰ کو اپنا کاروباری حلیف کہہ کر اس کے پاس بھیج رہا تھا' جو دراصل دبئی کی مشہور کنسٹرکشن کمپنی احمد بن ڈیسمل میں پچاس فیصد کا مالک تھا۔ سلطان نے اس سے مل کر خود کو عمران شاہ کی کمپنی آئی ایم کنسٹرکشنز کا مینجر جتانا تھا اور دبئی میں اس کی نئی برانچ کھولنے کے سلسلے میں اس کا مکمل تعاون مانگنا تھا بس۔ اس کام کے لیے تین ماہ بہت تھے مگر اس نے سلطان کو دبئی میں سکون سے عیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔

سلطان کو ایرپورٹ پر سی آف کر کے اس نے گاڑی وہیں موڑی جہاں وہ اکثر سلطان کے ساتھ جا[illegible] تھا۔

☼ ☼ ☼

"بے شک آج وہ ایک بڑا آدمی بن گیا ہے مگر اسے بادشاہ بنانے والا میں ہوں۔ اس کے پاس صرف پیسہ ہے۔ عقل نہیں اور پہلے تو پیسہ بھی نہیں تھا۔" احمد مجتبیٰ نے بغیر تحریف کے اسے سلطان کا بیان کہہ سنایا۔

"تم نے پوچھا نہیں پھر تمہارے پاس پیسہ کیوں نہیں ہے؟" عمران نے پوچھا۔ دوسری طرف مجتبیٰ ہنس دیا۔ "آگے کا بتاؤ۔"

"پروگرام سمیٹ لو یار!" عمران نے اکتا کر کہا۔ احمد مجتبیٰ نے اوکے کہہ کر فون بند کردیا۔

سلطان نے تین ماہ بعد آنے کے بجائے اپنا ویزا مزید تین ماہ کے لیے بڑھوا لیا۔ عمران شاہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خالد کو ویزے کی معیاد بڑھانے کو کہہ دیا مگر جب مزید تین ماہ کے لیے اس نے کہا تو عمران کی کشادہ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ تاہم تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ اوکے کہہ کر کام کے حوالے سے چند ایک باتیں کیں۔ اس نے سب بہترین کی رپورٹ دی۔ عمران نے مطمئن ہو کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر انٹرکام پہ خالد کو مخاطب کیا۔

"خالد! سلطان صاحب کا ویزا صرف پندرہ دن کے لیے ایکسٹینڈ کروا دو مگر انہیں اطلاع تین ماہ کی ہی دینا اور جب وہ پاکستان تشریف لے آئیں تو انہیں نہایت احترام کے ساتھ میرے گھر لے آنا۔"

☼ ☼ ☼

وہ نہایت غصے میں تھا مگر چونکہ اس کے پاس اس غصے کا جواز نہیں تھا' اس لیے خاموش رہنے پہ مجبور تھا۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھا وہ مسلسل پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ گاڑی عمران کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس نے اسے عمران کے آفس سے پک کیا تھا۔

"سر! ہم نہایت معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا ویزا ایکسپائر ہوچکا ہے۔" دبئی پولیس کے اس نوٹس پہ وہ تلملا گیا تھا۔ اس نے فوراً عمران کو فون ملایا۔ اس کا نمبر بند ملا۔ اس نے آفس میں فون کیا۔ خالد نے بتایا وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔ اس نے مجتبیٰ کو فون کیا۔ مسلسل کئی بیلوں پر بھی اس نے فون نہیں اٹھایا تھا۔

ٹھیک تین دن بعد وہ عمران کے آفس میں تھا۔

"عمران صاحب ایک ہفتے سے آفس نہیں آرہے ہیں۔ آپ کے لیے حکم تھا کہ آپ جیسے ہی آئیں' ان سے گھر پہ ملاقات کرلیں۔" خالد نے مودبانہ بتایا۔

"آپ کو ڈرائیور چھوڑ آئے گا ان کے گھر۔"

پھر جب ڈرائیور سر پہ آکر کھڑا ہو گیا تو اسے ناچار اٹھنا پڑا۔

وہ پہلی دفعہ عمران کے گھر آیا تھا۔ اچھا خاصا خوب صورت بنگلہ تھا۔ اسے اپنے ڈی پورٹ ہونے کا غم بھول نہیں رہا تھا مگر اس کا شان دار گھر دیکھ کر جیسے اسے چپ لگ گئی۔

"عمران نے کبھی بتایا نہیں' اس گھر کا اتنا خوب صورت ہے۔۔۔ میں نے بھی تو نہیں کہا کبھی۔۔۔ اگر کہتا تو ضرور دکھاتا۔۔۔ اب تک اس نے میری ہر بات مانی ہی ہے۔"

اس کے بہت خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس نے تسلیم کیا۔

"کیسے ہو سلطان!" عمران خوش دلی سے کہتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ سلطان کھڑا ہو گیا۔ عمران کے تپاک سے ملنے پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرایا۔

"کہیں جا رہے ہو یا کہیں سے آرہے ہو؟" اس کو نیوی بلیو تھری پیس سوٹ میں دیکھ کر اس نے سرسری سا پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ایک ڈنر پہ جا رہا ہوں۔ فیملی ڈنر ہے ورنہ تمہیں بھی آفر کرتا۔" اس نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے خوش مزاجی سے کہا۔

عمران اسے ہمیشہ بہت اچھے موڈ میں ملا۔ اس کی اخلاقیات اور خوش کلامی کا وہ ہمیشہ سے معترف رہا ہے

مگر آج کوئی خاص بات محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھنا چاہا۔ اسی وقت عمران کا موبائل بج اٹھا اور اسی وقت ملازم کولڈ ڈرنک لے آیا۔ وہ کولڈ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا عمران کو دیکھنے لگا۔ اس کی وجیہہ اور بارعب شخصیت کے سامنے اس نے ہمیشہ خود کو مرعوب محسوس کیا تھا۔

کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے اس نے یہ بھی تسلیم کیا۔

"تین مہینے کا کہہ کر تم نے صرف پندرہ دن کا ویزا ایکسٹینٹ کروایا۔۔۔ کیوں؟"

یہ سوال بھول کر اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کام کے بارے میں اس کو کیا بتائے گا جس کے لیے عمران نے اسے دبئی بھیجا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عمران اسے کچھ نہیں کہے گا لیکن تب بھی اگر اس نے یہ ہی پوچھ لیا کہ جب کام نہیں کیا تو وہ تفصیلات کس چیز کی تھیں جو وہ فون پہ بتا رہا تھا۔

"چلیں؟" ایک سریلی زنانہ مانوس سی آواز پہ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

مہندی سبز اور گہرے نارنجی رنگ کے امتزاج کے جدید تراش والے سوٹ میں ملبوس وہ موبائل پہ مصروف سی اندر داخل ہوئی۔ بڑا سا کام دار دوپٹا اس کے دائیں شانے پر پڑا ہوا تھا، جس کے دونوں پلو اس کے فراک کے دامن تک آ رہے تھے۔ بالوں کو ڈھیلی سی چوٹی میں گوندھ کر اس نے اپنے بائیں کندھے پر ڈالا ہوا تھا، جس میں موتیا کی لڑیاں پروئی ہوئی تھیں۔ جھٹکے سے رکنے پر اس کے کانوں کے جھالے کنگنا اٹھے تھے اور بالوں کی ایک ریشمی لٹ اس کے رخسار سے لپٹ گئی تھی۔ اس نے موبائل سے نظر ہٹا کر بے توجہی سے سر اٹھایا تو عمران کے ساتھ بیٹھے شخص پر نظر پڑی۔

موبائل کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے دوسرے چوڑیوں بھرے ہاتھ کے لمبے اور رنگے ہوئے ناخن سے اس شرارتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر اپنی لائٹ براؤن آنکھوں سے اس نے سلطان کو بغور دیکھا۔ جو کولڈ ڈرنک پینا بھول گیا تھا۔ عمران فون سے فارغ ہو کر اب سلطان کو دیکھ رہا تھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"ان سے ملو سلطان! یہ میری مسز ہیں۔" عمران تعارف کرواتے ہوئے اٹھا تو مجبوراً سلطان کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

"سوری یار! بڑی ایمرجنسی میں شادی کرنی پڑی۔ ایکچوئیلی میرے ساس سسر عمرہ پر جا رہے ہیں۔ وہیں سیٹل ہونے کا بھی پروگرام ہے ان کا۔ میں نے سوچا تمہیں بلوا لوں دو تین دن کے لیے مگر پھر خیال آیا کہ تمہیں کام میں مداخلت پسند نہیں ہے نا۔"

"کیا عمران نے مجھے دھوکا دیا ہے؟" اس نے عمران کی مسز سے ہٹا کر ایک نظر عمران کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی ہر پل چمکتی آنکھوں میں جتلاتا ہوا کوئی تاثر نہ تھا۔

"مگر پھر میری غیر موجودگی میں کیوں شادی کر لی اور وہ بھی میری ہی کزن سے؟"

سلطان نے اس پل خود کو ایک ہارا ہوا جواری محسوس کیا تھا۔

عمران نے کبھی اس کے کسی ذاتی معاملے کو کریدا نہیں تھا اور ذاتی ہی کیا اس نے کبھی کسی معاملے میں اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خود ہی لے ہر بات جانتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سن ہی نہیں رہا ہے اور سنبل کو تو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔۔۔ اور پھر وہ اتنا دولت مند۔ اگرچہ وہ احمد مجتبیٰ کے سامنے اس کے کم عقل ہونے کا بیان دے چکا تھا مگر وہ خود بھی اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ اس کے بیان میں کوئی صداقت نہیں۔

"یہ سراسر اتفاق ہے۔" اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو تسلی دی۔

"یہ حیران رہ جائے گا اگر میں اسے بتا دوں کہ اس کی بیوی میری سابقہ منگیتر ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔

"بے خبری میں مارا گیا۔" سلطان کی مسکراہٹ واضح ہو گئی۔ اس نے گہری نظروں سے سنبل کی

طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ سلطان کو دیکھ کر حیرانی تھی۔ "یقیناً" یہ بھی نہیں جانتی۔" اسے بلاوجہ تسلی ہوئی۔

"ہیلو مجتبیٰ۔۔۔ ہیلو، ہیلو!" عمران نے فون ملایا تھا یا مجتبیٰ کا خود ہی فون آیا تھا۔ سلطان کو اندازہ نہ ہو سکا مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"یہ جتنا عقل مند سہی۔۔۔ میں بہرحال اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہوں۔ اس سے پہلے کہ یہ اپنے کام کے بارے میں پوچھ لے۔ جو کہ میں نے ساڑھے چھ ماہ میں ایک دن بھی نہیں کیا۔۔۔ نکل لوں تو بہتر ہے۔"

اس نے کولڈ ڈرنک میں بچ جانے والی برف کے چھوٹے سے ٹکڑے کو کولڈ ڈرنک کے آخری گھونٹ کے ساتھ یوں نگلا جیسے ہاری ہوئی بازی کو اپنے حق میں پلٹ کر مقابل کی مات کا یقین ہو گیا ہو۔

"مجھے اجازت دو۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔ میری طرف سے شادی کی بہت بہت مبارک باد قبول کرو۔" اس نے گلاس میز پہ رکھ کر عمران کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ضرور۔" عمران نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ "ایک چیز ہے تمہارے لیے۔" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"میرے اندازے کے مطابق کراچی کے صرف چار ہوٹلز رہ گئے ہیں۔ جہاں ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ یہ مختلف ڈیش میں ان کی ریزرویشنز ہیں۔ انجوائے کرنا۔" عمران نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ سلطان نے ایک چور نظر سنبل پہ ڈالی۔

"اگر سنبل نے اپنے شوہر سے اس ریزرویشن کی ڈیٹیل پوچھ لی تو۔۔۔" سلطان نے بے دھیانی میں سوچا۔ اس لمحے اسے بھول گیا تھا کہ جیسے سنبل اسے جانتی نہیں ہے۔

"اچھا عمران شاہ! اللہ حافظ۔" اس نے عمران سے ہاتھ ملایا اور ایک چبھتی ہوئی نظر سنبل پر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"چلنا نہیں ہے؟" اس کے جانے کے بعد عمران کو دوبارہ صوفے پر اطمینان سے بیٹھتے دیکھ کر سنبل نے کہا۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں یہ اس کا دوسرا جملہ تھا۔ اس سے قبل وہ صرف صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چلتے ہیں یار! ابھی ادھر آ کر بیٹھو ذرا۔" اس نے ایک ہاتھ صوفے کی پشت پہ دراز کر کے دوسرا ہاتھ سنبل کی طرف بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ عمران نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنا رخ مکمل طور پر اس کی جانب کیا۔

"تم دونوں کزنز حیران رہ گئے ہو گے ایک دوسرے کو دیکھ کر۔" عمران نے اس کے رخسار پہ پڑی ریشمی لٹ کو چھیڑتے ہوئے سوچا۔ کہنے کی غلطی وہ نہیں کر سکتا تھا۔

"فرائیڈے کی سیٹس کنفرم ہو گئی ہیں۔ جلد از جلد اپنی پیکنگ مکمل کر لینا۔"

"اتنی جلدی۔۔۔" سنبل نے اداسی سے کہا۔ وہ پہلی بار دوسرے شہر جا رہی تھی۔ وہ بھی مستقل قیام کے لیے، مگر جانا بھی ضروری تھا۔ وہاں عمران کا گھر تھا بزنس تھا۔

بزنس تو اس شہر میں بھی تھا، مگر سلطان نہیں جانتا تھا۔ صرف احمد مجتبیٰ جانتا تھا۔ جو دبئی کی احمد بن ڈیسمل میں اس کا نصف کا شریک تھا اور جس کی کراچی والی برانچ کی ذمے داری سلیم احمد پر تھی، جو عمران کے نہایت قابل اعتماد ملازم تھے۔ البتہ دوسرے شہر میں موجود آفس کو وہ خود سنبھالتا تھا۔

"یار۔۔۔ کام کا ہرج ہو رہا ہے۔۔۔ اور پھر اچھا نہیں لگتا نا اتنے دن کسی کے گھر میں رہنا۔ بے شک احمد مجتبیٰ میرا بہت اچھا دوست ہے مگر پھر بھی۔۔۔" اس نے صوفے سے ہاتھ ہٹا کر اس کے کندھے پر رکھ کر اسے قریب کیا۔ وہ خاموش رہی۔

سنبل جانتی تھی، اسے یہاں دیکھ کر سلطان اب یہاں کا کبھی رخ نہیں کرے گا۔ وہ اسے خود سے بڑھ کر حیثیت میں ہرگز نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے کی مختصر ملاقات میں وہ عمران اور سلطان کے درمیان تعلق کی نوعیت سمجھ گئی تھی اور ایک دوسرے کی نظر میں ایک دوسرے کی حیثیت بھی۔ سو اس نے سلطان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔۔۔ اور نہ آئندہ کبھی کرے گی۔ عمران کو بخوبی اندازہ تھا۔

اس کا خیال تھا، سلطان بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ ظاہری دوستی اور تعاون کے علاوہ ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ وہ اپنی کزن جسے اس نے محض ذہین ہونے پر چھوڑ دیا تھا اور جس نے اپنے مسترد ہونے پہ غم کرنے کے بجائے الٹا اس کا شکریہ ادا کیا تھا، عمران۔۔۔ جسے وہ درحقیقت اپنا باس مانتا ہے، کی بیوی کی حیثیت سے قطعی برداشت نہیں کرے گا۔

دونوں کی سوچیں اپنی اپنی جگہ درست تھیں مگر ایک بات وہ دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ سلطان آج پہلے سے ہی آخری ملاقات کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ دبئی میں ساڑھے چھ ماہ کے قیام کے دوران اگرچہ اس نے عمران کا کام نہیں کیا تھا۔۔۔ اپنا تو کیا تھا۔

غلط کچھ نہیں تھا۔ عمران نے اپنا کام کیا، سلطان نے اپنا۔ عمران نے اپنے باپ کے جیسی عزت رکھنے والے سلیم احمد سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا بس۔۔۔ اور ساتھ ہی اپنی پسند بھی بتادی کہ پڑھی لکھی ہو۔ سادہ طبیعت اور گھریلو۔۔۔ اور وہ جانتا تھا۔ ان کا پہلا خیال اپنے دوست کی بیٹی کی ہی طرف جائے گا، جو ان کے دفتر میں، دراصل عمران کے دفتر میں کام کرتی تھی۔۔۔ اور پھر سب کچھ ویسا ہی ہوتا چلا گیا، جیسا اس نے سوچا تھا۔ سلطان کو البتہ اس بات کا زیادہ کریڈٹ جائے گا کہ اس نے اس لڑکی کے بارے میں بغیر کہے مکمل معلومات فراہم کیں، جسے اس نے سب سے پہلے اپنے دفتر میں کام کرتے دیکھا اور پھر اپنے سامنے والے فلیٹ میں قائم میرج بیورو میں۔

پہلی دفعہ جب سلطان نے اپنی کزن کا ذکر کیا تو عمران واضح طور پر چونکا تھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا۔ دوسری طرف سلطان کو صرف بولنے سے غرض تھی۔ سامنے والا سن بھی رہا ہے یا نہیں، اسے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ سلطان کی صرف بولنے والی عادت نے عمران کو فائدہ پہنچایا تھا۔

سنبل بالکل ویسی ہی تھی جیسا سلطان نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ یا یوں کہیے کہ جیسی شریک سفر عمران کو مطلوب تھی۔ باہمت، باوقار۔۔۔ کچھ ایسے انداز کی مالک، جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہوں۔۔۔ خود مختار اور خوبصورت۔۔۔

اس کا ارادہ نہیں تھا کبھی بھی سنبل کو یہ بتانے کا کہ اس سے شادی ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ وہ اگر سمجھتی ہے کہ اس کے انکل سلیم صاحب نے اس کی شادی کروائی ہے اور اس کے باس میاں نے نکاح کے بعد گھونگھٹ اٹھا کر ہی پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے۔ تو یہی سمجھتی رہے۔

وہ اسے یہ بھی نہیں بتائے گا کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی میں جب وہ سلطان کو چھوڑنے آیا تھا تو واپس نہیں چلا گیا تھا۔ اس نے سیاہ ہنڈائی کی جگہ اپنی سیاہ کرولا کھڑی کر دی تھی اور کار اسٹیریو پہ غزل سنتے ہوئے اسے خوب نظر بھر کر دیکھا تھا۔

وہ اسے ہرگز یہ نہیں بتائے گا کہ اس نے اسے ظفر دلاور کے ہاں جاتے ہوئے دیکھا ہے اور سلطان سے خوب سنا بھی ہے اسے۔

وہ اسے اپنی نانی کے فلیٹ کے بارے میں بھی بتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور یہ بھی نہیں بتائے گا کہ اس نے سلطان کو جان بوجھ کر دبئی بھیجا تھا۔ اسے اپنے کاروبار کو پاکستان کے دو شہروں اور دبئی کے علاوہ مزید نہیں پھیلانا۔۔۔

ہرچند اسے سلطان کے خیال سے شدید اختلاف تھا۔ اسے ذہانت متاثر کرتی تھی اور وہ عورت کی برابری کا بھی قائل تھا مگر۔۔۔ زیادہ ذہین خواتین کے بارے میں اس کا اپنا بھی خیال تھا کہ وہ خطرناک ہوتی ہیں۔

☆

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل سا

ماورا مرتضیٰ، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا" کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتہذیبی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ، ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی، آفاق سے حد درجہ خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کردیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہوجاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہوپاتی۔ عزت، تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا، عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کردیتی ہے۔ ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر، ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کردیتا۔ تیمور، ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات قیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدھی رات کو غائب ہوجاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور، فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کرلیتی ہے۔

—11—
گیارہویں قسط

"مجھے جاب مل گئی ہے۔"

اس نے انتہائی مضبوط اور دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے اعلان کیا اور اپنے دھیان میں مگن کپڑے تہ کرکے رکھتی عافیہ بیگم کے ہاتھ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"اچھا۔ کہاں...؟" انہوں نے اپنے دھیان کی طنابیں اس کی طرف موڑ دیں۔ اس نے انہیں جواب دینے سے پہلے اک نظر بی گل کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا گئیں کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ عافیہ کھڑے قد سے گر جائیں گی۔

"کہاں جاب ملی ہے...؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

"کراچی کی ایک ٹیکسٹائل کمپنی میں..." اس نے وہ بم پھوڑ ہی دیا تھا جس سے بی گل کو عافیہ بیگم کے مرجانے کا خدشہ تھا۔

"کیا...؟" ان کے منہ سے یہ لفظ بھی بہت ہی مری آواز میں نکلا اور ان کے ہاتھ میں پکڑا اس کا دوپٹہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پہ جا گرا۔

"جی...! مجھے کراچی کی ایک ٹیکسٹائل کمپنی میں جاب مل گئی ہے اور کمپنی کی طرف سے گھر اور گاڑی کی سہولت بھی مہیا کی جائے گی۔ اس لیے بہت جلد ہمیں کراچی شفٹ کرنا ہوگا۔"

وہ ہنوز اسی لہجے میں بات کررہی تھی اور عافیہ بیگم کا دماغ چکرا گیا تھا۔ وہ خود کو سنبھال نہیں پائیں۔ انہیں بہت زور کا چکر آیا تھا اور وہ لہرا کے سیدھی فرش پہ آگری تھیں۔

"ہائے اللہ... میری بچی... میں نے کہا بھی تھا... وہ سنے گی تو مرجائے گی۔" وہ اپنا سینہ پیٹتے ہوئے اٹھ کر عافیہ بیگم کے قریب ہی فرش پہ بیٹھ گئیں۔

"عافیہ... عافیہ... بیٹا آنکھیں کھولو... عافیہ کیا ہوگیا ہے بیٹا...؟" بی گل یک دم پریشان ہو کر ان کا چہرہ تھپتھپانے لگیں۔ ماورا نے بی گل کی مدد سے انہیں پلنگ پر لٹایا اور "میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔" وہ انہیں چھوڑ کر اپنا پرس اٹھانے لگی۔

"رہنے دو... ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ دوا سے ٹھیک نہیں ہوگی، خواہ مخواہ فضول خرچی کروگی۔" بی گل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"تو پھر...؟ کیسے ٹھیک ہوں گی یہ؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم خود جانتی ہو..." انہوں نے بڑی لاپروائی سے کہا اور ماورا ان کے انداز سے ہی سمجھ گئی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔

"ایم سوری بی گل...! میں انہیں کوئی جھوٹی تسلی نہیں دے سکتی۔ آج انہیں جھوٹی تسلی دوں اور کل پھر وہی کام کروں تو آپ بھی جانتی ہیں کہ کل بھی یہی تماشا ہوگا اور کل پھر مجھے میڈیسن لینے جانا ہی پڑے گا۔" ماورا نے انتہائی تیکھے لہجے میں کہتے ہوئے معذرت کی۔ عافیہ بیگم کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"لیکن بیٹا...!" بی گل مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں۔

"نہیں بی گل... اب نہیں... اب اگر انہوں نے ٹھیک ہونا ہے تو میڈیسن سے ہی ٹھیک ہونا ہے، میری یا آپ کی جھوٹی تسلی سے نہیں۔ کیوں کہ میں جو فیصلہ کرچکی ہوں، وہ کرچکی ہوں اب اس فیصلے سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔ چاہے آپ لوگ میرا ساتھ دیں یا نہ دیں۔ اسی ہفتے یہاں سے شفٹ کرنا ہے، آپ لوگ اچھی طرح سوچ لیں... ورنہ میں اکیلی بھی جاسکتی ہوں۔" وہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور بی گل ایک بار پھر چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔

جبکہ عافیہ بیگم نے ان کی طرف سے کروٹ بدل لی تھی، مگر بی گل جانتی تھیں کہ وہ یقیناً دوسری طرف چہرہ چھپائے رو رہی ہیں۔

"عافیہ...! تسلی رکھو بیٹا... سب ٹھیک ہوجائے گا۔" انہوں نے پھر بھی تسلی دینے کی ہی کوشش کی تھی۔

"تسلی... کیسی تسلی بی گل! وہ تسلی جو اس نے مجھے دی ہی نہیں۔ وہ تسلی جو اس کے پاس ہے ہی نہیں... وہ تسلی جس کا اسے احساس ہی نہیں یا پھر وہ تسلی جو وہ دینا نہیں چاہتی اور آپ زبردستی دلانا چاہتی ہیں... بتائیں بی گل! کیا تسلی رکھوں اور کیسی تسلی رکھوں۔" عافیہ بیگم بی گل کی بات پر تڑپ کر اٹھ بیٹھی تھیں۔

اور بی گل بھی یہی چاہتی تھیں کہ وہ اپنے ڈر، خوف اور اپنی ناگواری کا یونہی تڑپ کر اظہار کریں اور اپنے اندر کا غبار نکال دیں۔ یوں چپ کرکے یا گھٹ گھٹ کے نہ رہیں۔

"تو پھر اور کر بھی کیا سکتے ہیں آخر... تسلی رکھنے کے علاوہ اور کوئی چارا ہے ہی کہاں؟" بی گل انہیں بڑے طریقے سے ذہنی طور پر تیار کررہی تھیں تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ ماورا اب کسی طور رکنے والی نہیں ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ پہلے ہی ہتھیار ڈال چکی ہیں؟" عافیہ بیگم کو اور زیادہ پتنگے لگ گئے۔

"بعد میں بھی تو ڈالنے ہی ہیں نا۔" بی گل نے بڑے سکون سے وجہ بتائی تھی۔

"مگر میں ایسا نہیں کرسکتی... کبھی بھی نہیں..." انہوں نے بہت ہی سختی سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تو ٹھیک ہے... اپنی بیٹی کو باغی کردو۔ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دو۔ وہ جہاں جانا چاہتی ہے چلی جائے۔ اور جو

کرنا چاہتی ہے کر لے تمہاری بلا سے۔" وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
"بی گل۔۔۔! مجھے آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔" عافیہ بیگم چیخی تھیں۔
"اور اسے ہم دونوں کے ساتھ کی ضرورت ہے عافیہ!" بی گل کا لہجہ بھی بدل چکا تھا۔
"وہاں رضا حیدر بھی ہو گا بی گل۔۔۔؟" عافیہ بیگم نے اپنا رونا رویا۔
"رضا حیدر تو اس دنیا میں بھی ہے، تو کیا تم اس دنیا سے بھی بے دخل ہو جاؤ گی؟" بی گل کے جواب اکثر کرارے ہوتے تھے۔
"مجھے سمجھنے کی کوشش کریں پلیز۔۔۔ وہ مجھ سے چھن جائے گی۔۔۔ میں۔۔۔ میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گی۔"
عافیہ بیگم بہت چیخی تھیں، بہت کرلائی تھیں، بہت واویلا کیا تھا، مگر ماورا نے کوئی ایک بھی کمزور اور جذباتی سین اپنے احساسات کے قریب نہیں آنے دیا تھا، وہ ان کی طرف سے مکمل طور پہ بے بہرہ ہو چکی تھی اور بی گل کی لاتعلقی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی ان کی طرف سے لاپروا ہو گئی تھیں۔ عافیہ بیگم سچ مچ بستر سے لگ گئیں کیوں کہ ماورا نے سچ مچ بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا اب تک ناراض ہو۔۔۔؟"
آفاق نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنے برابر بیٹھی فارہ سے پوچھا۔ ان دونوں کے بیچ شادی کی پہلی رات سے ہی اک کھنچاؤ اور ناراضی سی چلی آرہی تھی جس کو آفاق نے بارہا ختم کرنے کی کوشش کی مگر نہیں کر سکا تھا۔ کیوں کہ فارہ کوئی رسپانس ہی نہیں دیتی تھی۔
"نہیں۔۔۔! میری آپ سے کوئی ناراضی نہیں ہے۔" اس نے ہنوز لاتعلقی سے جواب دیا۔
"تو پھر کس سے ناراض ہو؟" آفاق نے گردن موڑ کر ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا، وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔
"شاید اپنے آپ سے۔۔۔" وہ یوں مدھم آواز میں بول رہی تھی جیسے اپنے آپ سے بات کر رہی ہو۔
"اپنے آپ سے کیوں۔۔۔؟" آفاق نے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا جس پہ مہندی کے مدھم سے نقش و نگار ابھی بھی موجود تھے۔
"کیوں کہ ہر بار بہل جاتی ہوں، کبھی معافی سے، کبھی تلافی سے۔۔۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔
"تو اس میں ناراضی والی کیا بات ہے۔ یہ تو تمہاری محبت ہے کہ تم ہر بار بہل جاتی ہو۔۔۔ کیوں کہ محبت تو بہلنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔" آفاق نے اس کی بات کو اپنے ہی طریقے سے لیا تھا۔
"اور آپ کی محبت۔۔۔ وہ کیا کرتی ہے۔۔۔ یہ کبھی سوچا آپ نے۔۔۔؟" فارہ نے طنز کیا۔
"سوچتا ہوں۔۔۔ اکثر سوچتا ہوں۔ میری محبت بھی تمہاری محبت سے کم نہیں ہے۔ غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی کبھی معافی اور کبھی تلافی کرتی ہے، کبھی دوسروں کے سامنے اور کبھی تمہارے سامنے بے وجہ ہی شرمندہ کرتی رہتی ہے۔" آفاق آہستگی سے کہتے ہوئے ہنسا اور پھر سر جھٹک دیا۔
"بے وجہ۔۔۔ یہ سب بے وجہ ہے؟" فارہ غصے سے متوجہ ہوئی۔
"ہاں۔۔۔ بے وجہ ہی تو ہے۔۔۔ اس میں میری کوئی دانستہ غلطی تو نہیں تھی۔۔۔ مجھے اپنے دوست کی وجہ سے اچانک

جانا پڑ گیا تھا۔" آفاق نے پھر وہی بہانہ سامنے رکھا۔
"کس دوست کی وجہ سے آپ کو اچانک جانا پڑ گیا تھا۔ کیا مجھے اس دوست سے ملوا سکتے ہیں آپ۔۔۔؟" فارہ نے اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔
"یعنی تمہیں مجھ پہ یقین نہیں ہے۔۔۔؟"
"آپ نے بے یقینی ہی اتنا کر دیا ہے کہ اب یقین کرنا بھی چاہوں تو دل نہیں مانتا۔" فارہ کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا اور آفاق نے بے ساختہ گاڑی کو بریک لگایا۔
"فارہ پلیز۔۔۔! کیوں اتنی چھوٹی سی بات پہ اتنی ٹینشن لے رہی ہو۔۔۔؟ پلیز بات مانو۔۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"
آفاق نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی سمت موڑا۔
"یہ اتنی چھوٹی سی بات نہیں ہے آفاق۔۔۔! میں کیسے یقین کر لوں کہ شادی کی رات آپ کے کسی دوست نے آپ کو بلایا اور آپ اٹھ کر چلے گئے۔۔۔ آپ کے موبائل پہ آپ کے دوست کی کال آئی، موبائل بجا، آپ نے بات کی اور مجھے پتا ہی نہ چلا۔۔۔ حالانکہ سوئے ہوئے زیادہ دیر تو نہیں گزری تھی؟" فارہ نے بہت سے نکتے اٹھا ڈالے تھے جن کا جواب آفاق کے پاس واقعی نہیں تھا۔
"بتائیں آفاق۔۔۔؟ مجھے آپ کے دوست کی کال کا پتا کیوں نہیں چلا۔۔۔ اور اگر میں یہ مان بھی لوں کہ میں گہری نیند سو رہی تھی اور مجھے پتا نہیں چلا تو اس بات کا آپ کیا جواز پیش کریں گے کہ آپ کا موبائل گھر پہ کیوں تھا۔۔۔؟ اگر آپ کا دوست پریشانی میں تھا، مشکل میں تھا، پولیس کیس تھا تو پھر آپ کو اپنا موبائل اپنے ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔ آپ کو موبائل کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ پھر بھی آپ موبائل لے کر نہیں گئے۔۔۔ کیوں آفاق۔۔۔؟" فارہ اب اونچی آواز میں چیخ اٹھی تھی۔
"میں جلدی میں تھا فارہ۔۔۔ مجھے موبائل لے جانا یاد ہی نہیں رہا۔" آفاق اسے بار بار سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"جھوٹ مت بولیں آفاق۔۔۔ آپ اگر جلدی میں تھے تو اپنے موبائل سے اپنے دوست کی کال کا ریکارڈ ڈیلیٹ کرنا کیسے یاد رہا آپ کو۔۔۔؟" اس نے ایک اور پوائنٹ نکالا۔
"ریکارڈ ڈیلیٹ کرنا۔۔۔؟" آفاق کو اچنبھا ہوا۔
"ہاں ریکارڈ ڈیلیٹ کرنا۔۔۔ آپ کے دوست کی جو کال آئی تھی۔ وہ آپ کے کال لاگ میں ہونی چاہیے تھی نا۔۔۔؟ اور اگر آپ نے ڈیلیٹ نہیں کی تو ظاہری بات ہے کہ کال آئی ہی نہیں تھی، آپ جہاں بھی گئے تھے اپنی مرضی سے گئے تھے اور مجھ کو بتائے بغیر مجھ سے چوری گئے تھے۔"
اس نے آخر میں بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور آفاق چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ اندر سے پریشان بھی ہوا تھا کہ فارہ نے کہاں تک سوچ لیا تھا۔
"دیکھو فارہ۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔ فی الحال کوئی بھی ٹینشن مت لو۔۔۔ میں اس وقت تمہیں صرف اس لیے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں تاکہ تمہارا الجھا ہوا ذہن کچھ فریش ہو سکے، لیکن یوں گھر سے باہر آکر بھی اگر تم یہی سب کچھ سوچتی رہو گی تو تمہارا ذہن فریش ہونے کے بجائے مزید الجھتا جائے گا۔۔۔ سو۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز بس کرو اب۔۔۔"
آفاق نے پھر اسے بہلایا تھا اور فارہ نے سر جھٹک دیا۔
"اوکے۔۔۔! میں کچھ نہیں کہتی اور کوئی ٹینشن نہیں لیتی، لیکن پلیز آپ بھی اس ٹاپک پہ کوئی بات مت کریں۔" اس نے آفاق کو مزید صفائی دینے سے روکا تھا۔

"اوکے۔۔۔ نہیں کروں گا، لیکن تم پلیز اپنا موڈ تو ٹھیک کرو۔۔۔" آفاق نے کہتے ہوئے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی تھی۔

"میرا موڈ ٹھیک ہے۔۔۔ آپ گھر چلیں۔" اس کے موڈ میں بے زاری اور کوفت تھی۔

"گھر۔۔۔؟ لیکن میں تو کھانا کھانا چاہ رہا تھا۔" آفاق کو اچنبھا ہوا۔

"گھر جا کر کھا لیجیے گا۔"

"فارہ۔۔۔!"

"پلیز آفاق! مجھے گھر جانا ہے۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔

☼ ☼ ☼

"عزت۔۔۔!" وہ اپنی دھن میں مگن کہیں جا رہی تھی جب تیمور نے اسے آواز دے کر روکا۔

"جی بھائی۔۔۔!" وہ اس کی طرف پلٹی۔ تیمور لان میں بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"آؤ بیٹھو۔۔۔!" اس نے اپنے مقابل۔۔۔ کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا اور مجبوراً عزت اپنا کہیں جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے آکر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"بڑے فارغ نظر آ رہے ہیں آج کل۔۔۔ خیریت۔۔۔؟" عزت نے اسے ہمیشہ مصروف ہی دیکھا تھا، لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے وہ اکثر فارغ نظر آنے لگا تھا جس کو اپنی لاپروائی کے باوجود عزت نے بھی نوٹ کیا تھا اور کہہ بھی دیا تھا۔

"بس۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ کام کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" وہ چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے مسکرایا اور اس کی اس ذو معنی سی مسکراہٹ پہ عزت کے ذہن میں بھی ایسی ہی ذو معنی سی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

"اچھا۔۔۔! تو پھر کیا کرنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔؟"

"محبت کرنے کو دل چاہتا ہے۔" وہ دل ہی دل میں کہہ کے رہ گیا۔

"بتائیں نا۔۔۔ کیا کرنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔؟" وہ اصرار کرنے لگی۔

"تم سے لڑائی کرنے کو دل چاہتا ہے۔" کچھ نہ سوجھا تو اس نے یہ کہہ دیا اور عزت اس کا جواب سن کر پہلے حیران ہوئی، پھر مسکرائی اور پھر اسی بات کو سوچتے ہوئے یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اوہ۔۔۔! تو مجھ سے لڑائی کرنے کو دل چاہتا ہے آپ کا۔" وہ کافی کھل کر ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں۔۔۔!" وہ بڑی معصومیت سے سر ہلا رہا تھا۔

"مگر کس بات پہ۔۔۔؟" اب وہ بھی دلچسپی کی انتہا پہ تھی۔

"بس ایویں۔۔۔ بلاوجہ۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"اوں ہوں۔۔۔! بلاوجہ کی لڑائی بھی کوئی لڑائی ہوتی ہے بھلا۔۔۔؟ لڑنے کا بھی مزا نہیں آتا۔ ہاں اگر آپ کا سچ مچ لڑنے کو دل چاہ رہا ہے تو ابھی کوئی وجہ کری ایٹ کر لیتے ہیں کوئی برا سا ٹاپک رکھ لیتے ہیں۔" وہ بھی میدان میں اتر چکی تھی اور تیمور اس کے انداز پہ مسکرا اٹھا تھا۔

"برا سا کیوں۔۔۔؟ اچھا سا کیوں نہیں۔۔۔؟"

"اچھے ٹاپک پہ لڑائی نہیں ہوتی۔" عزت نے جواز سمجھایا۔

"ہوں۔۔۔! یہ بات بھی درست ہے۔" اس نے اتفاق کیا۔

"اوکے۔۔۔! تو پھر جلدی شروع کریں۔۔۔ پھر مجھے کہیں جانا بھی ہے۔" عزت نے اسے لڑنے کے لیے اکسایا۔

"جانا کہاں ہے؟"

"شاپنگ پہ۔۔۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ارے۔۔۔! یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔۔۔ میں بھی تم سے شاپنگ کے لیے ہی کہنے والا تھا۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟ شاپنگ کے لیے کہنے والے تھے؟" عزت نا سمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ دراصل آج ولید کی چھوٹی سسٹر کا برتھ ڈے ہے، کبھی کبھار اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ بھی مجھے بھائی ہی کہتی ہے۔ اس لیے سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ آج میں بھی اس کی خوشی میں شریک ہو جاؤں اور اسے سرپرائز دوں۔" تیمور نے اسے اک نئی بات بتا کر چونکا دیا تھا۔

"ولید کی چھوٹی سسٹر کا برتھ ڈے۔۔۔!" اس کی سوچ اب کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی۔

"کیا خیال ہے۔۔۔ میرے ساتھ چلو گی شاپنگ پہ۔۔۔؟" اب تیمور نے اسے چونکانے کے بعد متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"دراصل مجھے لڑکیوں کی شاپنگ کا کچھ سینس نہیں ہے نا اس لیے۔۔۔ وہ تو ہے بھی کافی چھوٹی۔۔۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا لوں اور کیا نہ لوں۔۔۔؟"

"آپ ان کے گھر جائیں گے۔۔۔؟" اس نے اصل نکتہ اٹھایا۔

"آف کورس۔۔۔! اسے سرپرائز دینا ہے تو اس کے گھر ہی جانا پڑے گا نا۔۔۔؟" وہ لاپروائی سے بولا۔

"کیا میں بھی جا سکتی ہوں ان کے گھر۔۔۔؟" عزت نے جھجکتے ہوئے سوال پوچھا۔

"ارے ڈیٹس گریٹ یار۔۔۔! مزا آئے گا۔۔۔ تم ضرور چلو۔۔۔ اس طرح آنٹی بھی خوش ہوں گی۔" تیمور کو اس کا ارادہ اچھا لگا تھا۔ فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

"تو پھر میں بھی اس کے لیے گفٹ لے لوں۔۔۔؟"

"ارے۔۔۔! بالکل۔۔۔ ضرور لو۔۔۔ گفٹ لینے اور دینے سے تو محبت اور بھی بڑھتی ہے۔ اچھا لگے گا۔ وہ خوش ہو جائے گی۔ ولید بھی۔"

"اوکے۔۔۔! تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ چلتے ہیں۔" عزت فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے چائے تو ختم کر لینے دو۔۔۔" تیمور نے اسے روکا۔

"اب ریسٹورنٹ سے پی لیجیے گا۔۔۔ چلیے۔۔۔ اٹھیے۔" اس نے تیمور کے پاس آتے ہوئے تیمور کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی۔

"اچھا بابا۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔ ایک منٹ ٹھہرو تو سہی۔۔۔" تیمور ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کا تو شاید لڑنے کو دل چاہ رہا تھا۔" گاڑی روڈ پہ آتے ہی عزت نے شرارت سے اسے چھیڑا تھا۔

"لڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بلکہ تمہارے ساتھ مل کر موج مستی کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔" تیمور مسکراتے ہوئے بولا اور جواباً عزت بھی ہنس پڑی کیوں کہ ایسی موج مستی پہ تو اس کا دل بھی خوش ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یار۔۔۔! یہ ان میں کیسی ہوا بھر رہے ہو تم۔۔۔؟ پھولتے جا رہے ہیں۔۔۔ پھولتے جا رہے ہیں۔۔۔ پھٹ ہی نہیں

رہے۔۔۔؟" ولید نے غباروں میں ہوا بھرتے وحید کو حیرت اور تعجب سے دیکھا۔

"یہ میرے منہ سے لگ کر امر ہوتے جا رہے ہیں۔" وحید نے غبارے کو گرہ لگاتے ہوئے فخریہ سے انداز میں کہا۔

"ہاہاہا۔۔۔! منہ نہ ہوا۔۔۔ آب حیات ہو گیا۔" ککو کمرے سے نکلتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔

"ہاں۔۔۔! تو ہے نا آب حیات۔۔۔ یقین نہیں آتا تو ان غباروں کو دیکھ لو۔" وحید نے اپنے آس پاس بکھرے بے حد پھولے ہوئے غباروں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تمہارے منہ کا کمال نہیں ہے بلکہ کمال یہ ہے کہ بھائی غبارے ہی اچھی کوالٹی کے لائے تھے۔" ککو نے وحید کا منہ چڑایا۔ وحید تلملا کر رہ گیا۔

"ککو کی بچی۔۔۔! میں نے تمہاری خاطر اپنی قیمتی سانسیں خرچ کر کے ان میں ہوا بھر بھر کے پورا صحن بھر دیا ہے اور تمہیں پھر بھی یہی فخر خوش کر رہا ہے کہ بھائی غبارے اچھی کوالٹی کے لائے ہیں۔" وحید بھی دانت کچکچانے لگا تھا۔

"ویسے کام تو تمہیں بہت اچھا ملا ہے۔۔۔ ہوا بھرنے کا۔" ککو نے مذاق اڑایا۔ وحید اسے پکڑنے کے لیے لپکا' لیکن ہاتھ میں پکڑا غبارہ چھوٹ گیا تھا اور اس کی ہوا نکل گئی تھی اور ساتھ ہی پاؤں کے نیچے آجانے کی وجہ سے دو غبارے بھی پھٹ گئے تھے۔

"لو۔۔۔ ہو گئے امر۔۔۔" ککو بے ساختہ ہنسی۔

"لو۔۔۔ یہ رہی اچھی کوالٹی۔۔۔" وحید نے بھی تمسخرانہ انداز میں پاؤں پٹخا ان دونوں کی نوک جھونک پہ دیوار کے ساتھ کرسی رکھ کے کرسی پہ کھڑے ہو کر دیوار اور چھت کے ساتھ غبارے لگاتے ولید کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ارے بیٹا۔۔۔! تم تو ایسے تیاری کر رہے ہو جیسے ہمارے گھر بہت سے مہمان آنے والے ہوں۔" زبیدہ بیگم نے استہزائیہ لہجے میں کہتے ہوئے ان تینوں کے اتنے جوش و خروش اور اتنی تیاری پہ چوٹ کی۔

"اور وہ بھی ولید بھائی کی سسرال سے۔۔۔" وحید نے اب بڑے بھائی کو نشانے پہ رکھا۔

"سانسیں تو تمہاری خشک ہو رہی ہیں ہوا بھر بھر کے۔۔۔؟" ولید نے بھی مذاق اڑایا۔

"میں نے تو صرف ہوا بھری ہے' مگر آپ تو غباروں کے ساتھ غبارہ ہی ہو گئے ہیں' دیوار سے لٹک گئے ہیں۔" وحید بھی آخر اسی کا بھائی تھا۔ سیر کو سوا سیر ثابت ہونے والا۔۔۔!

"جب تمہاری سسرال سے کوئی آیا تو تم چھت سے لٹکو گے۔۔۔ آثار تو ہمیں پہلے ہی نظر آ رہے ہیں۔" ولید نے اس کے پر پرزے نکلنے پہ طنز کیا تھا' لیکن اس سے پہلے کہ جواباً" وحید بھی مزید گل افشانی کرتا اتنے میں باہر دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ چاروں ہی چونک گئے۔

"لیں جی۔۔۔ آ گئے آپ کی سسرال والے۔۔۔" وحید نے مسکراتے ہوئے شرارت سے اشارہ کیا۔

"بکواس نہیں کرو۔۔۔ جاؤ دیکھو باہر کون ہے۔" ولید نے اسے گھورا اور وحید پھر بھی مسکرانے سے باز نہیں آیا تھا۔

"اٹس اوکے۔۔۔! آپ دیوار سے ٹنگے رہیں۔۔۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا اور ولید اس کی شرارت پہ مسکراتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن اُدھر بڑے ہی بے نیاز انداز میں دروازہ کھولنے والا وحید اپنے سامنے کھڑے تیمور حیدر اور ایک لڑکی کو

دیکھ کر سچ مچ گڑبڑا گیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔! کیسے ہو۔۔۔؟" تیمور نے ہی اسے متوجہ کیا۔

"السلام علیکم۔۔۔!" "ج۔۔۔ جی۔۔۔ ٹھیک ہوں۔۔۔ آ۔۔۔ آپ۔۔۔ آئیں نا۔۔۔ اندر آجائیں۔۔۔" وہ اس کے متوجہ کرنے پہ چونکا اور ہکلا گیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! ولید ہے گھر پہ۔۔۔؟" تیمور ولید کی غیر موجودگی میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

"جی۔۔۔! گھر پہ ہی ہیں۔۔۔ آپ آجائیں پلیز۔۔۔" وحید کہتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا اور تیمور عزت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"وحید۔۔۔! کہاں چلے گئے ہو۔۔۔ کون ہے باہر۔۔۔؟" ولید اپنے کام میں مصروف ابھی تک غبارے لٹکا رہا تھا۔

"آپ کے دوست۔۔۔" وحید کی دھیمی سی آواز سنائی دی تھی۔

"کون۔۔۔ تیمور۔۔۔؟" ولید نے چونک کر پیچھے مڑ کے دیکھا اور پھر جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ تیمور تو تیمور۔۔۔ تیمور کے ساتھ کھڑی عزت حیدر بھی بڑی دلچسپی اور بڑے مزے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔ بہت اچھے لگ رہے ہو۔" تیمور اسے ذرا ستائشی انداز میں سراہتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔

"تھینک یو۔۔۔!" ولید خود پہ ہونے والے اس اچانک حملے کے بعد بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کمپوز کرتا کرسی سے نیچے اتر آیا۔

"السلام علیکم آنٹی۔۔۔!" تیمور اب اسے چھوڑ کر زبیدہ بیگم کی طرف متوجہ ہوا۔ اور زبیدہ بیگم آگے بڑھ کے کافی خوش دلی سے اس سے ملی۔

"السلام علیکم۔۔۔!" عزت نے بھی کافی مدھم آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آؤ بیٹھو۔۔۔" انہوں نے اس کے ماتھے پہ پیار کرنے کے بعد کرسی کی طرف اشارہ کیا جبکہ عزت ان کے اتنے محبت بھرے انداز پہ مسرور سی ہو گئی۔ اور ولید ان دونوں کا یہ محبت بھرا سین دیکھ کر نظریں چرا گیا۔

"یہ ککو کے لیے۔۔۔ ککو ادھر آؤ۔۔۔" تیمور نے ایک طرف کھڑی ککو کو خود ہی مخاطب کیا۔ وہ عزت کی وجہ سے جھجکتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"کیسی ہو۔۔۔؟" تیمور نے اس کا رخسار تھپکتے ہوئے بہت پیار اور نرمی سے پوچھا۔

"جی۔۔۔ ٹھیک ہوں۔" اس نے اپنا چہرہ بے حد جھکا رکھا تھا۔

"ٹھیک ہو تو پھر چہرہ اوپر کرو۔۔۔ اور ادھر میری طرف دیکھو۔" تیمور نے اسے اپنی طرف دیکھنے پہ اکسایا۔

"جی۔۔۔" اس نے بمشکل چہرہ اوپر کرنے کی ہمت کی تھی اور تیمور اس کے انداز پہ یکدم قہقہہ لگا کر ہنسا اس کے ہنسنے پہ باقی سب بھی مسکرا دیے۔

"گڈ۔۔۔! نائس بے بی۔۔۔" تیمور نے پیار سے کہتے ہوئے اسے گفٹ تھمایا۔ "ہیپی برتھ ڈے۔۔۔" ساتھ ہی اسے وش بھی کیا۔

"تھینک یو بھائی۔۔۔" وہ گفٹ دیکھ کر خوش ہوئی تھی زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ تیمور نے اسے یاد رکھا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے۔۔۔" عزت نے بھی آگے بڑھ کے اسے اپنی طرف سے ایک گفٹ تھمایا تو ککو پھر جھجک گئی تھی۔

”ارے۔۔۔ لے لو بیٹا۔۔۔ یہ بھی تمہاری سسٹر ہی ہے۔“ تیمور نے اسے اکسایا۔
”سسٹر۔۔۔؟“ ککو نے اسے پہچانا نہیں۔
”ہاں گڑیا۔۔۔! یہ میری سسٹر ہے تو پھر تمہاری بھی تو سسٹر ہوئی نا۔۔۔؟“
”یہ آپ کی سسٹر ہیں۔۔۔؟“ ککو نے یک دم بڑے شوق اور بڑے اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
”تو بیٹا۔ آپ کے خیال میں۔۔۔ میں اپنی کسی گرل فرینڈ کو ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔۔۔؟“ تیمور مسکرایا اور ککو اس کی بات پہ پہلے زور سے ہنسی پھر شرمندہ ہو کے رہ گئی تھی۔
”ایم سوری بھائی۔۔۔!“ اس نے معذرت کی۔
”اٹس او کے۔۔۔! میں آپ کے بھائی جیسا کمینہ نہیں ہوں۔“ تیمور نے آخری جملہ ذرا دبے لفظوں میں کہا تھا۔ لیکن قریب کھڑی عزت اور ولید نے با آسانی سن لیا تھا، عزت کے کان کھڑے ہو گئے۔ تیمور نے اس پہ یہ چوٹ کیوں کی کیا اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی ہے۔۔۔؟
عزت نے وہیں کھڑے کھڑے اندازے لگانے شروع کر دیے۔
”کیا بات ہے آج بڑی مستی سوجھ رہی ہے تمہیں۔۔۔؟“ ولید اس کے چہرے کی اور اس کے لہجے کی خوشی فوراً ہی بھانپ گیا۔
”ہاں یار۔۔۔! مجھے خود بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔“ تیمور مسکرایا۔
”وجہ۔۔۔؟“ وہ عزت اور ککو کے وہاں سے ہٹتے ہی استفسار پہ اتر آیا تھا۔
”سنگدلوں کی عدالت میں میری درخواست منظوری پا گئی ہے۔“ تیمور کے مبہم سے جواب پہ وہ بے ساختہ چونکا۔

”مطلب۔۔۔؟“ ولید کو حیرانی ہوئی۔
”مطلب وہی ہے جو تم سمجھ چکے ہو۔“ تیمور نے کندھے اچکائے۔
”یعنی قبولیت پا گئے ہو۔۔۔؟“ ولید چہکا۔
”بس اللہ کا احسان ہے۔“ تیمور عاجزی سے بولا۔
”تو پھر کب۔۔۔؟“ اس نے اس کے آنے کے بارے میں پوچھا۔
”بہت جلد۔۔۔!“ وہ دونوں گفتگو اس انداز میں کر رہے تھے کہ کوئی اور سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔
”واہ جی واہ۔۔۔! پھر تو تم مبارک باد کے حق دار ہوئے۔۔۔“
”خیر مبارک۔۔۔“ تیمور بھی آج بڑے موڈ میں۔
”بھائی! لائٹ چلی جائے گی، ککو سے کہیں کیک جلدی کاٹ لے، پھر سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔“
وحید نے ولید کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کرتے ہوئے دہائی دی تھی۔
”ارے ہاں بیٹا۔۔۔! یہ تو صحیح کہہ رہا ہے۔۔۔ چلو بیٹھو تم لوگ۔۔۔ ککو! تم میرے ساتھ آؤ کچن میں۔۔۔“ زبیدہ بیگم ولید اور تیمور کو بیٹھنے کا اشارہ کرتیں، ککو کو ساتھ لیے کچن میں چلی گئی تھیں۔
”آپ بھی بیٹھیں نا۔۔۔“ وحید عزت کے لیے کرسی کھینچ لایا۔
”تھینک یو۔۔۔! لیکن میں وہاں بیٹھنا چاہتی ہوں۔“ عزت نے صحن میں بچھی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔
”چارپائی پہ۔۔۔؟“ وحید جھجکا۔
”ہاں۔۔۔! آن فیکٹ میں کبھی چارپائی پہ بیٹھی نہیں نا اس لیے۔۔۔“ عزت کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”او کے۔۔۔! ادھر بیٹھ جائیے۔۔۔“ وحید کندھے اچکاتے ہوئے صحن میں آ گیا اور اس کے پیچھے عزت بھی برآمدے سے صحن میں آ گئی۔
”پلیز۔۔۔!“ وحید نے اشارہ کیا۔
”تھینکس۔۔۔!“ وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔
”ویلکم میم۔۔۔!“ جواباً وہ بڑے مؤدب سے انداز میں بولا۔
”میم۔۔۔؟“ وہ ٹھٹکی۔
”جی۔۔۔! تو اور کیا کہوں۔۔۔ مجھے تو آپ کا نام ہی نہیں پتا۔۔۔ اور ویسے بھی آپ مجھ سے بڑی ہیں۔“
”اوہ ہاں۔۔۔! میرا نام عزت حیدر ہے۔۔۔ تم مجھے عزت بھی کہہ سکتے ہو۔“ وہ لاپروائی سے بولی۔
”عزت نائس نیم۔۔۔ بٹ میں آپ کو عزت نہیں کہہ سکتا۔۔۔ ہاں اگر آپ اجازت دیں تو عزت آپی ٹھیک رہے گا۔“ ان دونوں کی اپنی ہی گپ شپ شروع ہو چکی تھی۔
”او کے۔۔۔ اجازت ہے۔۔۔ کہہ سکتے ہو۔“ وہ مسکرائی۔
”تھینک یو۔۔۔!“ وحید خوش ہوا۔
”پڑھتے ہو۔۔۔؟“ ان کی بے تکلفی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ولید تیمور سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے انہیں بھی دیکھ رہا تھا جو وقتاً ”فوقتاً“ کسی نہ کسی بات پہ مسکرا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

عزت تیمور کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر ابھی اندر آئی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جونہی سیل فون نکال کر دیکھا حیران رہ گئی تھی۔ ولید کال کر رہا تھا۔
”ہیلو۔۔۔!“ کال بند ہونے ہی والی تھی کہ اس نے کال ریسیو کر لی۔
”السلام علیکم۔۔۔!“ دوسری طرف سے ولید کی ٹھہری ہوئی سی آواز سنائی دی۔
”وعلیکم السلام۔۔۔! آپ کون۔۔۔؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بنی۔
”میں ولید۔۔۔ ولید رحمان بات کر رہا ہوں۔“ اس کی آواز کا ٹھہراؤ ہنوز تھا۔
”کون ولید رحمان۔۔۔؟“ وہ بڑے سکون سے کہتی سیڑھیاں طے کر کے اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گئی اور بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اپنا پرس بیڈ پہ اچھال دیا۔
”تیمور کا دوست۔۔۔“ اس کے پاس بھی وہی پرانا حوالہ تھا۔
”اوہ اچھا۔۔۔! وہ ولید۔۔۔؟“ وہ جیسے کچھ یاد آنے پہ بولی تھی۔
”جی۔۔۔! وہی ولید۔۔۔“ وہ بھی اسی کے سے انداز میں زور دے کر بولا تھا۔
”او کے۔۔۔! کہیے۔۔۔ کیسے یاد کیا آپ نے۔۔۔؟“ وہ بات کرتے کرتے خود بھی بہت مزے سے بیڈ پہ لیٹ گئی۔
”آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔“
”کس بات کا۔۔۔؟“ وہ نا سمجھی سے بولی۔
”میرے گھر آنے کے لیے اور ککو کے لیے گفٹ لانے کے لیے۔۔۔“ ولید کو ان دونوں بہن بھائی کا اتنی اپنائیت اور اتنے خلوص سے آنا اور ان کی اس چھوٹی سی خوشی میں شریک ہونا بہت اچھا لگا تھا۔ زبیدہ بیگم وحید اور ککو کو بھی ان دونوں کی آمد پہ بہت خوش ہوئی تھی۔

"لیکن اس بات کے لیے آپ کو شکریہ ادا نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ہم آپ کے لیے نہیں آئے تھے۔ ہم تو ککو کے لیے آئے تھے اور ککو کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے لیے ہماری سسٹر ہی ہے۔" عزت نے بڑی لاپروائی سے کہتے ہوئے ولید کو لاجواب کر دیا تھا۔

"آپ لوگ ایسا سوچتے ہیں میں تو اس کے لیے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔"

"ہم لوگ تو ایسا سوچتے ہی ہیں۔ آپ بتائیں آپ کیا سوچتے ہیں؟" عزت کی پرانی رگ پھڑکی۔

"کیا مطلب؟" وہ سمجھ نہ سکا۔

"یہی کہ کیا آپ بھی تیمور بھائی کی سسٹر کو اپنی سسٹر سمجھتے ہیں؟" اس نے ولید کو کرنٹ لگا دیا تھا۔

"لاحول ولا...!" وہ دل ہی دل میں پڑھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا بتایا نہیں آپ نے...؟" وہ اس سے اگلوانا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر۔ کافی ٹائم ہو چکا ہے... میں فون بند کرتا ہوں۔" وہ صاف ٹال گیا تھا اور عزت شرارت سے اپنا ہونٹ دباتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"اوکے...! سمجھتے رہیں... لیکن تیمور حیدر کی بہن آپ کو اپنا بھائی ہرگز نہیں سمجھتی کیوں کہ وہ ککو جیسی اچھی بچی نہیں ہے۔" عزت نے بڑی لاپروائی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

لیکن چند سیکنڈز کے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے اس نے پھر سیل فون اٹھایا اور اس کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو...!" ولید آج کچھ نارمل ہی پیش آ رہا تھا۔

"میں نے آپ کو بتانا تھا کہ بہرحال جو کچھ بھی تھا مجھے آپ لوگوں کے گھر آنا، ککو، وحید اور آنٹی سے ملنا، آپ کی کارکردگی دیکھنا اور چارپائی پہ بیٹھنا بہت اچھا لگا۔ آپ کے گھر میں گزری ہوئی آج کی شام میرے لیے ہمیشہ ایک خاص اور یادگار شام رہے گی۔"

عزت نے خاصے کھلے دل سے اظہار کیا تھا۔ ولید کو یہ سب سن کر اندر سے حقیقتاً بہت خوشی محسوس ہوئی تھی۔

"تھینکس اگین...!"

"ویلکم...!" عزت نے بڑے نرم سے انداز میں مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

آج صبح سے ہی کراچی کا موسم قدرے ابر آلود ہو رہا تھا۔

اور اس ابر آلود موسم کا اثر تمام شہریوں کے مزاج پہ بہت اچھا ثابت ہوا تھا۔

اکثر دفاتر میں لوگ کام چھوڑ کر کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر جھانک کر موسم سے لطف اندوز ہونے کے خواہش مند نظر آ رہے تھے، لیکن افسوس کہ پورا دن بارش نہیں برسی تھی، لیکن جیسے ہی شام کا وقت ہوا بارش کی راگنی بھی شروع ہو گئی تھی۔

تیمور کا ارادہ قارہ کی طرف جانے کا تھا لیکن پھر ان لوگوں کی انجوائے منٹ کا خیال کر کے اس نے اپنا ارادہ بدلا اور سیدھا گھر آ گیا اور پورچ سے بھیگتے ہوئے اور بچتے بچاتے ہوئے وہ تقریباً بھاگتا ہوا اندر آیا تھا۔

"ارے سنبھل کے بیٹا سنبھل کے... کہیں پاؤں نہ پھسل جائے۔" کاریڈور سے باہر نکلتی رابعہ بیگم نے اسے بھاگنے سے روکا۔

"گڈ ایوننگ مام۔!" وہ انہیں دیکھ کر ٹھہرا۔

"جیتے رہو۔ خوش رہو۔"

"کہاں جارہی ہیں آپ۔۔۔؟" تیمور نے بالوں سے بارش کا پانی جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"عزت کی گاڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں آئی اور دیکھو شام ہو رہی ہے۔" وہ قدرے پریشانی سے بولی تھیں۔

"ارے ڈونٹ وری مام۔۔۔! آجائے گی وہ۔ یقیناً "ساشا وغیرہ کے ساتھ ہوگی۔۔۔ آپ اندر چلیے۔" تیمور نے ان کے کندھے کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے ان کا رخ دوبارہ کاریڈور کی سمت موڑ لیا تھا۔

"لیکن بیٹا۔۔۔! یہ بھی تو دیکھو ناکہ موسم کتنا خراب ہو رہا ہے؟" ان کی پریشانی ہنوز تھی۔

"پلیز مام۔! آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہے یا پہلی دفعہ گھر سے باہر نکلی ہے؟" تیمور نے خفگی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور ان کے ساتھ چلتے چلتے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

"اسے جب بھی گھر آنے میں دیر ہوتی ہے مجھے اسی طرح پریشانی ہونے لگتی ہے' تم بھی تو جانتے ہو کہ کیسی سرپھری سی لڑکی ہے وہ' نجانے کب کیا کر بیٹھے۔ بس اسی وجہ سے ڈر لگا رہتا ہے مجھے۔"

"یہ لیں جناب۔۔۔ میں آگئی گھر۔ اب تو نہیں لگے گا نا آپ کو ڈر۔۔۔؟" عزت بھی بارش میں بھیگتی ہوئی اسی وقت اندر آئی تھی اور رابعہ بیگم کی آواز سن کر ڈرائنگ روم میں ہی آگئی تھی۔

"لیں۔ اب مطمئن ہو جائیں۔" تیمور عزت کی طرف پلٹتے ہوئے مسکرایا۔

"تو نہ ہوں؟ آخر ماں ہیں میری۔" عزت تیمور سے کہتی ہوئی رابعہ بیگم سے لپٹ گئی۔ اور اس کے یہ لاڈ پیار کبھی کبھار ہی ہوتے تھے۔

"تو میں کون سا کہہ رہا ہوں کہ دشمن ہیں؟" تیمور ہنسا تھا۔

"ارے واہ۔! یہاں تو بڑے جذباتی سین چل رہے ہیں؟" رضا حیدر بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے ٹھٹک گئے تھے۔

"لیں جناب۔! میرے اباجی بھی آگئے۔" عزت خاصے دیسی انداز میں چہکی اور وہ سب ہنسنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

"کہاں گئے تھے آپ۔ قیام بھائی کا فون آرہا تھا' انہوں نے ہمیں اپنے گھر دعوت پہ بلایا ہے' کہہ رہے تھے کہ ہم لوگ ان کے گھر نہیں گئے۔" رابعہ بیگم کے منہ سے قیام مرزا اور ان کے گھر دعوت کا ذکر سن کر عزت کا منہ کڑوا ہو گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔! مجھے بھی کال آئی تھی اس کی۔" رضا حیدر نے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"میں ذرا چینج کرلوں۔" عزت لاتعلقی سے کہتی اٹھ گئی تھی۔ اسے مونس مرزا کی وجہ سے اس کے والدین سے بھی چڑ ہو گئی تھی۔

"او کے بابا۔۔۔! میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے بھی چینج کرنا ہے۔" وہ بھی کہتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔ لیکن بیڈ روم میں پہنچ کر کپڑے چینج کرنے کے بعد جیسے ہی اس نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کھولی' اس کے موڈ کا خوش گوار پرندہ سیدھا ماورا مرتضیٰ کی یاد کی منڈیر پہ جا بیٹھا تھا اور بڑی ترنگ سے چہچہانے لگا تھا۔ موسم کی خوش گواریت اس کے دل پہ اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کا دل سیل فون کی طرف ہمک رہا تھا۔ مگر افسوس کہ ادھر سے کال ہی ریسیو نہیں ہوئی تھی' وہ کتنی ہی بار کال کرتا رہا۔ مگر بے سود۔۔۔!

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پہ بے حد گہری نیند سو رہی تھی۔

جب ایک پانی کا قطرہ اس کے چہرے پر گرا تھا اور وہ گہری نیند سے کسمسائی تھی۔

پھر چند سیکنڈ کے توقف سے ایک اور قطرہ ٹپکا اور اگلے چند سیکنڈز میں ایک اور اور پھر یونہی اس کے کسمسانے اور ادھر ادھر سر مارنے کے بعد بھی یہ سلسلہ نہ رکا تو اس نے یک دم آنکھیں کھول دی تھیں اور پھر اپنے سوئے ہوئے دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اور اس کے چہرے پہ یہ پانی کے قطرے کہاں سے ٹپک رہے ہیں؟

اور جیسے ہی اس نے نائٹ بلب کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی' اس کا دھیان کمرے کی چھت کی طرف چلا گیا۔

مسلسل ٹپکنے والے پانی کے یہ قطرے کہیں اور سے نہیں بلکہ چھت سے ٹپک رہے تھے۔

یعنی باہر بارش ہو رہی تھی اور اس کے کمرے کی چھت ٹپکنا شروع ہو گئی تھی اور یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی' ایسا تو پہلے بھی کئی دفعہ ہو چکا تھا۔

"اف۔! یہ ایک نئی مصیبت ہے۔" وہ کمبل پیچھے ہٹا کر جھنجلاہٹ کے مارے بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا تکیہ اور کمبل کا کچھ حصہ بھی بھیگ چکا تھا۔ لیکن جب اس نے لائٹ آن کی تو وہ چیخ کے رہ گئی تھی۔

"او مائی گاڈ۔۔۔! یہ کیا ہو گیا۔۔۔؟" کمرے کے ایک کونے میں انتہائی سلیقے سے سیٹ کیا گیا کمپیوٹر سسٹم پانی کے چھینٹوں سے شرابور نظر آرہا تھا۔

"ماورا۔۔۔! ماورا۔۔۔ دروازہ کھولو۔ کیا ہوا ہے؟" عافیہ بیگم اپنی ساری خفگی اور ناراضی کہیں چھوڑ کر اپنے کمرے سے بھاگی چلی آئی تھیں۔

اور اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالا تھا۔

"دیکھ لیں کیا ہوا ہے؟" اس نے آگے بڑھ کے دروازہ کھول دیا تھا اور عافیہ بیگم کمرے کا حشر دیکھ کر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی رہ گئیں اس کا بستر اور کمپیوٹر پانی سے بھیگ رہا تھا اور فرش پہ بھی کہیں کہیں پانی کے چھینٹے سے نظر آرہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کمرے کی ساری چھت ہی چھلنی ہو گئی ہو' جگہ جگہ سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"ارے کیا ہو گیا ہے؟ کیا اودھم مچا رکھا ہے تم ماں بیٹی نے۔۔۔؟" بی گل بھی بے چاری نیند سے اٹھ کر گرتی پڑتی آگئی تھیں۔

"جی۔۔۔ آجائیں۔۔۔ آپ بھی دیکھ لیں۔۔۔ یہ ہے ہماری اوقات اور یہ ہے ہمارا فیوچر۔۔۔" ماورا طنزیہ کہتی ہوئی انہیں بھی اندر لے آئی' بی گل چپ ہو کے رہ گئی تھیں۔

"ہونہہ۔۔۔! رات دو بجے کا ٹائم ہے۔ لوگ اس اندھا دھند بارش میں آرام سے اپنے بستروں میں سو رہے ہیں اور ہم بے وقوفوں کی طرح کھڑے حسرت سے اپنے بستروں کو دیکھ رہے ہیں۔ واہ کیا کمال کی سچویشن ہے؟" ماورا اندر ہی اندر تلملاتی ہوئی بڑبڑا رہی تھی اور اس کی بڑبڑاہٹ سے دل ہی دل میں پریشان ہوتی عافیہ بیگم آگے بڑھ کے اس کا کمپیوٹر وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ پہ رکھنے لگیں۔ اور ماورا دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی۔

"آپ کیوں کھڑی ہیں بی گل! آپ بھی ان کی ہیلپ کیجیے۔ اتنا کام پڑا ہے آخر۔۔۔؟" ماورا جل کے بات کررہی تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ کیوں کہ اسے پتا تھا کہ اس کی ماں رات کے اس پہر اتنی کوفت اٹھانے کے بعد بھی اف نہیں کرے گی۔

"اللہ کا نام لو میرا بچہ۔۔۔! باہر اتنی بارش ہورہی ہے' اتنا طوفان مچا ہوا ہے۔ ایسے موسم میں غصہ نہیں کرتے' بلکہ نرم پڑجاتے ہیں۔" بی گل نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بی گل۔۔۔! میں کیسے نرم پڑجاؤں۔۔۔؟ میں اس وقت گہری نیند سے اٹھی ہوں۔ صرف اس چھت ٹپکنے کی وجہ سے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ نرم پڑجاؤں؟" ماورا جھنجلائی تھی۔

"تو یہ غصہ کس پہ کررہی ہو۔۔۔؟ اپنے خدا پہ۔۔۔ جس کی وجہ سے یہ بارش ہورہی ہے۔۔۔ یا پھر اپنی ماں پہ۔۔۔ جس کی وجہ سے تمہارے سر پہ ایسی کمزور سی چھت ہے۔۔۔؟"

بی گل کو ہمیشہ اس پہ پیار ہی آتا تھا' لیکن اس وقت اس کا بے وجہ غصہ دیکھ کر انہیں بھی غصہ آگیا تھا۔

"یعنی مجھے اب غصہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔۔۔؟" وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے بی گل کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"ہاں۔۔۔! نہیں کرنا چاہیے۔ رحمت اور زحمت سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اس میں کسی انسان کا کیا قصور ہے بھلا۔۔۔؟" بی گل نے اب ذرا تحمل سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اوکے۔۔۔! نہیں کرتی غصہ۔۔۔ لیکن یہ بتائیں کہ کیا ہم ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔۔۔؟ کیا ہمیں یہیں مرنا اور یہیں جینا ہے؟ کیا ہمیں اپنی قسمت اور اپنے حالات بدلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہیں مارنے چاہئیں؟" وہ بھی اب کی بار کافی ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاتھ پاؤں مارو۔۔۔ ضرور مارو۔۔۔ لیکن یہ کون سا وقت ہے چیخنے چلانے کا۔۔۔؟" بی گل اور ماورا ہی ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں جبکہ عافیہ بیگم اس کا بستر اور کمپیوٹر وغیرہ اٹھانے اور سمیٹنے میں مصروف تھیں۔

"میں بھی تو اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ یہ کون سا وقت ہے کہ ہم سب کے سب چھت ٹپکنے کا تماشا دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی اس وقت آرام۔۔۔"

"بس کرو ماورا۔۔۔ پلیز بس کرو۔۔۔ کس پہ چلا رہی ہو۔۔۔ کس لیے چلا رہی ہو۔۔۔ مجھ پہ نا۔۔۔ کیوں کہ میری وجہ سے تمہیں یہ سب برداشت کرنا پڑرہا ہے' یہ بارش کا پانی۔۔۔ چھوٹا کمرا۔۔۔ یہ کوفت' یہ بے زاری۔۔۔ سب میری وجہ سے ہے نا۔ ورنہ تمہاری قسمت تو تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتی۔۔۔ لیکن مجھ پہ چیخنے چلانے سے پہلے کبھی ایک بار یہ بھی تو سوچو کہ وہ لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس یہ چھت بھی نہیں ہے۔ جو اتنی سی چھت کو بھی ترستے ہیں' جو کھلے آسمان تلے سوتے ہیں۔ تم تو صرف چھت ٹپکنے پہ چلا رہی ہو اور تمہاری برداشت سے باہر ہورہا ہے' ان لوگوں کو دیکھو جن کے اوپر چھت ہی آگرتی ہے اور پانچ پانچ۔۔۔ چھ۔۔۔ چھ۔۔۔ افراد جاں بحق ہوجاتے ہیں۔۔۔ لیکن پھر بھی تمہاری طرح کوئی ناشکری نہیں کرتا ہوگا اور نہ ہی اس طرح چلاتا ہوگا کیوں کہ انہیں اپنے ماں باپ سے یا اپنے خدا سے اختلاف نہیں ہوتا جبکہ تمہیں ہے اور وہ بھی صرف میری وجہ سے۔۔۔ لیکن فکر مت کرو۔ یہ سب آخری بار ہوا ہے۔ آئندہ نہیں ہوگا۔ تم کراچی جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔ اپنی قسمت بنانا چاہتی ہو تو بناؤ۔ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

عافیہ بیگم یک دم جب زور زور سے بولنے پہ آئیں تو بولتی ہی چلی گئیں اور پھر سب کچھ وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اور وہ دونوں جوں کی توں اپنی جگہ پہ کھڑی رہ گئیں۔

بارش کے شور کے علاوہ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا اور بجلی بھی چلی گئی تھی جس کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا ہی

اندھیرا نظر آنے لگا تھا اور یوں وہ رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

لیکن اس رات کی صبح بہت نرالی تھی۔ وہ کام با آسانی ہوگئے تھے جن کے لیے ماورا کو بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے' مگر وہ سارے کام اس ایک رات میں ہوگئے تھے۔

عافیہ بیگم نے اپنی بیس سالہ جاب سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اپنا سامان باندھنا شروع کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں کل کراچی آرہی ہوں۔" ماورا کا لہجہ بہت سپاٹ سا محسوس ہورہا تھا' لیکن اس کے منہ سے نکلنے والے اتنے سے جملے سے ہی بے پناہ خوش ہونے والے تیمور حیدر کو اس کے سپاٹ لہجے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

"اوکے۔۔۔! میں ریسیو کرنے کے لیے آجاؤں گا۔"

"نہیں۔۔۔ آپ نہیں۔۔۔ فارہ آئے گی۔ میں اسے کہہ دوں گی۔" اس نے منع کردیا تھا۔

"لیکن اس میں کیا پرابلم ہے بھلا۔۔۔؟" تیمور کو برا لگا تھا۔

"پرابلم ہے یا نہیں۔۔۔ بس فارہ آئے گی۔ آپ فلیٹ کی چابی اسے دے دیں اور میں پرسوں آفس جوائن کرلوں گی۔ میں جس کام کے لیے آرہی ہوں وہ جلدی اسٹارٹ کرنا چاہتی ہوں۔" ماورا کا انداز اور الفاظ دونوں ہی بہت دوٹوک سے ہورہے تھے۔

"اوکے۔۔۔! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" تیمور نے متبسم لہجے میں کہہ کر فون بند کردیا تھا اور چند سیکنڈ یونہی ایک خوش گوار یت کے زیر اثر رہنے کے بعد فارہ کا نمبر ڈائل کرکے یہ خوش خبری اسے بھی سنادی تھی۔

فارہ نے آج سے ہی آنے والے کل کے لیے تیاری شروع کردی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نگہت سیما

ان ہونی

ناولٹ

کبھی کبھی ان ہونی ہو جاتی ہے۔

میرے ساتھ بھی انہونی ہی ہوئی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں حاجرہ منیر حسین نچلے متوسط طبقے کی لڑکی اور وہ۔۔۔

مجھے یقین نہیں آتا، لیکن پھر بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یعنی واقعی کبھی کبھی انہونی ہو ہی جاتی ہے اور میں حاجرہ منیر حسین۔۔۔ یہ منیر حسین کا لاحقہ بھی میں نے خود ہی اپنے نام کے ساتھ لگایا ہے ورنہ بے بے نے تو میرا نام حاجرہ پروین رکھا تھا اور وہ اب بھی مجھے حاجرہ پروین کہہ کر ہی بلاتی ہے، لیکن میں جب میٹرک کا فارم پُر کرنے لگی تھی تو مجھے اپنا نام بڑا غریب اور مسکین سا لگا تھا۔ حالانکہ بے بے کہتی تھی۔۔۔

"تیرا نام تو میں نے بی بی حاجرہ کے نام پر رکھا ہے۔ اتنا سوہنڑا اتنا پاک نام۔"

لیکن اس روز جب ہم فارم پر کر رہے تھے تو صائمہ مصطفیٰ چوہدری، یسریٰ صادق خان، مصفورا ملک جیسے نام سن کر میں دل میں بڑی چھوٹی سی ہو گئی تھی۔ جیسے ہمارے اسکول کی مائی پروین اختر۔۔۔ سو میں نے اپنے فارم پر لکھ دیا۔ حاجرہ منیر حسین۔ ڈاٹر آف راجہ منیر حسین پھر فارم چیک کرتے ہوئے میری ٹیچر نے حاضری کے رجسٹر پر نظر ڈالی۔

"یہاں تو حاجرہ پروین لکھا ہے۔"

"لیکن میرا نام حاجرہ منیر حسین ہے۔"

"اچھا کل ذرا اپنا برتھ سرٹیفکیٹ لے کر آنا۔"

"ٹھیک ہے۔ لے آؤں گی۔"

میں نے کہہ دیا تھا، لیکن نہ تو ابا نے میرا برتھ سرٹیفکیٹ بنوایا تھا نہ کمیٹی کے دفتر میں اندراج کرایا تھا۔ تب اتنی چیکنگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ نہ ب فارم کا جھگڑا ہوتا تھا۔ بس اسکول میں داخل کرواتے ہوئے جو عمر لکھوا دی، لکھوا دی۔۔۔

میں چھ سال کی تھی، لیکن جب میرا ماما مجھے اسکول داخل کروانے لے گیا تو اس نے میری عمر پانچ سال لکھوا دی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ میری تاریخ پیدائش کیا ہے۔ تاہم اماں نے اسے بتایا تھا کہ جیٹھ کا

مہینہ تھا۔ باہر سورج آگ اگل رہا تھا۔ ماما نے میری تاریخ پیدائش یونہی اندازے سے 29 اگست لکھوا دی تھی۔۔۔ یوں مجھے کبھی صحیح سے پتا نہ چل سکا کہ میرا اسٹار کیا ہے۔۔۔ میں اپنی فرضی تاریخ پیدائش کے حساب سے سب کو اپنا اسٹار سنبلہ ہی بتا دیتی تھی۔۔۔ ابا کو تو ان باتوں کی سمجھ نہ تھی‘ لیکن ماما پڑھا لکھا تھا۔ اس نے میرا اندراج بھی کروایا اور پیدائش کا سرٹیفکیٹ بھی بنوا دیا۔۔۔ رشوت دی تھی یا تعلقات سے کام چلایا تھا‘ لیکن کام ہو گیا تھا۔ میں نے ماما کو بتا دیا کہ میں نے اپنے فارم پر اپنا کیا نام لکھا ہے۔ تب ماما بہت ہنسا تھا‘ لیکن اس نے میری مرضی کے مطابق کام کروا دیا تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ انہونی ہو گئی ہے۔ ویسے تو میرے ساتھ زندگی میں کئی بار انہونی ہوئی۔ میری تو پیدائش بھی انہونی ہی تھی۔ جب اماں ابا بالکل مایوس ہو گئے تو میں آ گئی۔

انہونی سی انہونی!

تسبیح کے دانے گراتے گراتے بے بے کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں کون سی بن گئی تھی‘ وہ تخت پر بیٹھی دانے گرائے جاتی اور دعائیں مانگتی جاتی۔

”اللہ میرے منوں کی کھیتی بھی ہری کر۔“

اب پتا نہیں بے بے کی دعا میں اثر نہیں تھا یا اللہ کو ابا کا امتحان مقصود تھا کہ اس نے ابا کی کھیتی کو ہرا تو کیا پیلا بھی نہیں کیا۔ اماں ڈاکٹروں سے مایوس ہوئی تو فقیروں کے پاس اور درگاہوں پر جانے لگی۔ بھاگ بھاگ کر تھک گئی۔ تعویذ گنڈے‘ دوائیں سب آزما کر دیکھ لیں تو آنکھوں میں آنسو بھر کے ابا سے کہا۔

”منیر حسین! ہماری اولاد نہیں ہونے کی۔ اب تو چاہے تو اولاد کی خاطر بھلے دوسری شادی کر لے۔“

”چل چپ کر پھر نہ کہنا ایسی بات‘ اللہ کی رضا پر راضی ہو جا۔“

اور اماں تو اللہ کی رضا پر خود کو راضی رکھنے کی کوشش میں لگ گئی اور بے بے نے ایک روز تسبیح گھٹنے کے نیچے رکھ کر ابا سے کہا۔

”سن منیر حسین۔۔۔!“

جب بے بے کو ابا سے کوئی خاص بات کرنا ہوتی تھی تو وہ ابا کو منیر حسین کہہ کر بلاتی تھی ورنہ وہ اب تک بے بے کا منوں تھا۔

”جی بے بے۔۔۔!“ ابا اپنا تھیلا رکھ کر اس کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی ——— ابا کو اس تھیلے کے بغیر نہیں دیکھا۔ اس تھیلے میں آری‘ بسولا‘ رندہ‘ فیتہ اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ڈک (لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے) ہوتے تھے۔

”سن منیر حسین!“ بے بے نے اپنی بات دہرائی تھی۔

”جی بے بے حکم کر۔۔۔“ یہ ابا کا خاص جملہ تھا‘ جسے میں نے ابا کو ہمیشہ بے بے کی کہی بات پر کہتے سنا تھا۔

”بہت دعائیں کر لیں۔ سب فقیروں‘ درگاہوں کو آزما لیا۔۔۔ ڈاکٹروں کو دکھا لیا۔ پر نہ رحمت نصیب ہوئی نہ نعمت ملی۔۔۔“

”تو؟“ ابا نے سوالیہ نظروں سے بے بے کو دیکھا تھا۔

”تو یہ کہ میرے پتر! اب اور کتنا دیکھیں۔ سولہ سال دس مہینے اور آٹھ دن ہو گئے تیری شادی کو اور تیری بیوی چوہیا کا ایک بچہ بھی نہ جن سکی۔“

ابا ہنس پڑا تھا۔ اسے دو باتوں پر ہنسی آئی تھی۔ ایک تو چوہیا کے بچے والی بات پر اور دوسرا اپنی شادی کا اتنا صحیح حساب بتانے پر۔

”لگتا ہے بے بے! تو نے ایک ایک دن کا حساب رکھا ہے۔“

”ہاں تو میں کب بھولی ہوں ستمبر کا مہینہ تھا اور چودہ تاریخ اور۔۔۔“

”مجھے تو یاد نہیں رہا بے بے! پر تجھے خوب یاد ہے۔“

”چل بات نہ بدل۔۔۔ تو میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”بے بے! تو چوہیا کے بچے کی بات کر رہی تھی۔ تو صالحہ تو انسان ہے وہ بھلا کہاں چوہیا کا بچہ پیدا کر سکتی ہے۔“ وہ پھر ہنسا تھا۔

”چل بک بک نہ کر۔ بس اب میں نے سوچ لیا ہے تیری شادی کرنے کا۔ تیری بیوی تو خالی ٹھونٹھ ہے۔“

”یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ بے بے اس میں اس نمانی۔۔۔ کا کیا قصور اور میں بھی راضی ہوں اللہ کی مرضی پر۔“

ابا بڑا ہی صابر اور قناعت پسند بندہ تھا۔ سالن نہ ہوتا تو اچار سے روٹی کھا لیتا۔ اچار نہ ہوتا تو چارپائی کے پائے پر پیاز رکھ کر مکا مار کر اسے توڑتا۔ چھلکے الگ کر کے پھینکتا اور اسی سے روٹی کھا لیتا۔ جو وہ بھی نہ ہوتا تو سوکھی روٹی بھی کھا لیتا۔ پر بے بے کا صبر تو سولہ سال دس ماہ آٹھ دن تک آ کر ختم ہو گیا تھا۔

”سن لے منیرے! قصور وصور مجھے نہیں پتا۔ اب میں تیری دوسری شادی کرواؤں گی۔ کروا کر رہوں گی۔“

ابا نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”یہ صالحہ کدھر ہے؟“

”بدہضمی ہو گئی تھی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ رات چنوں کی دو پلیٹیں جو کھا گئی تھی۔ صبح سے ڈکار رہی تھی۔“

”چھوڑ بے بے! مجھے بھلا کس نے رشتہ دینا ہے۔ بس صبر شکر کر لے۔“

”میں نہیں کرنے کی اب صبر۔ اور یہ تو نے خوب کہی۔ بھلا کوئی کیوں رشتہ نہیں دے گا۔ پکا سیمنٹ والا اپنا گھر ہے۔ اپنا کھاتا ہے اپنا کماتا ہے۔ اس پر اتنا سوہنا کہ میں تو نظر لگ جانے کے ڈر سے کبھی نظر بھر کر دیکھتی ہی نہیں۔“

”تو بھی بے بے بس۔“

ابا خواہ مخواہ ہی ہنس دیا تھا لیکن اماں تو دل سے ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی بے بے سے لپٹ گئی تھی۔

”بے بے! اللہ نے تیری دعائیں سن لیں۔“

انہونی ہو گئی تھی‘ پر نہ بے بے کو یقین آ رہا تھا نہ ابا کو۔

ابا کی کھیتی میں بیج پھوٹ پڑا تھا۔ بے بے اتنی خوش تھی کہ اس نے پورے محلے میں بتاشے بانٹے تھے۔

”اور کیا آپ بھی خوش ہوئے تھے اماں کی بات سن کر؟“ ایک روز میں نے شرارت سے پوچھا تھا۔

”تو بھلا میں کیوں خوش نہ ہوتا؟“

”دوسری شادی کا معاملہ جو کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔“ میں پھر شرارت سے بولی۔

”چل شریر!“

ابا ہولے سے مجھے دھپ لگاتا اور گیلی لکڑیوں کو جلانے کی کوشش میں پھونکنی سے پھونکیں مار مار کر آگ جلاتی اماں کے کان ”دوسری شادی“ پر کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ لکڑیوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے مشکوک نظروں سے مجھے اور ابا کو دیکھتی جاتی۔

بے بے اور ابا نے اس روز کی بات مجھے اتنی بار بتائی تھی کہ مجھے لگتا تھا جیسے اس روز میں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

میرا ابا ذات کا ترکھان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا ہنر تھا۔ بے بے نے مجھے بتایا تھا جب ابا گاؤں میں تھا تو گاؤں کی ساری کڑیوں کے جہیز کے میز‘ کرسیاں‘ پلنگ‘ رحل ایسے بناتا تھا کہ آنکھیں کھلی رہ جاتی تھیں۔ سات گراؤں میں تیرے ابا اور دادا کے ہاتھ کے بنے فرنیچر کی مانگ تھی۔ چھوٹی عمر میں ہی تیرے دادا نے اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔۔۔ پر نصیب خراب تھے سب چھوڑ چھاڑ گاؤں سے نکلنا پڑا۔ دکان میں پار گاؤں کے زمین دار کی بیٹی کے جہیز کا سامان بن رہا تھا۔ پیڑھے شیشوں والے اونچی پشت والے پلنگ اور میز کرسیاں کسی ظالم نے آگ لگا دی۔ عمر بھر کی پونجی ختم ہو گئی۔

یہ سب بے بے نے ہی مجھے بتایا تھا۔ اماں ابا نے کبھی ماضی کا ذکر نہ کیا۔

ابا تھا تو ترکھان لیکن میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے تھیلا کندھے پر ڈالے گلی گلی آواز لگاتے دیکھا تھا۔

”منجی پیڑی ٹھکا لو۔“

ابا اگر ہنر مند تھا جیسا بے بے کہتی تھی تو ہو گا کبھی' لیکن اب تو منجیاں (چارپائیاں) ٹھونکنے کا کام کرتا تھا اور اتنا کما لیتا تھا کہ گزارہ ہو جاتا تھا۔ اتنی مہنگائی بھی نہیں تھی تب چھوٹا شہر تھا۔

ایک دفعہ میں نے پوچھا تھا کہ یہاں شہر میں کوئی دکان کیوں نہ بنالی۔

"بس پتر! سب نصیب کے کھیل ہیں۔ جب نیا نیا شہر آیا تھا تو کسی دکان پر مزدوری بھی نہ ملی تو بس یہ کام شروع کر دیا۔"

ابا نے مجھے تفصیل تو نہیں بتائی تھی لیکن اب میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ انہیں نئی جگہ پر سروائیو کرنے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا' مکان اپنا تھا... شاید ابا نے ساری جمع پونجی یہ مکان خریدنے پر لگا دی ہوگی... اماں نے گھر اچھا سنوار کر رکھا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز ہی تھی۔ اماں اور بے بے کروشیے کا کام بھی کر لیتیں۔ کچھ بچت بھی کر رکھی تھی۔

اماں ابا دونوں ہی بے حد خوب صورت تھے۔ اماں تو بہت ہی خوب صورت۔ منہ دھو کر تیل لگا کر چٹیا کر کے ذرا سا دنداسہ ہی مل لیتی تو چمک اٹھتی تھی۔ اس لیے تو ابا نے سولہ سال دس مہینے آٹھ دن دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ پر میں ان دونوں جتنی خوب صورت نہ تھی۔ گندمی سے رنگ کی بے حد عام سے نقش و نگار والی لڑکی تھی جیسے سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں... سینکڑوں لڑکیوں میں میری اپنی کوئی الگ پہچان نہ تھی کہ میں لڑکیوں کے ہجوم میں الگ سے نظر آؤں۔ حالانکہ بے بے کے کھنڈر بھی بتاتے تھے کہ عمارت یقیناً "شان دار ہوگی۔

بے بے میری سہیلی بھی تھی اور دادی بھی۔ مجھے اس سے ماضی کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا جیسے کہانیاں ہوں۔

جب میں پانچ سال کی ہوئی تو ابا نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

"بے بے! حاجرہ کو اسکول میں نہ داخل کرادیں۔"

"ہرگز نہیں... بس مولوی صاحب کی بیوی کے پاس بٹھا دوں گی کل... قرآن پڑھ لے' نماز' روزہ کرلے تو بس بہت۔"

ابا بے بے کے سامنے کم ہی بولتا تھا اور بولتا بھی تو ایک ہی بات۔

"حکم کرو بے بے!"

اور ابا نے بے بے کا یہ حکم بھی مان لیا۔ میں مولوی صاحب کے گھر جانے لگی۔

پر پھر ایک انہونی ہو گئی۔

اس روز میں بے بے کے تخت پر بیٹھی قرآنی قاعدہ کھولے سبق دہرا رہی تھی کہ ابا نے گھر میں قدم رکھا' لیکن ابا اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد' ایک عورت اور ایک بچی بھی تھی۔

"الطاف!" اماں جو صحن میں حمام کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے چلائی تھی اور پھر دوپٹے سے صابن بھرے ہاتھ پونچھتی اٹھ کر اس مرد سے لپٹ گئی تھی۔

"میرا ویر' میرا ماں جایا۔ میرا بھرا۔" وہ رو رہی تھی اور وہ مرد اسے تسلی دے رہا تھا۔

اور میں حیرت سے تخت پر بیٹھی اسے دیکھتی تھی۔

یہ میرا ماما تھا۔ گورا چٹا' اونچا لمبا' اماں جیسا خوب صورت اور وہ عورت میری مامی تھی۔ واجبی سی شکل و صورت کی اور مامی کی انگلی پکڑے سرخ چیک دار فراک پہنے بچی ان کی بیٹی تھی۔ واجبی سے بھی کم شکل کی۔ چھینی سی ناک' چوڑا' ٹھا' ور چندھی آنکھیں۔

جب اماں' ابا اور بے بے نے گاؤں چھوڑا تھا تو کسی کو اپنا اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ ابا کا تو کوئی سگا تھا نہیں' لیکن ساتھ والے گاؤں میں اماں کا میکہ تھا... دو بھائی ایک بہن۔ بڑا بھائی اور بہن شادی شدہ تھے۔ چھوٹا بھائی الطاف دسویں میں پڑھتا تھا۔ ماں باپ سال پہلے آگے پیچھے گزر گئے تھے۔ شاید انہوں نے جلدی میں گاؤں چھوڑا تھا اس لیے اماں کے میکے والوں کو بھی اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ ماما دو سال پہلے شہر آیا تھا اور اس روز ابا جب منجی ٹھکالو کی آواز لگاتا محلہ قصاباں سے گزر رہا تھا تو مامے نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بھائیا جی۔ میں الطاف!" اور یہ کیسی انہونی ہوئی تھی اس روز اماں نے میرا منہ چوم کر لال کر دیا تھا۔

"تو بڑی بھگوان ہے' بڑے نصیبے والی۔" اس روز اماں روئی بھی تھی اور ہنسی بھی تھی۔ مامے الطاف نے بتایا تھا کہ اس نے چودہ جماعتیں پڑھ کر ادھر قصبے میں نوکری کر لی تھی اور اب اپنی دھی رانی کے لیے شہر آئے تھے۔ مامے کی یہ ایک ہی بیٹی تھی۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوٹی عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور ماما اپنی بیٹی کو بہت سارا پڑھانا چاہتا تھا اچھے انگریزی اسکولوں میں۔ اس لیے دو سال پہلے اس نے یہاں نوکری کر لی تھی۔

وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہو گی اور شکل و صورت میں بالکل گئی گزری' لیکن جب اس نے اشاروں سے مٹک مٹک کر "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار" سنائی تو سب ہی اس پر واری صدقے ہونے لگے اور ابا نے جیب سے اسے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا تھا۔ اس وقت ایک روپے کی بڑی ویلیو تھی۔ پورے سولے آنے ہوتے تھے اس میں... میں چھ سال کی تھی اور وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی تھی' لیکن مجھے اس وقت اس سے دل میں بڑی جلن محسوس ہوئی تھی اس لیے کہ اس کے پاس ایک روپیہ تھا اور مجھے تو کبھی کبھی ابا ایک آنہ دو آنے دے دیتا تھا۔

پھر اس نے اسی طرح اشارے کر کر کے کئی نظمیں سنائی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ نظم سناتے ہوئے وہ مجھے بھی اچھی لگ رہی تھی۔

کٹے ہوئے بال۔ چیک دار فراک' سفید موزے اور سرخ و سفید بوٹ۔

میں اپنے گھر کی منظور نظر تھی۔ ابا' بے بے اور اماں کی آنکھ کا تارا' لیکن اب سب اسے دیکھ رہے تھے' سراہ رہے تھے... میں نے چپکے چپکے اس کا اور اپنا موازنہ کیا۔

بے بے نے صبح اچھی طرح تیل لگا کر کس کر میری

چٹیاں بنائی تھی اور میں نے چھینٹ کی پھول دار قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ شکل و صورت میں تو میں اس سے ہزار درجے اچھی تھی، لیکن اس وقت تو وہ ہی وہ تھی۔ بالکل میموں جیسے کپڑے پہنے۔

اس روز میں نے بے بے سے دو فرمائشیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ مجھے بھی ایسا ہی فراک اور جوتے لے دیں اور دوسری یہ کہ مجھے بھی ایسے ہی پوئم پڑھنا سکھا دیں۔ بے بے تو سٹپٹا گئی۔ اسے پوئم کہاں آتی تھی۔ اس نے ابا سے کہا تھا۔

"حسن منیر حسین!"

"حکم کرو بے بے جی!" ابا کے لبوں سے نکلا تھا۔

"حسن! اپنی ہاجرہ کو بھی کل ملکہ والے اسکول میں داخل کروادے۔"

اس کا نام ملکہ تھا۔ میں کمبل میں منہ چھپا کر خوب ہنسی تھی۔ بھلا ملکائیں ایسی ہوتی ہیں۔ اتنی کالی، اتنی پھینی۔۔۔

✡ ✡ ✡

اس روز میں اندر کمرے میں کمبل لے کر لیٹی ہوئی تھی اور وہ باہر بے بے اور اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ ماما اس کا دل بہلانے کے لیے ادھر لایا تھا۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا کیونکہ اس کی ٹیچر نے اسکول کے فنکشن میں ہونے والے ڈرامے میں اسے کوئن بنانے کے بجائے جادوگرنی بنا دیا تھا۔ اماں اسے پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"تو تو ویسے بھی ملکہ ہے۔ سچ مچ کی ملکہ۔ تجھے بھلا جھوٹ موٹ کی ملکہ بننے کی کیا ضرورت ہے۔"

اور میں اندر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

تو میں کہہ رہی تھی کہ اس روز انہونی ہوگئی تھی۔۔۔ ایک نہیں دو انہونیاں ہوئی تھیں۔

ایک تو برسوں کے بچھڑے، بہن بھائی مل گئے تھے۔

اور دوسرا ابا نے مجھے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ ملکہ والے اسکول تو نہیں کیونکہ وہ دور تھا، لیکن جس اسکول میں داخل کروایا تھا وہ بھی انگریزی اسکول تھا۔

ہماری زندگیوں میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ اب کبھی ماما، مامی اور ملکہ آجاتے اور کبھی ہم ان کے گھر چلے جاتے۔

میرا بڑا ماما تو کراچی میں تھا اور ماسی بھی۔ ایک بار مامے نے اماں سے سب کی بات کروائی تھی۔ اماں خوش تھی۔ ملکہ کا بولنا، اٹھنا بیٹھنا، لباس۔۔۔ میں ہر چیز سے جلتی تھی۔ حالانکہ ملکہ۔۔۔ بہت محبت سے ملتی تھی اور گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں، لیکن وہ کہتی تھی "میری اصل اور گوڑھی سہیلی تو بس تو ہے حاجرہ! میری بہن۔"

وہ مجھ سے ایک سال آگے تھی اور بہت لائق تھی۔ ہر سال فرسٹ آتی تھی۔ اس کی الماری میں اس کے جیتے ہوئے بہت سے انعام پڑے تھے۔ کپ، شیلڈ اور کتابیں۔۔۔ اس سے جلنے کا ایک فائدہ مجھے یہ ہوا تھا کہ میں بھی اس کی طرح فرسٹ آنے کے لیے بہت محنت کرنے لگی تھی، لیکن گھر میں نہ ابا ماما کی طرح پڑھا لکھا تھا نہ اماں مامی کی طرح دس جماعتیں پاس تھی۔ تو ابا مجھے وہ بات نہیں سمجھا سکتا تھا جو میں سمجھ نہ پاتی تھی جبکہ ملکہ کو ماما خود پڑھاتا تھا۔

ان کا گھر نزدیک ہوتا تو ماما مجھے بھی پڑھا دیتا، لیکن ان کا گھر دور تھا اور ابا صبح کا گیا رات کو تھکا ہارا گھر آتا تھا۔

جب میں ساتویں میں تھی تو پھر ایک انہونی ہوگئی۔۔۔ انہونی ہی تو تھی۔۔۔ سائرہ نے ساتویں میں ہی ایڈمیشن لیا تھا۔ خوش شکل تو وہ تھی ہی، لیکن امیر بھی بڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر آتی تھی اور ایک ملازمہ گاڑی سے اتر کر جماعت کے کمرے تک اس کا بستہ اٹھا کر لاتی تھی۔ وہ بہت مغرور تھی۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی۔

کئی لڑکیاں اس سے دوستی کرنا چاہتی تھیں لیکن اس نے کسی سے دوستی نہ کی بلکہ جو لڑکی اس کے ساتھ بیٹھتی تھی، اس سے بھی بات نہ کرتی تھی۔ اس کا بیگ بہت خوبصورت اور قیمتی تھا۔ اس کا پنسل باکس بھی بہت اچھا تھا۔ سب لڑکیاں چوری چوری اس کی چیزیں

دیکھتی تھیں۔ حالانکہ باقی سب لڑکیاں بھی اتنی غریب نہ تھیں۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کی تھیں۔ ایک میں ہی تھی، جو نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور میری فیس، کتابوں اور یونیفارم کے لیے ابا اور اماں کو ڈبل محنت کرنا پڑتی تھی۔

میرے جیسے نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں تو عام سرکاری اسکولوں میں پڑھتی ہیں لیکن یہ بے بے کا حکم تھا کہ صالحہ کی بھتیجی اگر انگریزی اسکول میں پڑھ سکتی ہے تو پھر بٹی کیوں نہیں۔

ایک روز سائرہ اپنا بیگ اٹھا کر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"مس! میں یہاں بیٹھوں گی حاجرہ کے پاس۔"

اور ٹیچر نے میری سیٹ فیلو کو اٹھا کر اس کی جگہ بٹھا دیا۔

"میرے ساتھ دوستی کرو گی؟"

"ہاں!" میں نے سر ہلا دیا تھا۔

اور ساری لڑکیوں کی آنکھیں جیسے حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ میں جو کلاس کی سب سے غریب لڑکی تھی اور شکل سے ہی پینڈو لگتی تھی، سائرہ نے دوستی کے لیے اسے چنا تھا حالانکہ وہ سب اس سے دوستی کرنا چاہتی تھیں۔

میں نے کپڑے تو سب لڑکیوں جیسے ہی پہنے ہوتے تھے کہ وہ یونیفارم تھا۔ سفید بلاؤز گرے اسکرٹ اور سفید شلوار لیکن میری لک کچھ پینڈو سی تھی کیونکہ بے بے اب بھی خوب تیل لگا کر اور کس کر میری چٹیا بناتی تھی۔

سائرہ نے مجھے اپنی سہیلی بنا لیا تھا۔ اور جب میں نے یہ بات ملکہ کو بتائی تو اسے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت آٹھویں جماعت میں تھی اور پڑھائی کے علاوہ کھیلوں اور تقریروں میں بھی کئی انعام جیت چکی تھی۔

"غربت یا امیری دوستی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی حاجو! تم اسے اچھی لگی ہوگی۔ شاید تمہارے اندر اسے کوئی ایسی خوبی نظر آئی ہوگی جس نے اسے متاثر کیا ہوگا۔"

مجھے تو کوئی خوبی اپنے اندر نظر نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ حساب میں میرے سو میں سے سو نمبر آتے تھے۔ کیونکہ ماما نے پورے تین مہینے تک اتوار کو آکر مجھے حساب کے سوال سکھائے تھے اور اب مجھے اتنی ضرورت نہ رہی تھی سمجھنے کی پھر بھی کوئی مشکل آتی تو ابا مجھے ماما کے گھر چھوڑ آتا تھا۔

کلاس کے علاوہ بریک میں بھی ہم ساتھ ہی ہوتی تھیں۔ اس کا نوکر بریک میں کھانا لاتا۔ تین ڈبوں والے ٹفن میں دو طرح کے سالن اور روٹی ہوتی تھی۔ میں بھی سلور کی ایک گول ڈبی میں پراٹھے میں کبھی آلو کی بھجیا کبھی اچار اور کبھی آملیٹ رکھ کر لاتی تھی۔

سائرہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیتی۔

چھٹی جماعت میں آنے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کا سیکشن الگ الگ ہوگیا تھا۔ لڑکیوں کے سیکشن میں اب میں ہی فرسٹ آتی تھی اور سائرہ نے اگر کلاس کی سب سے لائق لڑکی سے دوستی کرلی تھی تو یہ ایسی انہونی بھی نہیں تھی۔

لیکن پھر ایک اور انہونی ہوگئی۔

ایک روز سائرہ نے مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی کی سالگرہ تھی۔

میرا جانا تو کچھ مشکوک سا تھا پھر بھی میں نے سر ہلا دیا تھا۔ اور اتنے دنوں بعد اچانک اسے خیال آیا تھا کہ وہ مجھ سے اماں ابا کے متعلق پوچھے۔

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں حاجرہ؟"

"میرے ابا ترکھان ہیں۔" مجھے لگا تھا جیسے ترکھان ہونا چارپائیاں ٹھونکنے والا ہونے سے اچھا ہے۔

اور اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا تھا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"کیا مطلب کیا میرے ماتھے پر لکھا ہونا چاہیے کہ میرا ابا ترکھان ہے۔"

اس کی دوستی نے مجھے کچھ اعتماد بھی دے دیا تھا۔

"نہیں یار!" وہ ہنس دی تھی۔ "میری دادی کہتی

ہیں یہ جو ٹھوکے ہوتے ہیں ان کمبخوں کے ہاں بڑا حسن ہوتا ہے۔"

"ٹھوکے کیا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"یار! میری دادی پرانے زمانے کی عورت ہیں اور وہ ترکھانوں کو ٹھوکے کہتی ہیں پتا نہیں کیوں۔" وہ پھر ہنسی تھی۔

"اور تم تو بالکل بھی خوبصورت نہیں ہو۔ ہاں تمہارے بال اچھے ہیں۔ لمبے گھنے سلکی۔ جبکہ دادی کہتی ہیں ایسا لگتا ہے کہ سارا حسن اور خوبصورتی ہمارے گاؤں کے ٹھوکوں کے نام ہی لکھ دیا تھا سوہنڑے رب نے۔"

"میری اماں اور میرے ابا دونوں ہی بہت خوبصورت ہیں اور بے بے بھی کم نہیں۔" میں نے پہلی بار اماں ابا کا ذکر فخر سے کیا تھا۔

"دراصل۔" اس نے مجھ سے اپنا راز شیئر کیا تھا۔

"دادی چڑ کر ایسا کہتی ہیں۔ تم جب ہمارے گھر آنا تو میری دادی کو ہرگز یہ نہ بتانا کہ تمہارے ابا ترکھان ہیں۔ مجھے پتا ہے، وہ تم سے سوال ضرور پوچھیں گی کیونکہ انہیں سب کے حسب نسب جاننے کا بہت شوق ہے۔ دراصل۔ میرے بڑے تایا کو ترکھانوں کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تھا بلکہ دادی تو کہتی ہیں عشق ہو گیا تھا۔ ابھی تک تایا اس کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں۔ حالانکہ ایک عدد بیوی اور دو عدد بچے بھی ہیں۔"

"تو تمہارے تایا اس سے شادی کر لیتے" میں نے مفت مشورہ دیا تھا۔

"ہاں، دادی شاید مان ہی جاتیں ان کی حالت دیکھ کر پر مسئلہ یہ تھا کہ وہ لڑکی ساتھ والے گاؤں سے بیاہ کر ہمارے گاؤں میں آئی تھی۔ پورا گاؤں اس کے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔ یہ لمبے بال، آنکھیں ایسی جھیلیں کہ نظر اٹھائے تو بندہ ان میں ڈوب جائے۔ قدرت و رنگ نقش سب ہی بے مثل۔ دادی کو بھی شوق چرایا اسے دیکھنے کا تو گھر بلا بھیجا۔ بس غلطی۔۔ یہی ہوئی تھی۔ تایا کی نظر اس پر پڑ گئی اور تایا مچل گئے۔ شادی کروں گا تو اسی سے۔ اس کے خاوند کو کہو اسے طلاق دے دے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بھلا کوئی شوہر اتنا بے غیرت ہو سکتا تھا۔ تو بس دادی بتاتی ہیں انہوں نے چپکے چپکے گھر اور دوسرے سامان کا سودا کیا اور راتوں رات گاؤں چھوڑ دیا۔ تایا بے چاروں کو پتا ہی نہ چلا۔ اس رات وہ کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یوں یہ عشق کامیاب نہ ہو سکا۔"

اور پتا نہیں کیوں اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اگر ترکھانوں کی وہ لڑکی میں ہوتی اور مجھ سے سائرہ کے تایا نے عشق کیا ہوتا تو میں تو اس عشق کو پانے کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی۔ حالانکہ میں اس وقت ساتویں جماعت میں تھی اور اس سے پہلے کوئی ایسا خیال کبھی میرے دل میں نہیں آیا تھا۔

"ہے نا کچھ کچھ فلمی سی کہانی؟"

"ہاں کچھ کچھ۔"

اس نے مجھ سے میرے ابا کے متعلق پوچھا تھا تو میں نے بھی ضروری سمجھا تھا کہ اس سے اس کے ابا کے متعلق پوچھوں۔

"میرے ابا بہت بڑے زمین دار ہیں۔ چک ملوک شاہ میں ہماری بڑی زمینیں ہیں۔ وہ تو ابا، اماں یہاں شہر میں ہماری تعلیم کی خاطر رہ رہے ہیں۔ میرے دادا چوہدری لیاقت حسین کی پورے علاقے میں بڑی دھاک ہے۔"

اس روز ایک اور انہونی ہو گئی۔ میرے لیے تو یہ انہونی ہی تھی۔ میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اگلے روز میں اسکول نہیں جاسکوں گی اور پھر بھی سائرہ سے نہیں مل سکوں گی۔

اسکول سے آکر کھانا کھاتے ہوئے میں نے بے بے کو آج کی ساری رپورٹ دی تھی۔ پھر میں نے بے بے اور ابا کو چونکتے دیکھا تھا۔

ابا اس روز کام پر نہیں گیا تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور وہ دھوپ میں چارپائی پر کھیس لیے لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اب بے بے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں

میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔

اس آنکھوں کی گفتگو کا راز اگلی صبح کھلا تھا۔ بے بے نے مجھے اسکول جانے کے لیے اٹھایا نہیں تھا اور جب میں خود ہی اٹھ کر اور یونیفارم پہن کر بے بے کے تخت پر آکر بیٹھی تو بے بے نے کہا۔

"چل جاکر یونیفارم بدل لے۔"

"کیوں بے بے؟" میری آنکھوں میں حیرت تھی۔

"آج سنڈے تو نہیں ہے۔"

"نہ سنڈے نہ منڈے، تجھے اب اسکول نہیں جانا۔"

"مگر کیوں بے بے؟"

"زیادہ بک بک نہ کر۔ کہہ دیا کہ نہیں تو نہیں۔" بے بے کے چہرے پر ایسی پتھریلی تھی کہ میں بنا کچھ کہے اٹھ کر ابا کے پاس آگئی، جو تھیلا کھولے اپنے اوزار چیک کر رہا تھا۔

"ابا! بے بے کہتی ہیں کہ مجھے اسکول نہیں جانا کبھی۔"

"بے بے صحیح کہتی ہے پتر۔" بے بے کی ہر بات پر سر جھکا دینے والا ابا بھلا اب کیا اعتراض کر سکتا تھا۔

"لیکن مجھے پڑھنا ہے۔" میں نے پاؤں زور سے زمین پر مارے تھے۔ مجھے اپنے اکلوتے ہونے کا بڑا مان تھا۔

ابا بنا بولے اوزار تھیلے میں رکھ رہا تھا۔ "وہ بسولا کہاں گیا۔ ہاں یہ رہا۔"

"ابا!" میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا تھا۔

"آپ میری بات کیوں نہیں سنتے؟"

اسکول میں پڑھنے سے مجھے ادب آداب آگئے تھے اور اب میں اماں ابا کو تو یا تم کہنے کے بجائے آپ کہتی تھی۔

ابا نے بڑی بے بسی سے مجھے دیکھا تھا اور تھیلا اٹھا کر باہر باورچی خانے کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا اور اماں تھال میں پراٹھا اور سالن کی کٹوری ان کے سامنے رکھ رہی تھی۔

ابا دو نوالے کھا کر کھڑا ہو گیا تھا اور میں اپنے بستر پر گر کر رونے لگی تھی۔ نہ میں نے چائے پی تھی نہ میٹھا پراٹھا کھایا تھا جو اماں نے شاید بے بے کے کہنے پر میرا دل رکھنے کے لیے بنایا تھا۔

پھر دن کا کھانا بھی میں نے نہیں کھایا تھا یونہی روتی رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے پڑھنے کا شوق تھا یا نہیں، لیکن مجھے ملکہ سے مقابلہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں گھر بیٹھ کر اماں کی طرح کروشیے کی بیلیں بناتی رہوں گی اور وہ پڑھ لکھ کر بڑی افسر بن جائے گی۔

یہ بات مجھے زیادہ رُلا رہی تھی اور پھر رات کو ماما بھی آگیا۔ باہر برآمدے میں بے بے کے تخت کے پاس ابا، اماں اور ماما موڑھے بچھا کر بیٹھ گئے تھے بہت دیر تک ہولے ہولے باتیں ہوتی رہی تھیں۔ پھر ماما میرے پاس کمرے میں آیا۔ میرے سر پر پیار کیا اور یقین دلایا تھا کہ میں اگر پڑھنا چاہتی ہوں تو ضرور پڑھوں گی اور وہ مجھے دو تین روز تک کسی اور اسکول میں داخل کروا دے گا۔

"لیکن اس اسکول میں کیوں نہیں ماما؟" رو رو کر میری آنکھیں سوج چکی تھیں اور میری آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"کبھی کبھی کوئی بڑی مجبوری آن پڑتی ہے بٹی! بس چند دن صبر کرلے میں کسی اچھے اسکول کا پتا کر کے تجھے ادھر داخل کروا دوں گا۔"

اس وقت تو مجھے اس بڑی مجبوری کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن کئی سالوں بعد خود بخود ہی مجھے اس مجبوری کا پتا چل گیا تھا۔ چک ملوک شاہ میں بیاہ کر آنے والی ترکھانوں کی خوبصورت دلہن اماں کے علاوہ بھلا کون ہو سکتی تھی۔ اس لیے تو اماں ابا نے گاؤں چھوڑا تھا اور جب مجھے اس مجبوری کا ادراک ہوا تو میرے اندر دیر تک گدگدی ہوتی رہی تھی اور میرا دل چاہا تھا کہ میں اماں اور ابا سے پوچھوں اور انہیں بتاؤں کہ میں وہ جان گئی ہوں جو انہوں نے کبھی میرے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ لیکن میں اب بچی نہ تھی کہ جو جی میں آتا بے دھڑک کہہ دیتی۔ سو بس دل ہی دل میں محظوظ ہوتی رہی۔

ماما نے حسب وعدہ کسی اور اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ یہ بھی اچھا اسکول تھا۔ لیکن مجھے اپنا اسکول چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ یہاں میری سائرہ جیسی کوئی سہیلی نہ تھی جسے میرے ساتھ دیکھ کر لڑکیاں رشک کرتیں۔ میں نے اس اسکول میں دسویں تک پڑھا لیکن میرا دل نہیں لگا۔ بس میں اسکول جاتی رہی۔

ماما روز ہی آجاتا تھا اور پھر سب ہولے ہولے باتیں کرتے۔ شاید گھر بیچ کر کہیں اور جانے کی اور ماما انہیں سمجھاتا تھا۔

"اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا بھائیا جی! اٹھائیس سال گزر گئے اب تو مٹی پڑ گئی ہر بات پر۔"

پھر ابا اور بے بے مان گئے لیکن میں پھر کبھی اس اسکول نہ جا سکی۔ سرٹیفکیٹ لینے بھی ماما ہی گیا تھا۔

میں نے دسویں کا امتحان دیا تو بے بے کو ایک ہی ہڑک لگ گئی۔ میرے بیاہ کی۔

"سن منیر حسین! کوئی رشتہ دیکھ اپنی حاجرہ کے لیے۔"

"جی اماں!" پہلی بار ابا نے "حکم کریں بے بے" کے بجائے کچھ اور کہا تھا۔

"ہاں منوں! اپنی حاجرہ کی اب شادی کی عمر ہو گئی ہے۔"

اور ابا پریشان ہو کر اماں کو تکنے لگا تھا۔

آس پاس دور و نزدیک کوئی ایسا نہ تھا۔ ابا کا بھی کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ اور اماں کا بڑا بھائی اور بہن ایسے کراچی میں رچ بس گئے تھے کبھی ادھر نہ آئے۔ اماں کے متعلق جان لینے کے باوجود بھی۔

پھر حسب معمول یہ مسئلہ بھی ماما کے سامنے رکھا گیا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے آپا! پڑھنے دیں اسے۔"

"نہ! تو نے اپنی بیٹی کو کلکٹر بنانا ہے ہم نے نہیں۔" بے بے تو ماما کا منہ ہی بند کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے دیکھوں گا کوئی اچھا رشتہ ہوا تو۔" لیکن ماما کے دیکھنے سے پہلے ہی ایک رشتہ آسمان سے ٹپک پڑا۔ بے بے نے آس پاس محلے پڑوس کی ہر آنے والی خاتون سے، جو کروشیے کی بیلیں بنوانے آتی تھی میرے رشتے کی بات کان میں ڈال رکھی تھی۔ جبکہ میں تو جل جل کر کوئلہ ہو رہی تھی کہ ملکہ تو کالج جا رہی تھی اور میں گھر میں بیٹھ جاؤں۔ رشتہ نہ بھی آتا تو مجھے بے بے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کالج میں مجھے پڑھائے گی۔

میں سارا دن اپنی چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔ اور کلستی رہتی تھی۔ بے بے آوازیں دیتی رہتی اماں اکیلی کام کرتی رہتیں لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوتی۔ مجھے سب پر غصہ تھا۔ ایک بار ملکہ بھی آئی تھی۔ وہ کالج جا کر نکھر گئی۔ اس میں کچھ وقار سا آگیا تھا اور اس نے نظر کا چشمہ لگا لیا تھا۔ اور اس نے بال نئے اسٹائل میں کٹوا لیے تھے، بے بے اس کے کٹے ہوئے بالوں کو دیکھ کر ہمیشہ برے برے منہ بناتی تھی۔

"حاجرہ! تم پریشان نہ ہو میں تمہارے لیے کتابیں لے آؤں گی۔ تمہارا رزلٹ آجائے نا تو پھر تم گھر میں ہی تیاری کر لینا۔ میں تمہاری مدد کر دوں گی۔ بلکہ ہر سنڈے کو کبھی تم میرے گھر آجانا کبھی میں آجاؤں گی تو۔"

"خود تم کالج میں مزے کرو اور میں۔" میں کلس رہی تھی۔ میں نے اس کے خلوص اور محبت کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔

خالہ بتول رشتہ لے آئی۔ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔

"میری پھوپھی کا پتر ہے۔ تھوڑی پکی عمر کا ہے۔ بس شادی میں تاخیر ہو گئی۔ اپنا کماتا ہے۔ یہ بڑی دکان ہے پنساری کی۔ اور گھر بھی اپنا ہے۔ میاں چنوں میں رہتا ہے میری پھوپھی کا پتر۔ پر آج کل میرے پاس آیا ہوا ہے آپ لڑکا یہیں دیکھ لو۔ پسند آجائے تو پھر میاں چنوں جا کر گھر بار دیکھ آنا۔"

بے بے تو جیسے کھل اٹھی تھی۔ اسی وقت چکن کی سفید چادر سر پر رکھ کر گرگابی پہن کر لڑکا دیکھنے چلی گئی۔

"بڑا امیر ہے منیر حسین۔ کہہ رہا تھا دس تولے سونا

چڑھ جائے گا مجھے تو لڑکا بہت پسند آیا ہے۔ تو بھی جا کر دیکھ لے۔"

ابا کو لڑکا پسند آیا تھا یا نہیں لیکن انہوں نے بے بے سے کہا تھا۔

"جو حکم بے بے۔"

"تو بس پھر منہ میٹھا کرادے بتول اور منڈے کا۔"

اماں نے تھوڑا بہت رولا بھی ڈالا تھا۔

"بے بے! لڑکا کہاں ہے وہ اچھا خاصا مرد ہے اور پھر شکل و صورت بھی۔"

"لو صالحہ!" بے بے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی تھی۔

"بھلا مرد کی شکل کس نے دیکھی ہے۔ بس آدمی کا بچہ ہونا چاہیے اور تیری دھی (بیٹی) کون سی حور اں پری ہے جو اس کے لیے شہزادہ اترے گا آسمان سے' بس ہاں کردی ہے میں نے۔"

اور وہ واقعی بس آدمی کا بچہ ہی تھا۔

رات کو بے بے کے بلانے پر وہ گھر آیا تو میں ملکہ کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر روئی۔ اماں نے مامے اور ملکہ کو بھی بلا لیا تھا۔ ملکہ نے کھڑکی کی جھری میں سے مجھے دکھایا تھا۔ پکا کالا رنگ۔ تیل میں چپڑے بال۔ ٹیڑھی مانگ نکالے بوسکی کا کرتا اور لٹھے کی شلوار پہنے منہ میں پان دبائے وہ مجھے زہر ہی لگ رہا تھا۔

ملکہ ترس اور تاسف سے مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

صبح سے اب تک مجھے تسلی دیتے دیتے اب اس کے الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔

بے بے نے اس کے ہاتھ پر ایک سو ایک روپیہ رکھ کر بات پکی کردی تھی۔ باہر برآمدے میں سبز اور سرخ گڈی کاغذوں سے ڈھکے مٹھائی کے دو ٹوکرے پڑے تھے۔ اور اندر میں ملکہ کی گود میں سر رکھے دھواں دھار رو رہی تھی۔

"شادی اگلے ماہ تک کردیں گے۔" بے بے نے ٹوکروں سے کاغذ ہٹاتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا۔

"ایک ماہ میں تیاری کیسے ہوگی؟" اماں منمنائی تھی۔

"چل ایک نہیں دو ماہ کرلے۔ بے چارہ لڑکا اکیلا ہے۔ کھانے پینے کی بڑی تنگی ہے اسے۔ ماں باپ سر پر نہیں۔"

اور لفظ لڑکے نے میرے اندر آگ لگادی تھی اور میں رو رو کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

اماں نے بڑا صندوق کھول کر کپڑے نکال نکال کر انہیں پیک کرنا شروع کردیا تھا۔ کھیس' بستر کی چادریں' گدے لحاف گنے جا رہے تھے کہ انہونی ہوگئی۔

بتول خالہ روتی دھوتی بے بے کے پاس آئی۔

رو کم رہی تھی۔ واویلا زیادہ ڈال رہی تھی۔

"ہائے میرا گھبرو جوان شیروں جیسا پھوپھی کا پتر' چھت سے گر کر ٹانگ' بازو اور جانے کیا کیا تڑوا بیٹھا ہے۔"

"اللہ کرے سارا ہی ٹوٹ کر ختم ہو جاتا۔" میرے لبوں سے نکلا تھا۔ بے بے نے ابا کو نی الفور میاں چنوں جا کر داماد کی خیریت پوچھنے بھیجا تھا۔ خالہ بتول کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"تو بھائی منیر حسین کو کیوں تکلیف دیتی ہیں بے بے!" ہماری لگو کھا دیکھی آس پڑوس والے بھی انہیں بے بے کہہ کر بلانے لگے تھے۔

"خوامخواہ کا خرچا اور سفر کی تکلیف الگ۔ اللہ کرے گا بھلا چنگا ہو جائے گا تو خیر نال بارات لے کر آجائے گا۔"

پر ابا کے لیے تو بے بے کی بات حکم تھی وہ فروٹوں کے ٹوکرے گاڑی میں رکھوا کر چل دیا۔

پر جب واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا۔ سر جھکا ہوا۔

بے بے نے بے قراری سے داماد کا حال پوچھا تو ابا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ انہوں نے کندھے پر رکھے پرنا سے آنسو صاف کیے اور صرف اتنا کہا۔

"بے بے! وہ تو جوان جہان بچوں کا پیو ہے۔ سانڈ کے سانڈ ایسے دیکھتے تھے مجھے جیسے کھا جائیں گے۔

ایک نہ دو پورے پانچ تھے پلٹن کی پلٹن۔ بے بے معاف کردینا تیری حکم عدولی کی میں نے' پر میں نے وہاں کہہ دیا اس سے کہ بات ختم۔"

اور اماں نے سینے پر دو ہتھڑ مارے۔

"ہائے بے بے! میری اکو اک دھی پر کیا ظلم ڈھانے لگی تھی تو۔"

بے بے چپ' شرمندہ سی' تسبیح اٹھا کر دانے گرانے لگی تھی اور میرا دل چاہا کہ میں دھمال ڈالوں۔

سب کپڑے کھیس بستر برتن واپس صندوق میں رکھ دیئے گئے تھے۔ بے بے نے بتول خالہ کو بڑا ہی شرمندہ کیا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا تھا کہ شادی پر اس کے پھوپھی کے بیٹے نے اسے سونے کے جھمکے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے دل میں تو بڑی اتھل پتھل مچی تھی کہ میں بھی جا کر افسوس تو کروں کہ خالہ بڑا افسوس ہوا تیرے جھمکے ہاتھ سے گئے۔ اور تب ہی ماماہی اور ملکہ مٹھائی کا ڈبا لیے آگئے تھے۔ دسویں کا نتیجہ آگیا تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اپنے ہی سوگ میں جو پڑی تھی۔ ملکہ کے پاس میرا رول نمبر تھا اور ماما گزٹ سے نمبر دیکھ کر آئے تھے میں نے اپنے اسکول کی لڑکیوں میں سے سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ میرے نمبر تو ملکہ سے بھی زیادہ تھے۔

فرسٹ تو ملکہ بھی آئی تھی اپنے اسکول میں' لیکن میرے پورے دس نمبر اس سے زیادہ تھے۔ ملکہ نے خوشی سے مجھے گلے لگالیا تھا اور جب میں نے رشتہ ٹوٹنے کا اور جھمکوں کا بتایا تھا تو وہ بھاگتی ہوئی باہر گئی اور برقعہ سر پر رکھے ہمارے دروازے سے باہر نکلتی خالہ بتول کو پرسہ دے آئی تھی۔ میرے دل میں تو جیسے ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ میں نے اسے گلے لگا کر چوم لیا۔ وہ میری سچی اور پکی سہیلی تھی اور میں نے اس روز سوچ لیا تھا کہ اب میں کبھی ملکہ سے نہیں جلوں گی۔

یہ ملکہ ہی تو تھی جس سے مقابلے کے شوق میں محنت کرتی تھی میں۔

اور جس نے بے بے سے اتنی بحث کی تھی اور اب بھی اس نے بے بے کو قائل کرلیا تھا کہ مجھے کالج میں ضرور داخل ہونا چاہیے۔ ورنہ قوم کا بڑا نقصان ہو جائے گا اتنی لائق فائق لڑکی اگر پڑھ نہ سکی پھر مجھے اسکالر شپ بھی مل جائے گا تو ابا کو کچھ زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔

اور یوں میں اسی کے کالج میں داخل ہو گئی تھی۔

بے بے نے تسلیم کرلیا تھا کہ مجھے یعنی حاجرہ منیر حسین کو بہت سارا پڑھ لینا چاہیے۔ سولہ جماعتیں تو لازمی ہیں۔ بھلے کلکٹر بنے نہ بنے۔ بس سولہ جماعتیں ضرور پڑھ لے۔

بے بے کی طرف سے بے فکر ہو کر میں پڑھائی میں جت گئی تھی۔

ملکہ نے ایف۔ ایس سی میں بورڈ میں پوزیشن لے لی۔ اخبار میں تصویر بھی چھپ گئی اور انٹرویو بھی لگا۔ اور وہ ڈاکٹری پڑھنے کے لیے دوسرے شہر چلی گئی۔

میں اب سیکنڈ ایر میں تھی۔ اور تھوڑی سمجھ دار بھی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا مضمون میتھس رکھا۔ میں نے پروفیسر بننا تھا۔

ملکہ لاہور جانے سے پہلے مجھے ملنے آئی تھی وہ بہت ہی اداس تھی۔

"کتنا اچھا ہوتا اگر تم بھی میڈیکل میں آتیں تو اگلے سال ہم پھر اکٹھے ہو جاتے۔"

"مجھے ڈاکٹر بننا بالکل پسند نہیں ہے۔"

وہ میرے لیے بڑی فکر مند بھی تھی۔ "اپنا بہت خیال رکھنا۔ یہ جو سہیلیاں ہوتی ہیں نا۔ ان کی ہر بات پر مت یقین کرنا۔ دراصل آج کل کے دور میں کوئی بھی آپ کا مخلص دوست نہیں ہوتا۔ جس کو آپ اپنا بہت اچھا بہت گہرا دوست سمجھتے ہو' وہ بھی اندر سے آپ کا ہمدرد نہیں ہوتا۔ اپنے مفاد کے لیے وہ آپ کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"

"ویسے میں بھی تو تمہاری سہیلی ہوں کیا تم سمجھتی ہو کہ میں بھی ایسی ہوں اپنا فائدہ اور اپنا مطلب؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو حاجرہ!" اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ "تم صرف میری سہیلی تو نہیں ہو میری پھوپھی کی بیٹی بھی تو ہو۔ میری پیاری بہن ہو تم۔ میری

اپنی۔"

لیکن یہاں اس کا فلسفہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ بھی اور شاید میں بھی نہیں جانتی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب۔

پھر وہ چلی گئی۔ کالج میں کچھ دن میرا جی بڑا گھبرایا۔ کئی دن ڈری ڈری سی رہی پھر مگن ہو گئی۔ ملکہ نے بہت سی باتیں صحیح کہی تھیں۔ مونا علی حیدر مجھ سے بہت جلتی تھی اور ٹیچرز کے سامنے میرا امیج خراب کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

ایک بار تو اس نے مسز سعید کے حوالے سے ایک ایسی بات پھیلا دی کہ مسز سعید نے بھری کلاس میں میری بے عزتی کر دی۔ میں نے لاکھ قسمیں کھائیں کہ میں نے ایسی بات کسی سے نہیں کی۔ اور میرے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا لیکن مسز سعید نے میری بات کا یقین ہی نہیں کیا اور پھر آخری دن تک انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔ مجھے مونا پر بہت غصہ تھا۔ اس لیے کہ مسز سعید میری فیورٹ تھیں اور میں تو ان کے مضمون میں جان توڑ محنت کرتی تھی اور مونا حیدر!

پھر میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا۔ اور ایسا بدلہ لیا کہ پرنسپل تو اسے کالج سے ہی نکالنے والی تھیں۔ پر اس کی ماں نے ان کے پیر پکڑ لیے کہ اس کا سال ضائع چلا جائے گا۔

بس میں نے اتنا کیا تھا کہ جب اسٹاف روم میں کاپیاں رکھی گئیں تو اس کی کاپی میں ایک خط رکھ دیا تھا۔ اس کی رائٹنگ بہت گندی تھی۔ اس کی رائٹنگ کی تین دن تک میں نے پریکٹس کی تھی۔ جبکہ میری رائٹنگ بے انتہا خوبصورت تھی۔ اتنی کہ اپنی کلاس کے چارٹ وغیرہ میں ہی بناتی تھی۔ اس کی رائٹنگ کی نقل کرنا ایسا مشکل نہ تھا۔ وہ خط میں نے اسی کی کاپی سے صفحہ پھاڑ کر لکھا تھا۔ خط کسی سہیلی کی طرف سے لکھا تھا۔ جس میں مس فریدہ اور مس ملک کے متعلق گوہر افشانیاں کی تھیں اور تھوڑا بہت مسز سعید پر بھی تنقید کی تھی۔ کہ مس فریدہ تو خود کو قلوپطرہ سمجھتی ہیں حالانکہ مس ملک تو جب سرخ آئی شیڈ لگا کر آتی ہیں تو بالکل بل بتوڑی لگتی ہیں۔ اور اونچی ہیل کی جوتی پہن کر ایسے چلتی ہیں جیسے مرغی چلتی ہے۔

سارے خط میں ایسی ہی گوہر افشانیاں تھیں اس روز تو اسٹاف روم میں بھونچال آ گیا تھا۔ پہلے مونا کو اسٹاف روم میں بلایا گیا پھر ہر پیریڈ میں ہر ٹیچر نے اس کی بے عزتی کی اور میں منہ نیچے کیے ہنستی رہی۔ اس کا رونا اس کی قسمیں ایسی ہی بے اعتبار ٹھہری تھیں جیسی مسز سعید کے سامنے میری۔

اور پھر مس ملک غصے میں وہ خط میڈم کے پاس لے گئی تھیں۔

گھر آ کر بھی میں نے خود کو بڑی شاباشی دی۔

اس واقعے کے بعد مجھے پتا چل گیا تھا کہ میرے اندر کہیں کوئی مکار اور کینہ پرور حاجرہ بھی چھپی ہوئی ہے۔ اور میں کسی سے اپنا بدلہ لے سکتی ہوں۔

خیر میں نے بھی ملکہ کی طرح ٹاپ کیا تھا۔ بے بے نے اس روز پورے محلے میں جلیبیاں بانٹی تھیں اور جب دیکھا تھا کہ کالج والوں نے مجھے کوئی سونے وونے کا تمغہ نہیں دیا تو دبے لفظوں میں ابا سے کہا تھا۔

"منیر حسین! لڑکی کا بیاہ کب تک کرے گا۔ پڑھ پڑھ کر بوڑھی نہ ہو جائے۔"

"بس بے بے! آپ نے کہا تھا کہ سولہ جماعتیں پڑھے گی تو بس سولہ جماعتیں پڑھ لے تو پڑھی لکھی لڑکیوں کے رشتے بھی اچھے آ جاتے ہیں۔"

لیکن اگر ابا میرے لیے رشتہ ڈھونڈ بھی لیتا تو اب میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیتی آخر میں نے مونا حیدر جیسی لڑکی کو کالج سے بھگا دیا تھا۔ اس نے بورڈ میں تو کوئی پوزیشن نہ لی تھی لیکن کالج میں تھرڈ آئی تھی لیکن اب چونکہ کسی ٹیچر کی نظر میں اس کی عزت نہیں رہی تھی اس لیے وہ کالج چھوڑ کر کسی اور کالج میں چلی گئی تھی۔ اور مجھے یہ مان دے گئی تھی کہ میں اپنے رستے میں آنے والوں کو ہٹا سکتی ہوں۔ اپنی اس خوبی کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ملکہ لاہور سے میرے لیے بہت سارے گفٹ لائی

تھی۔ اسے میرے ٹاپ کرنے کی بہت خوشی تھی۔ کالج کی کئی باتیں بتائیں مگر موٹا حیدر والی بات گول کر گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ جان جائے گی کہ وہ خط میں نے ہی لکھا تھا۔

بی۔ اے میں ایک نئی لڑکی روبی میری دوست بن گئی تھی۔ یہ بہت فیشن ایبل تھی۔ اور بہت ہی آزاد گھرانے سے تعلق تھا اس کا۔ ہم دونوں جب فارغ ہو کر بیٹھتے تو وہ مجھے اپنے کزنز کے قصے سناتی۔

"ہائے حاجرہ! تمہیں کیا بتاؤں۔ اشعر تو مجھ پر جان دیتا ہے۔ کہتا ہے تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میری محبت میں پاگل ہوا پھر رہا ہے۔"

اور میں حیرت سے اسے دیکھتی۔ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔ معمولی سی نقش و نگار والی عام سی لڑکی، سینکڑوں لڑکیوں میں کھڑی ہو تو دکھتی نہیں تھی الگ سے۔ پھر بھی۔

"تو بتا کیا تجھ پر؟"

"نہیں میرا تو کوئی کزن نہیں ہے۔" میں اندر ہی اندر شرمسار ہو جاتی۔ "بس صرف ایک کزن ہے جو ڈاکٹر بن رہی ہے۔"

"ہائے یہ کزن ملکہ کے بجائے مالک ہوتی تو۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"اچھا اور کسی نے بھی کوئی تحفہ نہیں دیا تجھے۔ تیرے اڑوس پڑوس میں تو کوئی شہزادہ ہوگا نا؟"

"اڑوس پڑوس۔" میں سوچنے لگی تھی۔

"کسی نے کوئی رقعہ کوئی خط؟"

"نہ۔"

میں نے سر نفی میں ہلایا تھا اور اندر ہی اندر جیسے بڑی کمتر ہو گئی تھی۔ اڑوس پڑوس میں لڑکے ہوں گے تو سہی چاہے شہزادے چاہے مراسی، پر میں نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن دکھ تو یہ تھا کہ مجھ پر بھی کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔

"ہائے تو کتنی نکمی ہے حاجرہ! دھیان دلوانا پڑتا ہے خود کوشش کر کے۔ اب مجھے ہی دیکھ لے کوئی شہزادی نہیں ہوں لیکن محلے کے آدھے سے زیادہ لڑکے مجھ پر مرتے ہیں، لیکن میں گھاس نہیں ڈالتی کسی کو۔ سب کے رقعے پرزے پاؤں تلے روند کر چلی جاتی ہوں۔ میں تو بس اشعر۔"

اس نے فخر سے گردن اکڑائی تھی اور اس لمحے سچ مچ مجھے خود پر ترس آیا تھا واقعی میں بڑی نکمی تھی۔ بقول روبی کے صرف کتابی کیڑا۔

"زندگی صرف کتابوں کے ساتھ نہیں گزرتی میری جان! ایک ساتھی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چاہنے والا جان فدا کرنے والا، اس لیے کبھی کبھی کتابوں سے ہٹ کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیا کر۔"

مجھے اس کی بات سولہ آنے سچ لگی تھی۔ جیسے ابا ہیں اماں کی خاطر گھر بار ڈھور ڈنگر مال سب چھوڑ دیا تھا۔

"مجھے پڑھنے کا شوق تو اپنی کزن کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ ملکہ۔ نام ہے اس کا۔ اسی کالج سے ایف ایس سی کیا تھا اس نے۔"

"وہ جو ڈاکٹر بن رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"تمہاری وہ کزن پھینی سی چندھی آنکھوں والی۔ میں ایک بار اپنی کزن کے ساتھ آئی تھی کالج تو دیکھا تھا۔ ملکہ ہی نام تھا اس کا۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"تو ایسی لڑکیوں کے پاس تو اور کوئی چوائس نہیں ہوتی نا سوائے پڑھنے کے، لیکن تم۔" اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

"تم تو بھئی اچھی خاصی ہو۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ اگر تم اپنے لمبے بال کھلے چھوڑ دو۔ سچی کتنے ہی دل تو ان ناگنوں میں الجھ جائیں۔"

وہ ایسی ہی تھی اور ایسی ہی کھلی ڈلی باتیں کرتی تھی اور میں اس کی ہر بات پر ایمان لے آئی تھی۔ پھر بھی میں نے بال تو نہیں کھولے، ہاں مسکارا لگانے لگی تھی۔ کبھی ہلکی سی لپ اسٹک بھی رگڑ لیتی ہونٹوں پہ۔ کبھی کبھی لپ اسٹک انگلی پر لگا کر گالوں پر بھی پھیر دیتی تھی۔ دراصل میں کوشش کرنے لگی تھی کہ دکھنے لگوں اور اس کوشش میں نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ محلے میں قدم رکھتے ادھر ادھر دیکھتی کہ شاید کسی کو دکھ جاؤں، پر ہمارے محلے کے شریف لڑکے آس پاس سے نظریں جھکا کر گزر جاتے تھے۔ پڑھائی کی طرف سے میرا دھیان ہٹ سا گیا تھا اور روبی سے باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ اس کی طرف آنے والے اشعر کے خط پڑھ کر دل میں گدگدی سی ہونے لگتی تھی۔

میرے اندر جیسے کوئی حسرت آکر بیٹھ جاتی اور کُرلانے لگتی۔ دراصل میں فطرتاً ہی جلنے والی تھی اور روبی سے جل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس روز کالج سے آدھی چھٹی لے کر میں روبی کے گھر گئی تھی۔ روبی نے کہا تھا وہ مجھے اشعر سے ملوائے گی۔ اس کی تصویر اور خط تو وہ کتاب میں اور فائل میں چھپا کر لے آتی تھی، پر پورے کا پورا اشعر تو نہیں لا سکتی تھی اور اشعر کالج کے باہر بھی نہیں کھڑا ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی بہن بھی تو اسی کالج میں پڑھتی تھی۔ سو اس روز میں اس کے ساتھ گھر گئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ آج اشعر آئے گا، پر اشعر تو نہیں آیا تھا اس کا بھائی اطہر آگیا تھا۔ میں اس وقت دروازے کی طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی اور روبی میری چوٹی کے بل کھول رہی تھی۔

"یار! آج تیرے ان لمبے بالوں کو کھلا دیکھوں گی اور تجھ سے ان کی لمبائی کا راز بھی پوچھوں گی؟"

اس نے بال کھول دیے تھے۔ وہ گھٹنوں سے نیچے تک آتے میرے بالوں کی تعریف کیے جا رہی تھی، جب اطہر اندر آیا تھا اور پھر انہونی ہو گئی تھی۔ اطہر تو ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"اتنے حسین بال۔" اور میں نے جلدی سے بیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

"یہ میرا بھائی ہے اطہر۔"

روبی نے تعارف کروایا تھا اور میرا دل جیسے دگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"اچھا بھائی اب جائیں۔" اس نے اس طرح دیکھا تھا جیسے مزید دیکھنے کی حسرت ہو۔ تو انہونی یہ ہوئی تھی کہ بقول روبی اس کے بھائی کا دل میری زلفوں میں ہی اٹکا رہ گیا تھا۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔"

میں نے کمزور سی آواز میں کہا تھا۔

"کیوں ممکن نہیں میری جان۔ تو نے نہیں سنا عشق اندھا ہوتا ہے۔ اور دل کا کیا ہے وہ تو گدھی پر بھی آجاتا ہے۔"

مجھے اس کا گدھی والا محاورہ پسند نہیں آیا تھا، لیکن میں نے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اسے مکا مارا تھا۔

"بکومت۔"

"بک نہیں رہی ہوں۔" اس نے فائل کے کور سے خط نکال کر مجھے دیا تھا۔ خط کیا تھا۔ پڑھ کر میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ اتنی تعریفیں۔ اتنے خوب صورت لفظ کہ میں تو دل و جان سے اطہر پر فدا ہو گئی۔ اطہر تو بڑا خوب صورت ہینڈسم لڑکا تھا اور بے بے تے میرے لیے کیا چنا تھا وہ پانچ بچوں کا باپ روبی ہر دوسرے تیسرے روز اس کا خط لاتی اور میں پندرہ پندرہ بار اس کا خط پڑھتی پھر بھی سیر نہ ہوتی۔ روبی تقاضا کرتی جواب کا تو میری ہمت نہ ہوتی لکھنے کی۔

"ہائے کیا لکھوں روبی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔" میرے پاس ایسے خوب صورت الفاظ نہ تھے اور شعر تو مجھے بالکل نہیں آتے تھے اور اطہر کے خط تو شعروں سے بھرے ہوتے تھے۔ روبی کے گھر دو تین ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پردھکی چھپی سی۔ گھر میں روبی کی اماں بھی تھیں تو بس۔ اب اطہر کی ضد تھی کہ کہیں تنہائی میں ملاقات کریں۔ دل تو میرا بھی تڑپتا تھا تنہائی میں ملنے کو، پر مجھے ڈر بھی لگتا تھا۔ فلاں جگہ آجاؤ۔ وہ لکھتا۔ اچھا وہ جو باغ ہے پرانا، اس میں ملتے ہیں۔ میں ڈرتی رہی اور پھر انہونی ہو گئی۔ اللہ نے بچانا تھا نا مجھے۔ میں روبی کو ڈھونڈتی ہوئی کالج کینٹین کی طرف آئی تھی کہ کینٹین کے پیچھے وہ بینچ پر بیٹھی کسی

سے باتیں کر رہی تھی۔ شاید اس کی سہیلی تھی کوئی۔

"سنو! تم نے اطہر بھائی کی شادی پر ضرور آنا ہے۔ بارات لاہور جائے گی۔"

اور میرے اندر دھڑام سے کچھ گرا تھا۔ میں نے کانوں کو مسلا۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں سنا۔ ابھی کل ہی تو روبی نے مجھے خط دیا تھا اور اطہر نے لکھا تھا۔

"ایک بار تو ملو جانم تاکہ مل بیٹھ کر شادی کا پلان بنا لیں۔ اکلوتا ہوں امی ابو جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔" اور میں روبی کو اسی لیے تو ڈھونڈ رہی تھی کہ اسے بتا سکوں کہ میں شام میں کوئی بہانہ کر کے پرانے باغ میں آجاؤں گی، لیکن یہ کیا ہوا تھا۔ روبی کہہ رہی تھی۔

"یار میرا اکلوتا بھائی ہے نا تو دھوم دھام سے شادی کریں گے۔"

"لیکن تمہاری کزن وہ کیا نام تھا اس کا "مونا حیدر" ۔۔۔ وہ تو ابھی پڑھ رہی ہے نا۔"

"ہاں تو شادی کے بعد بھی پڑھتی رہے گی۔۔۔ در اصل اس کی اماں سخت بیمار ہیں نا تو اس لیے جلدی کرنا پڑ رہی ہے۔"

اور اگر میں دیوار سے ٹیک نہ لگا لیتی تو گر جاتی۔ ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مونا علی حیدر نے اس طرح مجھ سے بدلہ لینا چاہا تھا مجھے بدنام کر کے۔۔۔ ضرور پرانے باغ میں کہیں کوئی جال بچھایا جانا تھا میرے لیے۔ تو یہ تھی تمہاری اوقات حاجرہ منیر حسین! تف ہے تم پر۔

نام "ذہین" "ٹیلی جنٹ"۔ کتنی چالاکی سے تم نے مونا سے بدلہ لیا تھا ایسا کہ اس کا پتا ہی کٹ گیا۔ تمہیں تو خود پر بہت ناز تھا، لیکن لوگ تم سے بھی زیادہ "سمارٹ" ہیں۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے واپس مڑی تھی اور چپ چاپ آکر کلاس روم میں بیٹھ گئی تھی۔ آج فزکس کی ٹیچر نہیں آئی تھیں۔ اس لیے کلاس روم میں صرف چند ایک پڑھاکو ٹائپ لڑکیاں کتابیں اور نوٹ بک کھولے بیٹھی تھیں۔ باقی کہیں کینٹین میں، کہیں لان میں دھرنا جمائے بیٹھی ہوں گی۔ میں نے بھی فزکس کی بک نکال کر کھول لی تھی لیکن لفظ میرے آگے بھاگ رہے تھے۔ تب ہی ایک لڑکی اپنی فائل اٹھائے میرے پاس آئی۔

"سنو حاجرہ! یہ نیومیریکل تو سمجھا دو۔"

"ہاں بتاؤ کون سا ہے؟"

اور پھر باوجود کوشش کے میں وہ نیومیریکل حل نہ کر سکی۔

"سوری! یہ میڈم نے کب سمجھایا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"کل۔۔۔ کیا تم نہیں آئی تھیں۔ یا پھر کلاس میں نہیں تھیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ آج کل تم کلاسیں بہت بنک کرنے لگی ہو۔"

وہ چلی گئی تھی واپس اپنی سیٹ پر اور میں سوچ رہی تھی۔ کل بھی تو میں کلاس میں ہی تھی لیکن میں نے میڈم کا لیکچر کب سنا تھا۔ میں تو فائل کے اندر اطہر کا خط رکھے سارا وقت وہ پڑھتی رہی تھی۔ یہ کتنا بڑا نقصان کر لیا تھا میں نے اور جو شاید کبھی پورا نہیں ہونا تھا۔ اور ملکہ ہر خط میں لکھتی تھی۔ "سنو حاجرہ! اس بار بھی ٹاپ کرنا ہے مجھے تم پر فخر ہے۔"

میں رونا چاہتی تھی دھاڑیں مار مار کر چیخ چیخ کر، لیکن میں یہاں کلاس روم میں بیٹھ کر اپنی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ سو میرے آنسو میرے اندر گر رہے تھے۔ میں نے صرف دھوکا نہیں کھایا تھا۔ میں نے اپنی محبت بھی کھوئی تھی۔ وہ بے شک دھوکا تھا، لیکن میں تو فریبی نہیں تھی اور میں نے تو اطہر سے محبت کی تھی۔ میرے اندر محبت کا ماتم جاری تھا اور میں سر جھکائے فائل پر آڑھی ترچھی لکیریں لگا رہی تھی کہ روبی کلاس روم میں آئی۔

"اللہ۔۔۔ حجو تم یہاں بیٹھی ہو بور لڑکی! آج پھر تمہیں کتابی کیڑا بننے کا شوق چرایا ہے۔"

"ہاں بس ایسے ہی۔" میں نے نگاہیں نہیں اٹھائیں۔ مبادا وہ میری آنکھوں میں غم، دکھ، بے بسی اور نفرت کی تحریر نہ پڑھ لے۔

"سنو۔۔۔" وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر سرگوشیاں

کرنے لگی۔

"اطہر بہت بے چین ہو رہا ہے تم سے ملنے کے لیے۔ تمہیں دیکھنے کے لیے۔۔۔ میرے بے چارے بھائی کو مت ترساؤ۔ جو تمہاری ان حسین زلفوں کا قیدی بن گیا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

"تو کیا کروں تمہارے اس بے چارے بھائی کے لیے؟"

"آج مل لو اس سے۔"

"چلو مل لیتے ہیں تم بھی کیا یاد کرو گی، کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔" میں نے زبردستی لہجے کو بشاش بنایا تھا۔

"اللہ۔۔۔ تم کتنی کیوٹ ہو حاجرہ۔"

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر میرے رخسار کو چوم لیا۔ میں نے بے اختیار دائیں ہاتھ سے اپنے رخسار کو صاف کیا۔ میری تو اماں اور بے بے نے بھی کبھی اس طرح پیار نہیں کیا تھا۔ میں کچھ جھینپ گئی تھی اور وہ ہنس رہی تھی۔ خوشی اس کے پورے وجود سے ٹپک رہی تھی یوں جیسے میں نہیں وہ اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔

"تو کب۔۔۔؟ کیا بتاؤں کب آؤ گی؟"

"تین بجے۔ تین بجے آؤں گی اماں کو تمہارے گھر کا بتا کر۔"

میں اور کچھ نہیں کر سکتی تھی مگر کم از کم وہ وہاں میرے انتظار میں سڑتا تو رہے گا چند گھنٹے۔

اس تصور سے میرے دل کی جلتی بھنتی زمین پر بارش کے چند چھینٹے پڑ گئے تھے اور گھر آکر میں نے اس خیال سے خود کو محظوظ کرنا چاہا تھا کہ وہ پرانے باغ میں کسی الو کی طرح میرے انتظار میں بیٹھا باغ کے پھول پتے گن رہا ہو گا کیونکہ دن کے تین بجے وہ ستارے گننے سے تو رہا، لیکن میں محظوظ نہیں ہو سکی تھی۔ الٹا میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

یہ نوعمری کا پہلا پہلا عشق۔ کیسے کچوکے لگاتا ہے۔

برسوں میرا اندر اس زہر سے نیلا ہوتا رہا۔ میں اگر کلاس روم میں نہیں رو سکتی تھی تو گھر میں بھی دھاڑیں مار مار کر نہیں رو سکتی تھی۔ اس لیے چپکے چپکے روتی رہی۔ تکیہ کبھی منہ پر رکھ لیتی، کبھی منہ تکیے پر اوندھا لیتی۔

✡ ✡ ✡

ابا کام سے واپس آیا تو بے بے نے چائے کے لیے آواز دی۔ چھ بج رہے تھے۔ گرمیوں کے لمبے دن تھے ابا چھ بجے تک آجاتا تھا۔ پتا نہیں وہ اب تک باغ میں بیٹھا ہو گا یا واپس چلا گیا ہو گا۔ میں نے باہر آکر حمام کے پاس بیٹھ کر خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور بے بے کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ابا موڑھے پر سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے بے بے کے حکم کا منتظر ہو۔

"بے بے! سر میں بہت درد ہے۔"

میں نے آنکھیں موند لی تھیں کہ کہیں وہ ان آنکھوں کی سرخی نہ دیکھ لے۔

"مت ماری گئی ہے اس کڑی کی پڑھ پڑھ کے میں کہتی ہوں منیر حسین! اتنا پڑھ کر کیا کرے گی؟" اور اس سے پہلے کہ بے بے پھر سے کوئی رشتہ ڈھونڈنے کی فرمائش کرتی میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بے بے! میں کالج میں پڑھاؤں گی لیکچرار بنوں گی۔"

ابا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"میری بیٹی ضرور لیکچرار بنے گی۔" ابا کے لہجے کے یقین نے میرے دل پر جیسے پھاہے رکھے تھے۔

"ایک ڈاکٹر بنا رہا ہے بیٹی کو، دوسرا استاد۔ تم سالے بہنوئی نے وِیاہ نہیں کرنے اپنی بیٹیوں کے۔"

"شادی بھی اپنے وقت پر ہو جائے گی بے بے! آپ دعا کیا کریں۔ نصیب اچھا ہو۔ پہلے کی طرح جلد بازی نہیں کرنی ہم نے۔"

اماں چائے لے کر آگئی تھیں۔ یوں تو ساس بہو میں بہت پیار تھا، لیکن اماں بھی انہیں "مسیاں چنوں" والے رشتے کو یاد دلانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں

دیتی تھیں اور یہ واحد بات تھی جس پر بے بے کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

"چل ادھر رکھ سر میں دبا دوں۔"

بے بے نے جیسے اماں کی بات سنی ہی نہ تھی اور میں پھر بے بے کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"چائے تو پی لے۔"

اماں نے کہا تھا' لیکن میں آنکھیں موندے بے بے کی گود میں سر رکھے بے بے سے دبواتی رہی اور جب چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تو ایک ہی گھونٹ میں پی کر اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر اطہر کے متعلق سوچنے لگی۔

اب تک تو ضرور گھر چلا گیا ہو گا۔ بہت غصہ آیا ہو گا اسے اور روبی بھی ضرور غصہ کرے گی۔ ناراض ہو گی تو ہوا کرے۔ میں رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔ یہ زخم اتنی جلدی بھرنے والا تو نہیں تھا۔ صبح میں روبی کی متوقع ناراضی کے متعلق سوچتی ہوئی ہی کالج گئی تھی اور وہ مجھے منہ پھلائے کالج کے لان میں ہی مل گئی۔

"کیا موت آ گئی تھی تجھے کہ آئی نہیں؟"

"بس نہیں آسکی سوری۔"

"پتا ہے اس نے کتنا انتظار کیا تمہارا پورے دو گھنٹے۔" اس نے لہجے کو نرم بنانے کی کوشش کی تھی۔

"صرف دو گھنٹے۔" میں کراہی۔

"محبت کرنے والے صدیوں انتظار کرتے ہیں۔ وہ صرف دو گھنٹے میں ہی تھک گیا روبی!"

"کمال کرتی ہو حاجرہ! اور کتنا انتظار کرتا پانچ بجے کے بعد تو نہیں آنا تھا نا تم نے۔ کیا رات بھر وہاں بیٹھا رہتا۔"

"مجھے ایسے بودے عاشق کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اپنے اوپر چڑھایا تصنع کا لبادہ اتار پھینکا۔

"یہ رہے اس کے محبت نامے۔" میں نے ایک کم بیس محبت ناموں کا پلندہ اس کی طرف بڑھایا۔ اب پتا نہیں میرا ہاتھ لرزا تھا یا کیا کہ پلندہ نیچے گر گیا اور اسے جھک کر اٹھاتے ہوئے الگ ہو جانے والے خط پر میری نظر پڑی۔

"جانِ من حاجرہ منیر حسین!"

اور میرے اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ بھلا اتنا لمبا چوڑا نام لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پر تب تو میں خط کے مضمون میں ایسی گم ہو جاتی تھی کہ القاب پر کبھی نظر نہیں پڑی تھی۔ محبت کرنے والے تو چھوٹے چھوٹے منے منے القاب لکھتے ہیں جیسے وہ زبان سے کہتا تھا۔

حجو۔۔ حاجی۔۔ حجری۔۔ حجی۔۔

روبی نے ہاتھ بڑھایا تھا اور میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

کیسی بے وقوفی کرنے لگی تھی میں۔ کل کو یہ خط میری بدنامی کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ بھلے میں نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن ان خطوط میں جن کی پیشانی پر جانِ من حاجرہ منیر حسین صاف صاف لکھا تھا کہ کسی شک و شبہے کی گنجائش نہ رہے اور خط کے مضامین تو اور بھی کہانیاں سناتے تھے۔ ملاقات کی اور۔۔ اور

"نہیں۔"

میں کراہی تھی' میں اگر آئینہ دیکھ سکتی تو مجھے یقین ہے اتنی کمینی اور اتنی گھٹیا مسکراہٹ زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھتی۔

"یہ تو میں اپنے پاس رکھوں گی تمہارے پیارے مسکین سے اطہر بھائی کی نشانی کے طور پر۔" روبی ہکا بکا منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

"یہ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو حاجرہ!" بمشکل تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"میں تو ایسی ہی باتیں کرتی ہوں سوئٹی! اور ہاں بھائی کی شادی مبارک ہو۔ موٹا حیدر کو بھی میری طرف سے مبارک دینا۔ آخر میری کلاس فیلو تھی وہ پرانی۔" مجھے یقین ہے میری مسکراہٹ میں جو کمینہ پن تھا' وہ اس نے بھی تاڑ لیا ہو گا۔ تب ہی تو وہ چپ کھڑی تھی۔

"تو۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اب یہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں سے غائب ہوگئی تھی، لیکن سارا کمینہ پن میری آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

"ہاں اپنے پیارے اور مسکین اطہر بھائی کو کہہ دینا اور اپنی اس راج دلاری بھابی کو بھی کہ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں۔ بہتر ہوگا کہ آج کے بعد اپنے ذہن سے مجھے کھرچ دیں۔۔۔ ورنہ۔۔۔" میں نے بالکل ڈرامائی انداز میں توقف کیا تھا۔

"ورنہ یہ خط میں مونا بی بی کے والد صاحب کے پاس لے جاؤں گی کہ یہ ہے آپ کا دلارا داماد جو لڑکیوں کو ایسے عشقیہ خطوط لکھتا ہے اور آپ اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی اس جیسے آوارہ کے حوالے کرکے برباد نہ کریں اور مجھے یقین ہے کہ۔۔۔"

میں پھر ڈرامائی انداز میں چپ کر گئی تھی۔ میری نظریں پیلی پڑتی ربی پر تھیں۔ مونا کے والد بہت مذہبی اور بہت سخت قسم کے تھے اور یہ بات مونا کی امی نے اس وقت پرنسپل کو بتائی تھی جب پرنسپل نے اسے بلایا تھا۔ وہ اگر اس معمولی بات پر اتنا ڈر رہی تھی تو یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے محض تکا لگایا تھا جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ ربی ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی۔

"پلیز حاجرہ! تم ایسا کچھ مت کرنا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔ مونا میرے بھائی کی بچپن کی منگیتر ہے۔ بھائی اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور خالو وہ تو۔۔۔ وہ تو بہت سخت ہیں۔ اخلاقی اقدار کو بہت اہمیت دینے والے وہ۔"

"اچھا لیکن کل تک تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارا بھائی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اپنا بنانے کے لیے مرا جا رہا ہے؟"

"پلیز! جھوٹ تھا وہ سب، بکواس کی تھی میں نے۔" اب وہ رو رہی تھی۔

"وہ تو تم نے مونا کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اور مونا نے مجھے اور بھائی کو بتایا تھا۔"

"میں نے مونا کے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا بلکہ مونا نے مجھے ٹیچرز کی نظروں سے گرانے کے لیے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کا نتیجہ تھا۔ بعض اوقات آدمی اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں گر جاتا ہے۔" میں ایسی بات کا اعتراف کیوں کرتی جسے میرے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا تھا میں نے تمسخر سے اسے دیکھا۔

"تمہارا ڈراما فلاپ ہوگیا ہے۔ اب دوبارہ ایسا ڈراما کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" اسے وہیں چھوڑ کر میں کلاس روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ خود کو میں نے بہت شاباش دی تھی کیا غضب کی اداکاری تھی میری یعنی میں حاجرہ منیر حسین ایک اداکارہ بھی بن سکتی ہوں۔

اس روز میں گھر آکر خوب ہنسی تھی۔ اتنا کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور پھر یہ آنسو کتنی ہی دیر تک بہتے رہے تھے بلکہ کتنے دنوں تک۔۔۔ کتاب سامنے رکھتی تو لفظ دھندلا جاتے اور آنکھیں پانیوں سے بھر جاتیں۔ کیا تھا جو۔۔۔ جو ان خطوط میں لکھا گیا تھا سچ ہوتا۔۔۔ خط جلاتے ہوئے میں نے کوئی ایک سو دس بار سوچا تھا اور ملکہ کتنا صحیح کہتی تھی کہ آج کل کے دور میں کوئی بھی تمہارا مخلص دوست نہیں بن سکتا۔ اپنے فائدے کے لیے وہ تمہیں گڑھے میں دھکا دے دے گا اور اسے افسوس بھی نہیں ہوگا۔

میں نے سوچا تھا یہ واقعہ میری پوری زندگی کے لیے ایک سبق ہوگا۔ لیکن یہ سبق سیکھنے میں میری کتنی توانائیاں خرچ ہوگئی تھیں یہ صرف میں ہی جانتی تھی۔ میری کلاس میں پہلے بھی کم ہی سہیلیاں تھیں ۔ اب تو میں نے کسی سے بھی بات کرنا چھوڑ دیا تھا اور بظاہر میں کتابی کیڑا بن گئی تھی۔ لیکن کیا میں واقعی کتابی کیڑا تھی۔ کھلی ہوئی کتاب کے لفظ تو محبت بھرے لفظوں میں ڈھل جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں ٹاپ نہیں کر سکی تھی۔ میرے نمبر اچھے تھے میں اپنی کلاس بلکہ اپنے کالج میں تو فرسٹ ہی تھی، لیکن ٹاپ۔۔۔ ہائے ملکہ کو کتنا افسوس ہوگا میں نے رزلٹ دیکھ کر سوچا تھا۔

بلکہ مجھے تو پہلے سے پتا تھا کہ میرا رزلٹ ایسا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی کم نمبروں کی توقع تھی مجھے' لیکن ملکہ

اور ماما تو مجھ سے بہت امید لگائے ہوئے تھے۔ ملکہ آئی تھی پہلے کی طرح تحفوں سے لدی پھندی اور مٹھائی کے ساتھ۔ اسے دیکھ کر جانے کب کب کے چھپائے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"ارے جھلی نہ ہو تو۔" ماما نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"وہ ٹاپ۔" مجھے اپنے بہتے آنسوؤں کا کچھ تو جواز دینا تھا۔

"تو کیا ہوا اتنے اچھے نمبر ہیں۔" ماما اور ملکہ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ میرے بہتے آنسو رک گئے تھے۔

"وہ میں بیمار تھی۔ میرے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ پڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔ بس بغیر پڑھے ہی پیپر دے دیے تھے۔" میں نے سچ اور جھوٹ ملا کر بتاتے ہوئے اپنا چہرہ دوپٹے کے پلو سے پونچھا۔

"اب کیا ارادے ہیں۔" میرے سامنے بیٹھتے ہوئے ملکہ نے پوچھا تھا۔

"ظاہر ہے ماسٹر کروں گی فزکس یا کیمسٹری میں۔"

"ٹھیک ہے تم مجھے اپنے کاغذات دے دینا۔ میں وہاں جا کر اپلائی کر دوں گی۔"

✲ ✲ ✲

پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے۔ میں بے بے ۔۔۔ اور اماں کو روتا چھوڑ کر ماما کے ساتھ لاہور آگئی تھی۔ دو دن ملکہ میرے ساتھ یونیورسٹی آئی تھی اور ہاسٹل کے کمرے میں میرا سامان سیٹ کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"صرف سر درد کا مسئلہ تھا حجو (پیار سے وہ مجھے حجو ہی بلاتی تھی) یا کوئی اور بات بھی تھی۔"

اس کی ان زیرک نظروں سے مجھے خوف آتا تھا پتا نہیں اس کی چندھی آنکھوں میں کوئی ایکسرے مشین فٹ تھی کہ اندر تک دیکھ آتی تھیں۔

"نہیں تو بھلا کیا بات ہونی ہے بس ایسے ہی وہم ہوگیا تھا مجھے۔"

میں نے الماری میں اپنا سامان رکھ کر تالا لگایا تھا اور اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ میری روم میٹ باہر گئی ہوئی تھی۔

"کیسا وہم؟" ملکہ پریشان ہوگئی تھی۔

"وہ سر میں درد ہوتا تھا نا تو میں نے سمجھا سر میں کوئی رسولی۔۔۔" میرے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے تھے۔

"پاگل ہوگئی ہے۔" میں نے اس کے سارے زیرک پن کو شکست دے دی تھی اور وہ مجھے ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھری۔ وہ خود اب میڈیکل کے چوتھے سال میں تھی۔ کئی دن پریشان رہ کر ایک دن وہ ہنستی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔

"یار! کچھ نہیں ہے تمہیں۔ وہم تھا سب۔ سب ٹیسٹ کلیئر ہیں۔ تم نے سر پر سوار کر لیا تھا کہ تمہیں ٹاپ کرنا ہے۔ خیر اب آرام سے سکون سے پڑھو اور سر پر سوار مت کرنا کچھ۔"

اور میں پڑھائی میں جت گئی۔ میں نے کیمسٹری میں ایڈمیشن لیا تھا اور میری روم میٹ نے فزکس میں سو ہمارے درمیان زیادہ دوستی نہ ہو سکی تھی بس رسمی سا تعلق تھا وہ صرف سونے کے لیے کمرے میں آتی تھی مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ مجھے اب کسی کو دوست نہیں بنانا تھا۔

میں اب یونیورسٹی میں تھی۔ تیسرے فیز میں۔ پہلا اسکول تھا۔ دوسرا کالج اور اب یونیورسٹی۔ تینوں فیز میں میں ایک نئی دنیا سے روشناس ہوئی تھی۔ یہاں بہت اعلا تعلیم یافتہ استاد تھے اور مجھے ان سے پڑھ کر مزا آتا تھا میرے ڈپارٹمنٹ میں صرف سات لڑکیاں تھیں۔

لڑکے مہذب تھے۔ دور دور سے لڑکیوں کو دیکھتے تھے۔ نگاہیں جھکا کر بات کرتے تھے۔ پتا نہیں یہ صرف میرے ڈپارٹمنٹ کی بات تھی یا سب ہی ایسے تھے۔ عزت سے بات کرتے تھے۔ اندر اندر پسندیدگیاں بھی چلتی ہوں گی، لیکن میں تو بس اپنی پڑھائی میں ہی مگن تھی۔ مجھے اس بار ضرور ٹاپ کرنا تھا۔

ہولے ہولے میں پہلی محبت کا غم بھول گئی تھی۔

ملکہ کبھی کبھی دس پندرہ دن بعد مجھے ضرور ملنے آتی تھی حالانکہ اس کی پڑھائی بہت ٹف تھی اور اسے محنت بھی بہت کرنا پڑتی تھی، لیکن اسے میرا خیال رہتا تھا ہمیشہ۔ ایک دوبار وہ مجھے اپنے ہاسٹل بھی لے گئی تھی اور بڑے فخر سے متعارف کروایا تھا۔

"یہ میری کزن ہے۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا اس نے۔" وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی، لیکن پتا نہیں میں اس سے اتنی محبت کرتی تھی یا نہیں۔ اس کا جواب مجھے دو سال بعد ملا تھا۔

☆ ☆ ☆

نہیں میں اس سے اتنی کیا سرے سے محبت ہی نہیں کرتی تھی۔ وہ جو بچپن میں میرے اندر اس کے لیے جلاپا پیدا ہوا تھا، وہ اسی طرح میرے اندر کہیں تہہ میں سویا پڑا تھا۔ مرا نہیں تھا۔

میں اب یونیورسٹی میں دکھنے لگی تھی۔ اپنی شکل و صورت کی وجہ سے نہیں، وہ تو اب بھی ایسی ہی تھی معمولی سی لڑکیوں کے ہجوم میں الگ سے نہ دکھنے والی۔ سادہ سے شلوار قمیص پر بڑا سا سفید دوپٹا اوڑھے اور گھنے بالوں کی موٹی سی چٹیا بنائے اور پاؤں میں کالے بند جوتے پہننے والی۔

میں اپنی ظاہری صورت کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھی بلکہ اپنے رزلٹ کی وجہ سے۔ اپنے ان اسائنمنٹس کی وجہ سے، جن کی تعریف کلاس میں میرے اساتذہ کرتے تھے۔

اساتذہ کی ستائش بھری نظروں نے ہولے ہولے میرے زخم بھر دیے تھے اور میں اب سر اٹھا کر چلتی تھی اور اعتماد سے بات کرتی تھی۔

میرے فائنل ایگزام سے تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ملکہ آئی تھی۔

"چل آج موج میلہ کرتے ہیں۔" اس کے بھی فائنل ہفتے بھر بعد اسٹارٹ ہونے تھے جبکہ میرے پیپرز میں ابھی ڈیڑھ ماہ تھا۔ میں تیار ہوگئی۔ انار کلی سے چاٹ کھا کر اور بوتل پی کر ہم مال پر آئے اور مال پر ہمیں وہ ملا تھا۔

"یہ عبدالخالق ہے میرا کلاس فیلو۔"

اس کا نام تو تھوڑا دقیانوسی تھا، لیکن وہ خود بالکل بھی دقیانوسی نہیں تھا کیمل کلر کا کوٹ اور سیاہ ڈریسنگ پینٹ میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی چمک اور مقناطیسیت تھی۔ ہلکا سانولا رنگ۔ دلکش مسکراہٹ لیے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ ہیں آپ کی وہ لائق فائق کزن۔"

"ہاں۔" ملکہ کی آنکھوں میں میرے لیے فخر تھا۔

"اور یہ اب بھی ٹاپ کرے گی۔ ہیں نا۔"

"ہاں۔" میں نے صرف سر ہلایا تھا۔ میں جیسے مسحور سی ہوگئی تھی۔ پتا نہیں اس کی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کیا تھا یا اس کے قد اور دلکش مسکراہٹ نے اس کی سانولی رنگت میں بلا کی کشش تھی۔ ایک بار کسی نے کہا تھا کہ مرد تو بس سانولے رنگ کے ہی اچھے لگتے ہیں۔ مردوں کا رنگ اگر چٹا ہو تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔

اور آج وہاں مال پر کھڑے کھڑے میں نے سوچا تھا 'وہ بات جس نے بھی کہی تھی۔ بالکل سچ کہی تھی۔ میرا دل تو جیسے پھڑک کر اس کے قدموں میں گر گیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی نظریں جھکالی تھیں اور اپنے تئیں اس کے قدموں میں گرے اپنے دل کو اٹھا کر سنبھال لیا تھا۔ کہ کہاں میں منیر حسین ترکھان کی معمولی شکل والی بیٹی اور کہاں وہ جو دیکھنے میں ہی کسی اونچے خاندان کا لگتا تھا۔

اس روز اس نے اپنی گاڑی پر پہلے مجھے اور پھر شاید ملکہ کو اس کے اسپتال چھوڑا تھا۔ میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ لیکن میں دوسرے روز ہی ملکہ کے پاس جا کر اس پر اندر کا حال ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر بھی پانچویں دن میرے صبر کی حد ختم ہوگئی تھی۔ اور میں اس کے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ہاں خیریت ہے۔ میں نے سوچا دو چار دن بعد تم مصروف ہو جاؤ گی اور پھر چلی جاؤ گی تو مل آؤں۔"

"ہاں لیکن میں پھر آجاؤں گی جلدی ہاؤس جاب کے لیے ڈاکٹر آفندی نے کہا ہے کہ جلد ہاؤس جاب مل جائے گا۔"

"وہ لڑکا۔ وہی جو اس روز مال پر ملا تھا، وہ بھی تمہارے ساتھ پڑھتا ہے؟"

"ہاں بتایا تو تھا اس دن تمہارا دماغ کہاں تھا؟" ملکہ نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

"وہ ہاں خیال ہی نہیں رہا۔ کافی امیر آدمی لگتا ہے اس کے باپ نے کوئی مل وِل لگا رکھی ہوگی۔" میں نے بڑے لاپروا سے انداز میں کہا تھا لیکن ملکہ چونکی تھی۔

"پتا نہیں۔ میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ ویسے کیا تم صرف یہ معلوم کرنے کے لیے میرے پاس آئی ہو؟" اس کی چندھی آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں شرمندہ ہوگئی۔

"نہیں یار! بس یونہی آگئی تھی تمہیں ملنے اور وش کرنے گڈ لک۔"

"تھینک یو جاجرہ۔"

"میں اب چلتی ہوں۔"

مجھے پتا تھا یہ وقت اس کے لیے کتنا قیمتی ہے۔ اس نے بھی رکنے کا اصرار نہیں کیا تھا اور میں واپس ہاسٹل آگئی تھی۔ پھر میں نے شعوری کوشش سے اس کا خیال ذہن سے نکالا اور پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھی۔ پھر تقریباً ایک ماہ بعد ملکہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ عبدالخالق بھی تھا۔

"کیا آج بھی راستے میں مل گئے تھے آپ۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"نہیں۔" وہ ہنسا تھا۔

"آج ہم باقاعدہ پلان کر کے آئے ہیں۔ کالج سے اکٹھے۔ آپ کو وش کرنا تھا۔ آپ کے پیپر کب شروع ہو رہے ہیں؟"

"اگلے ہفتے۔"

"تو آج تھوڑی سی عیاشی کی جاسکتی ہے نا؟" اس نے ملکہ سے پوچھا تھا اور ملکہ نے مجھ سے میں نے سر ہلا دیا تھا۔ وہ میرے لیے الگ الگ وش کارڈ اور پھول لائے تھے۔

ان کے پیپرز ختم ہوگئے تھے اور ملکہ دو دن بعد واپس گھر جارہی تھی۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔

ملکہ کو ایک بار بھی میں نے عبدالخالق کی طرف دیکھتے نہیں پایا تھا۔ اس کے انداز میں بڑی بے نیازی تھی۔ ایسی بے نیازی جو اٹریکٹ کرتی تھی۔ اس نے جو گرز پہن رکھے تھے اور چھوٹے چھوٹے پھولوں والی مردانہ کالر والی شرٹ تھی اور لمبی آستینوں کے کف تھوڑے سے موڑ رکھے تھے اور اس کی بائیں کلائی پر پتلی چھوٹے ڈائل والی گھڑی میں جڑے ننھے سے نقلی ہیرے اور اس کا گولڈن ڈائل کبھی کبھی جب وہ بائیں ہاتھ سے ماتھے پر آجانے والے بال پیچھے کرتی تو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وہ جب ہنستی تو ہنستے ہوئے اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت بھی خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں آج پہلی بار اس کی کچھ خوبصورتیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔ اور چور نظروں سے عبدالخالق کو دیکھتی تھی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ وہ ایسا دور دراز جزیرہ ہے جس پر میں نے کبھی قدم نہیں رکھنا۔ اور یہ شاید آخری ملاقات ہے۔

اس کا ارادہ باہر جا کر اسپیشلائزیشن کرنے کا تھا۔ اور وہ ملکہ کو بھی قائل کر رہا تھا کہ اسے بھی ضرور اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانا چاہیے۔ ان کی باتوں میں مجھے دلچسپی نہ تھی لیکن میرے دل نے خواہش ضرور کی تھی کہ یہ باتیں ختم نہ ہوں اور وہ میرے سامنے بیٹھا رہے۔ مجھے ہاسٹل کے گیٹ پر ڈراپ کرتے ہوئے عبدالخالق نے کہا تھا۔

"حاجرہ جی ٹریٹ پکی ہے آپ کی طرف؟"

"کیسی ٹریٹ؟" میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"آپ کے ٹاپ کرنے کی۔"

محنت تو میں پہلے بھی بہت کر رہی تھی لیکن اب اور زیادہ کر رہی تھی۔

پھر میرے پیپرز ختم ہوگئے۔ ماما نے مجھے لینے آنا

تھا۔

میں اس روز پیکنگ کر رہی تھی کہ ایک لڑکی نے آکر بتایا۔

"آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ شاید گھر سے لینے آیا ہے۔"

ماما نے تو پرسوں آنا تھا۔ میں نے سوچتے ہوئے بیڈ پر پڑا۔ دوپٹا اٹھا کر سر پر جمالیا۔ میں کچھ دیر پہلے ہی باتھ لے کر نکلی تھی اور میرے گھٹنوں تک چھوتے لمبے اور گھنے بال کھلے تھے۔ تھوڑے گیلے تھوڑے خشک۔

"اللہ خیر کرے بے بے کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ میں دل میں آنے والے وسوسے کو جھٹکتی وزیٹنگ روم میں آئی تو وہاں عبدالخالق کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ "آپ؟"

"ہاں" وہ مسکرایا تھا۔

"کیسے ہوئے پیپرز؟"

"بہت اچھے۔" دل میں حیران ہوتی ہوئی میں بیٹھ گئی تھی۔

"یعنی ٹریٹ پکی" وہ ہنسا۔

"ہاں پکی۔"

"گڈ۔"

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ چلی نہ گئی ہوں۔"

"نہیں آج ہی تو آخری پیپر دیا ہے پھر اتنی تھکن ہے۔ کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ پیکنگ کرنی ہے۔ ماموں پرسوں لینے آئیں گے۔"

"ماموں یعنی ملکہ کے ابو۔"

میں نے سر ہلا دیا لیکن اس وقت مجھے اس کے منہ سے ملکہ کا نام سننا بہت ناگوار گزرا، پتا نہیں کیوں۔

"ذہانت مجھے اٹریکٹ کرتی ہے۔" وہ دھیمے دھیمے کہہ رہا تھا۔

"ظاہری خوبصورتی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اصل انسان کے اندر کا حسن ہوتا ہے۔ ظاہری حسن ادھر ادھر بہت بکھرا ہوا ہے لیکن اندر کا حسن کم کم نظر آتا ہے۔ ہمارے آس پاس ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے من میلے ہیں۔"

میرے اندر جیسے خوش گمانی کے پہاڑ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اور ملکہ ایسی ہی لڑکی ہے۔ ذہین، سادہ بے غرض، بے ریا۔"

اور سارے پہاڑ دھم سے گر گئے تھے اور میرا وجود جیسے ان کے نیچے دب کر چور چور ہو گیا تھا۔

"میں نے برسوں اسے پرکھا ہے۔ اس کے دل میں کبھی کھوٹ نہیں پایا۔ نہ لالچ، نہ ہوس اپنے آپ میں مگن، وہ ایسی اللہ لوک لڑکی ہے کہ اسے آج تک یہ خبر نہیں ہو سکی کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہوں اور مجھے اس کی یہ بے خبری بھی اٹریکٹ کرتی ہے۔"

میں پتا نہیں اپنی آنکھوں میں اترتی دھول چھپانے کے لیے جھکی تھی یا یہ کوئی شعوری حرکت تھی کہ جھکنے سے میرا دوپٹا ڈھلک گیا تھا اور میرے کھلے بال میرے شانوں پر اکٹھے ہو کر زمین کو چھونے لگے تھے۔ جب میں سیدھی ہوئی تھی تو میں نے اس کی آنکھوں میں ستائش دیکھی تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی اس نے نظریں ہٹالی تھیں۔

میں نے دوپٹا اچھی طرح لپیٹ کر خوامخواہ ہی وضاحت کی تھی۔

"وہ میں ابھی باتھ لے کر نکلی تھی۔ بال خشک نہیں ہوئے تھے تو آپ آگئے اور ایسے ہی بال باندھے بغیر چلی آئی۔"

وہ صرف مسکرا دیا تھا۔

"وہاں کالج میں ایسی لڑکیاں بھی تھیں، جو لڑکوں کو متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی تھیں لیکن ملکہ نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ حالانکہ کچھ لڑکے تو اس کے ارد گرد چکراتے رہتے تھے اس سے نوٹس لینے کے چکر میں۔ میں نے کبھی ملکہ سے کچھ نہیں کہا کہ میں اس کے متعلق کیا سوچتا ہوں۔"

"کاش! تم مجھ سے کبھی یہ نہ کہتے تو میں بہت آرام و سکون سے یہ سوچ کر خوش رہنے کی کوشش کرتی کہ ایسے لڑکے بھلا ہم جیسی لڑکیوں۔۔۔ لیکن اب تو اس نے مجھ جیسی ہی ایک لڑکی کو پسند کر لیا تھا اور یہ

تکلیف دہ بات تھی کہ وہ لڑکی میں نہیں تھی۔

"میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ میری آرزو اس تک پہنچا دیں۔ اسے اگر اعتراض نہ ہو تو میں اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجوں گا۔"

"نہیں۔" میرے حلق سے گھٹا گھٹا سا نکلا تھا۔

"وہ۔ وہ تو شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے مجھے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور اپنے امی ابو کا بیٹا بن کر رہے گی۔"

"ایسی باتیں عموماً" اکلوتی لڑکیاں کرتی ہیں۔ یہ ان کی اپنے والدین کے لیے محبت کی انتہا ہوتی ہے لیکن ایسے فیصلوں پر قائم رہنا ممکن نہیں ہوتا حاجرہ!"

اس کے لبوں سے میرا نام نکلا تھا جیسے ہر طرف مٹھاس گھل گئی تھی۔ میرا جی چاہنے لگا وہ بار بار میرا نام لے۔

"آپ کے گھر میں فون ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو یہ میرا نمبر رکھ لیں اور ملکہ سے بات کر کے مجھے فون کر دیجیے گا۔"

"آپ کے والدین مان جائیں گے؟"

"میرے والدین دنیا کے سب سے انوکھے والدین ہیں۔ کبھی آپ سے ملواؤں گا۔" وہ مسکرایا تھا۔

"ہمارے خاندان میں خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی ملکہ جیسی نہیں ہے۔"

ملکہ کے لیے محبت اس کی آنکھوں سے اور اس کے لہجے سے جھلکتی تھی اور میرا اندر جل کر کباب ہو رہا تھا۔

"لیکن ملکہ کے ابو۔ آپ ہمارے خاندان کے متعلق تو کچھ نہیں جانتے۔"

"میں نے ملکہ کو جان لیا۔ آپ کو دیکھ لیا۔ مجھے کسی اور کے متعلق جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھلے خاک کے فرش پر سوتے ہوں اور جھونپڑے میں رہتے ہوں لیکن میں جانتا ہوں ان کے من سچے موتیوں جیسے ہوں گے کہ زمرد ہمیشہ مونگے کی چٹان پر اگتے ہیں۔"

کیا عجیب آدمی تھا وہ اس دور میں کیا پسند کر رہا تھا۔

وہ نمبر دے کر چلا گیا تھا اور میں ساکت بیٹھی تھی۔

اسے ذہانت اٹریکٹ کرتی تھی تو پھر ملکہ ہی کیوں۔ میں کیوں نہیں۔ میں تو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش شکل تھی۔ کم از کم اس سے زیادہ لیکن وہ تو مجھ سے صرف دو بار ملا تھا اور آج تیسری بار۔ اور ملکہ کے ساتھ کئی سالوں سے پڑھ رہا تھا۔

مجھے بہت رونا آیا۔ بہت سارے دنوں بعد پرانے زخموں کے ٹانکے بھی کھل گئے تھے شاید ورنہ عبدالخالق سے میرا کیا ناتا تھا۔ کیسی انہونی سی تھی تاکہ ترکھانوں کی کم صورت لڑکی عبدالخالق کے دل کو بھا گئی تھی۔

میں نے پتا نہیں سامان کی کیسے پیکنگ کی تھی۔ اور بستر پر گر گئی تھی۔ اور اپنی روم میٹ سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ بازار جائے تو اماں اور بے بے کے لئے دو شالیں لے آئے اور ابا کے لیے بھی ایک سستی سی گھڑی۔ خود میں سستی سے پڑی رہی تھی کہ ملا لینے آگیا۔ میرا موڈ بہت خراب تھا۔ نہ میں نے بے بے سے اچھی طرح بات کی تھی نہ اماں اور ابا سے اور تھکن کا بہانہ کر کے چادر سر تک تان کر کمرے میں آکر لیٹ گئی تھی۔ جب ملکہ مجھے ملنے آئی تو میں نے اس سے بھی اچھی طرح بات نہیں کی۔ اور نہ ہی عبدالخالق کا اسے بتایا بس سر درد کا بہانہ بنا لیا۔ چہرے پر بھی نقاہت طاری کر لی اور وہ بے بے اور اماں کے پاس بیٹھ کر اور مجھے آرام کی تلقین کر کے چلی گئی۔ وہ تین دن تک میں یونہی زیادہ وقت کمرے میں چارپائی پر لیٹی رہی پھر ایک دن میں اس کا دیا ہوا نمبر لے کر اسے فون کرنے چلی گئی۔

"ہیلو! یہ آپ ہیں نا حاجرہ!" اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا تھا۔

کاش یہ بیتابی میرے لیے ہوتی۔

"جی وہ میں نے بات کی تھی ملکہ سے' وہ بالکل بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

میں فراٹے سے جھوٹ بول رہی تھی۔ ذہین تو میں

تھی اور اداکاری میں بھی مجھے کمال حاصل تھا۔ وہ بے حد افسردہ سا تھا۔ میں نے خود ہی اپنی اداکاری پر داد دی اور خراماں خراماں گھر کی طرف چل پڑی۔ میرے اندر چھپی "مس ٹاوی" لڑکی باہر آ گئی تھی۔

میں نے عبدالخالق سے وعدہ کیا تھا کہ میں سمجھاؤں گی ملکہ کو کہ وہ یہ بیوقوفی نہ کرے۔ مجھے ایسا من کی خوبصورتی کا قدر دان ملتا تو میں اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔

میں نے ساتھ ہی پانسہ بھی پھینک دیا تھا۔

"ملکہ کی سوچ بہت خوبصورت ہے حاجرہ! اس کے دل کی طرح۔ آپ اس سے کہیے گا میں اس کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ وہ جیسے چاہے اپنے والدین کی خدمت کرے۔ میں کبھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا۔"

وہ جو بھی کہتا مجھے کون سا ملکہ تک پہنچانا تھا۔

اور اس کے بعد بھی میں نے دوبارہ اس سے بات کی تھی۔ وہ از حد مایوس اور دل گرفتہ تھا لیکن میں نے باتوں باتوں میں اسے جتا بھی دیا تھا کہ میں۔

اور مجھے یقین تھا کہ ایک روز وہ مجھے ضرور پرپوز کرے گا۔ کیونکہ میں بھی ذہین تھی جیسے ملکہ۔ لیکن دنیا تو ذہین لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے مگر ہر ذہین لڑکی ملکہ نہیں ہوتی۔ یہ بات میں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اور منتظر تھی کہ کس روز وہ اپنے والدین کو میرے گھر بھیجتا ہے۔ باتوں باتوں میں اسے میں نے اپنے گھر کا اتا پتا بھی بتا دیا تھا اور پڑوس میں زینب آپا کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔ یہ ہی فون نمبر میرے ہاسٹل کے کاغذات اور یونیورسٹی میں بھی موجود تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ ایک روز وہ ضرور۔

کیونکہ میں ذہین تھی اور اسے ذہانت اٹریکٹ کرتی تھی۔

میں سادہ اور بے ریا تھی۔ مجھے دل چھل نہیں لگتے تھے۔ میرا دل خوبصورت تھا۔ یہ میرے اپنے خیالات تھے اپنے متعلق' دوسروں کے خیالات کی مجھے پروا نہیں تھی۔ اور پھر ایک روز اس کا فون آگیا۔

زینب آپا کا بیٹا بلانے آیا تو میں سر کے بل دوڑتی ہوئی گئی۔

وہ عبدالخالق ہی تھا۔ اس کی آواز میں زندگی تھی اور چہکار۔

"سنو حاجرہ! ہم تمہارے شہر آرہے ہیں۔ میرے امی' ابو اور میں۔"

اور میں گنگ سی رہ گئی تھی۔

"کب۔" بمشکل میرے حلق سے نکلا تھا۔

"یہ تو سرپرائز ہے۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم ذات کے ترکھان ہیں۔ آپ کے اماں ابا کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؟"

"نہیں بھئی سب اللہ کی مخلوق اور انسان ہیں اور یہ ذاتیں قبیلے تو پہچان کے لیے بنائے گئے ہیں اور میرے والدین تو اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں ہیں حاجرہ جی! آپ ان سے ملیں گی تو دیکھیں گی۔ اور آپ کا سچ اچھا لگا تھا۔ آپ سب ہی باکمال ہیں۔"

وہ تو جیسے خوشیوں کے جھولے میں جھول رہا تھا۔ میں اتنے دور سے بھی اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ رہی تھی۔ اور یہ کیسی انہونی ہوئی تھی۔ میں حاجرہ منیر حسین ایک نچلے متوسط طبقے کی لڑکی اور وہ۔۔۔ میں نے سوچا ابھی بے بے اور اماں سے بات نہیں کروں گی۔ وہ خود ہی آئے۔ میری خوشی میرے وجود کے ہر ہر موسے پھوٹتی تھی اور بے بے حیران ہو کر مجھے دیکھتی تھی۔

جی چاہتا تھا دھمال ڈالوں۔ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر گول گول گھوموں بڑی انہونی ہو گئی تھی۔

"بے بے! ایک سہیلی کا فون تھا اس نے بتایا ہے۔ یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے پر سونے کا میڈل ملے گا۔ خالص سونا۔ پورا ایک تولے اور مجھے پتا ہے یہ میڈل مجھے ہی ملنا ہے۔" میں نے بروقت بات بنائی تھی۔ اور باتیں بنانا تو مجھے خوب آگیا تھا۔

"اچھا میں دعا کروں گی کہیں کمبخت گڑبڑ نہ کر دیں پانی چڑھا میڈل نہ دے دیں۔"

اور گڑبڑ تو ہو گئی تھی۔ کاش میں بے بے سے کہتی وہ

میرے لیے دعا کرے کہ عبدالخالق کی گاڑی میرے گھر کے دروازے پر آکر رکے۔ اس کے ماں باپ میرے لیے جھولی پھیلائیں، لیکن میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ بے بے میرے گولڈ میڈل کے لیے دعا کرتی رہی اور میں خوابوں کے ہنڈولوں میں عبدالخالق کے سنگ جھولتی رہی اور ماما الطاف مٹھائی کا بڑا ڈبا اٹھائے چلا آیا۔ یہ موتی چور کے بڑے بڑے لڈو اسپیشل کھوئے والے۔

"ہم نے ملکہ کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ بس اچانک ہی وہ لوگ آگئے اور منہ میٹھا کر کے ہی اٹھے۔ آپ کو بھی اطلاع نہ دے سکا۔"

"کوئی بات نہیں پتر! اللہ اپنی ملکہ کا نصیب اچھا کرے۔ کیسے لوگ تھے۔ تحقیق کر لی۔ لڑکا دیکھا۔"

"لڑکا ساتھ ہی آیا تھا۔ ڈاکٹر ہے۔ اپنی ملکی کے کالج میں ہی پڑھتا تھا۔ عبدالخالق نام ہے۔"

ماما الطاف تفصیل بتا رہا تھا اور میرے جھولے کی رسیاں اچانک ٹوٹ گئی تھیں اور میں اونچائی سی گر کر چُور چُور ہو گئی تھی۔

یہ کیا ہوا تھا۔ یہ میرے خوابوں کے شیش محل میں کس نے آگ لگا دی تھی۔

میں نے آنکھیں مل مل کر ماما کی طرف دیکھا۔

کیا میں نے خواب تو نہیں دیکھا۔ کیا میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا۔ لیکن ماما الطاف ڈبا کھول کر اب لڈو نکال کر بے بے کو کھلا رہا تھا۔

"لے حاجرہ! تو بھی منہ میٹھا کر۔" بے بے نے زبردستی میرے منہ میں لڈو ڈالا اور میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ کلیاں کر کر کے منہ صاف کیا تھا۔ کتنا کڑوا اور زہریلا لڈو تھا۔ کڑواہٹ اندر تک گھل گئی تھی۔

یہ کیسے ہو گیا تھا۔ کتنی انہونی سی تھی نا جو بارات میرے دروازے پر آنا تھی وہ کسی اور کے آنگن میں اُتر گئی تھی۔ مہینوں میں سوچتی رہی کہ یہ کیسے ہوا اور پھر پتا چلا عبدالخالق اپنا کیس لڑنے خود ملکہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

ملکہ ہاؤس جاب کے لیے لاہور چلی گئی تھی۔ اور عبدالخالق تو وہیں تھا اور میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ عبدالخالق اس سے پوچھ بھی سکتا ہے۔ اپنے تئیں تو میں نے اسے پکا پکا یقین دلا دیا تھا کہ ملکہ اور وہ یہ ناممکن ہے۔

ملکہ نے میرا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس نے عبدالخالق کو نہیں بتایا تھا کہ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور یہ سب مجھے ملکہ نے اس روز بتایا تھا' جب وہ ڈاکٹر عبدالخالق کے ساتھ مزید تعلیم کے لیے امریکہ جا رہی تھی اور میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ اور یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا لیکن اس سے پہلے تو میں تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ کمرا بند کر کے پلنگ کی پٹی پر سوار مار کے۔

"یا اللہ! میں کیوں نہیں' وہ کیوں؟"

میری ساری پلاننگ فیل ہو گئی تھی اور میرے جھوٹ کسی کام نہیں آئے تھے اور عبدالخالق دھوم دھام سے اسے بیاہنے آگیا تھا۔ اس دوران میری ملکہ سے صرف دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بار وہ ماں کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے اسے منگنی کی مبارک باد بھی نہیں دی تھی حالانکہ جب وہ اماں کا بی پی چیک کر رہی تھی تو اس کی لانبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ میں اس انگوٹھی کو میں نے بہت غور سے دیکھا تھا ہاتھوں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت لگتی۔

"آپ اپنے کھانے میں نمک کم کر دیں۔" اس نے اماں سے کہا تھا۔

"بڑی عجیب بات ہے پھوپھی! ہم دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں لیکن خود کو وہی نصیحت کرنا بھول جاتے ہیں۔"

"ہے ہائے بیٹی! کیا تمہارا ابھی بی پی ہائی ہے۔" بے بے نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"نہیں بے بے' ایسے ہی ایک بات کی تھی۔" اس نے میری طرف دیکھا تھا جتاتی نظروں سے۔ ہاں وہ مجھے نصیحت کرتی تھی کہ میں کسی پر اعتبار نہ کروں مگر اس نے مجھ پر اعتبار کیا تھا۔ میں نظریں چرا کر باہر نکل

پکانے کے بہانے باورچی خانے میں آبیٹھی تھی۔

دوسری بار میری ملاقات اس سے لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کرنے آئی تھی۔ اور ملما اور عبدالخالق کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میری ہر کامیابی پر خوش ہونے والی ملکہ بے حد سنجیدہ تھی۔ جب یونیورسٹی سے آیا زینب کے گھر فون آیا تھا تقریب انعامات میں شرکت کے لیے تو میں نے بہت کوشش کی تھی کہ اس بار تو ابا میرے ساتھ چلے لیکن ابا نے ماما کو کہہ دیا تھا۔

میں نے ٹاپ کیا تھا اور مجھے گولڈ میڈل ملنا تھا۔ عبدالخالق نے بہت دل سے مجھے مبارک باد دی تھی اور "ٹریٹ ادھار رہی" کہہ کر مسکرا رہا تھا۔ لیکن ملکہ نے ایک بار بھی ٹریٹ کے لیے نہیں کہا تھا نہ مسکرائی تھی۔

"یا اللہ کوئی انہونی ہو جائے ایسی کہ مجھے شادی میں نہ جانا پڑے۔ میرا دل تو پھٹ ہی جاتا دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر۔ اور انہونی ہو ہی گئی تھی۔ میں چھت پر دھلے کپڑے لٹکانے گئی تو بالٹی سمیت سیڑھیوں سے نیچے آگری تھی۔ میرے پاؤں میں فریکچر ہو گیا تھا اور میں پلاسٹر چڑھوا کر گھر ہی بیٹھ گئی تھی۔

اماں اور بے بے شادی سے واپس آئیں تو بس ان کی زبان پر عبدالخالق اور اس کے گھر والوں کا ہی ذکر تھا۔ کاش میں ان کو روک سکتی۔ میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر لیٹ گئی تھی۔ میں اگر اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی تو ان کے متعلق سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اور پھر شادی کے بعد وہ سب کے ساتھ دعوت پر آئی تھی۔ اس کی شادی کو ایک ہفتہ ہوا تھا اور وہ عبدالخالق کے ساتھ میکے آئی تھی تو اماں نے جھٹ سے دعوت دے دی تھی۔

"ارے! تم تو سچ مچ پلاسٹر چڑھائے بیٹھی ہو۔ میں سمجھی کہ شادی میں شریک نہ ہونے کا بہانہ کیا ہے۔"

وہ نیچے پاؤں کے بل بیٹھی میرے پاؤں کا معائنہ کر رہی تھی۔

"کتنے ہفتوں کا پلاسٹر چڑھایا ہے ڈاکٹر نے؟" اس نے ابا سے پوچھا تھا۔

"تین ہفتوں کا ہے۔"

"پاؤں ٹیڑھا تو نہیں ہو جائے گا؟" بے بے کو بہت فکر تھی شاید انہیں ڈر تھا کہ پھر میرا کوئی رشتہ نہیں آئے گا کیونکہ اب انہیں ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی کہ جلد از جلد مجھے گھر بار کا کر دیں۔

"نہیں بے بے! کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ عبدالخالق کے ساتھ کھڑی وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیے میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اور آج تو اس کی چھینی ناک بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے گلے میں ایک نازک سا لاکٹ پہن رکھا تھا۔ سادگی میں بھی پرکاری تھی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو ملکہ!"

بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکل گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

پھر ایک دن اماں نے بتایا وہ امریکہ جا رہی ہے۔ ملما الطاف اماں کو بتا کر گیا تھا کہ وہ ان سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ اور میں خواہش کے باوجود اس سے ملنے نہ جا سکی۔ حالانکہ اماں نے کتنی بار کہا میں ٹالتی رہی۔ مجھ میں اسے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں کیسے دیکھتی اسے اور برداشت کرتی اور پھر وہ خود ہی اماں سے ملنے آگئی۔

میں اسے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی اپنی چوڑیوں سے کھیلتی رہی۔ اور پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"حاجرہ! ہر آدمی کو وقت آنے پر ہر وہ چیز مل جاتی ہے جو اس کے نصیب میں لکھی ہوتی ہے۔ تمہیں بھی وقت آنے پر اپنے نصیب کا حصہ ضرور ملے گا۔ اب کسی کا نصیب چھیننے کی کوشش مت کرنا حاجرہ!"

مجھے لگا جیسے اس نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو میرا رخسار جل اٹھا تھا۔ میرا سر جھک گیا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ تم۔ لیکن میں بھول گئی تھی ناکہ گہرے سے گہرا دوست بھی آج کل کے دور میں آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہوگا۔"

اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ جو مخلص نہیں ہوتا وہ آپ کا دوست ہی نہیں ہوتا۔ اور میں تو کبھی بھی اس کی دوست نہیں تھی وہ جب پہلی بار ماما کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی تو جلن اور حسد کی پنیری تو اسی روز میں نے اپنے دل کی زمین میں لگالی تھی۔

"ملکہ وہ۔ میں سوری!" میں اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے حاجرہ!" اس سارے عرصے میں پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنے لیے وہی مہربان سی مسکراہٹ دیکھی، جو ہمیشہ میرے لیے اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتی تھی۔

"میں انسانی کمزوریوں پر یقین کرتی ہوں حاجرہ! بھوک آدمی کو بڑا خوار کرتی ہے۔ چاہے وہ کیسی بھی بھوک ہو، روٹی کی، دولت کی، شہرت کی رفاقت کی۔ آدمی کا دل بھرا ہونا چاہیے دل بھرا نہ ہو تو نہ لالچ ختم ہوتا ہے نہ بھوک مٹتی ہے۔"

میں سر جھکائے بیٹھی رہی اس نے مجھے گلے لگایا پیار کیا اور عبدالخالق کے ساتھ دوسرے دیس چلی گئی کچھ عرصے بعد اس نے ماما اور رمای کو بھی بلالیا۔

اور بے بے میرا نصیب کھلنے کے لیے لمبے لمبے وظیفے کرنے لگی۔ اور دن میں نہ جانے کتنی بار ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔

یہ میرے من کا کلونس ہی تو تھا کہ بے بے اور اماں کے سارے وظیفے اکارت جا رہے ہیں اور میں کالج کے برآمدوں، کمروں، لانوں میں —— میں لڑکیوں سے گلاب لیتے ہوئے کسی انہونی کا انتظار کرتی ہوں۔ لڑکیاں جو میرے لمبے بالوں کی تعریف میں بلیک بورڈ پر شعر لکھتی ہیں اور مجھے پھولوں کے تحفے دیتی ہیں۔ ایسے ہی جیسے مس فریدہ اور مسز سعید کو دیتی تھیں اور میں مسکرا کر تھینک یو کہتے ہوئے اور پھول وصول کرتے ہوئے کسی شہزادے کا انتظار کرتی ہوں۔

مگر کہیں سے آتا لڑکیوں کا شور مجھے چونکا دیتا ہے اور میں آگے بڑھ جاتی ہوں۔ میرے پیچھے میری اونچی ہیل کی ٹک ٹک ہوتی ہے اور لڑکیوں کی ہنسی۔

اور کوئی انہونی نہیں ہوتی۔

حالانکہ میں نے اپنے من کی کالک خوب مانجھ کر صاف کر دی ہے کہ آج کل پرسوں کبھی تو کوئی عبدالخالق میرے دروازے پر اچانک دستک دے گا اور کہے گا اصل خوبصورتی تو من کا حسن ہے اور تمہارا من بہت خوبصورت ہے اور دل بھرا ہوا۔

اپنی کولیگز کی اور اپنے محلے کی لڑکیوں کی شادیوں اور منگنیوں پر اتنا حلق پھاڑ پھاڑ کر گاتی ہوں کہ گلا بیٹھ جاتا ہے۔ تالیاں پیٹ پیٹ کر ہتھیلیاں لال لال ہو جاتی ہیں۔ اتنا ہنستی ہوں کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور من بے آواز چیخ چیخ کر کہتا ہو۔

"دیکھو ملکہ عبدالخالق! میں نے اپنے بھانڈے بھر لیے ہیں اور اپنی بھوک مار دی ہے پھر بھی۔ پھر بھی کوئی—— اور منوں وزنی سلوں تلے دبا میرے اندر کا ساز کہیں نہ کہیں کسی جھری سے مجھے چٹکیاں بھرتا ہے۔ بتیس، تینتیس، چونتیس، پینتیس سال کی ہو گئی ہو حاجرہ منیر حسین اور کوئی من کا قدردان نہیں ملا تجھے تو خود کوشش کیوں نہیں کرتی کیوں نہیں خود بڑھ کر——

اور اس روز میں عنابی رنگ کی لپ اسٹک لگاتی ہوں کہ میرے چہرے پر سجتی ہے۔ مسکارے سے پلکوں کو بوجھل کرتی ہوں۔ بلشر سے گال دہکاتی ہوں۔ چٹیا کے بل کھول دیتی ہوں۔ گھر سے باہر قدم رکھتے ہی دوپٹا سر سے سرک جاتا ہے لیکن صرف ایک لمحے کے لیے...... دوسرے ہی لمحے میں دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے سر جھکائے گزر جاتی ہوں اور ہونٹ ٹشو سے رگڑ رگڑ کر صاف کر دیتی ہوں کہ میرا دل بھرا بھرا ہے۔

اماں اور بے بے وظیفے پر وظیفے کیے جاتی ہیں اور میں کالج کے برآمدوں، لانوں اور کمروں میں لڑکیوں سے پھول وصول کرتے ہوئے کسی انہونی کا انتظار کرتی ہوں۔

☆

آما خان

بت شکن

ناولٹ

کیلی فورنیا ہائی وے پر "مہرز خان" نامی ایک نوجوان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آفیسرز کے مطابق اس نوجوان کے زندہ بچنے کے امکانات کم ہیں۔

مہرز خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہوچکی ہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں اپنے پرانے اور بااعتماد ملازم جیری کے ساتھ رہتا ہے۔ رضا اس کا دوست ہے۔ مہرز کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ رضا کی چھوٹی بہن عنبر کو وہ بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔

رامین ایک مغموم و معصوم لڑکی ہے۔ ماں کے ظلم کی وجہ سے ہر وقت وحشت زدہ رہتی ہے۔ ماں کے انتقال پر اس کی پھوپھیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم اسے سنبھالتی ہیں۔ تایا شفیق الرحمان اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ منع کردیتی ہے۔

رامین اور مہرز کے درمیان اسکول کے پہلے دن سے ہی خوب اچھی دوستی ہوجاتی ہے۔ پھر حسن بھی ان کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے مگر ایک دن رامین کے والد اسے مہرز اور حسن کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بہت سختی کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے رامین ان دونوں سے کھنچ جاتی ہے۔ میٹرک تک آتے آتے رامین کی سرد مہری کے باوجود مہرز اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

مطیع الرحمان اور صبیحہ بیگم کے دو بیٹے شفیق الرحمان اور عبید الرحمان اور بیٹیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم ہیں۔ لاڈلی

بیگم، مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن ہیں اور صالحہ بیگم، صبیحہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں، جو بیوہ اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ صبیحہ بیگم اپنے میاں کی رضامندی سے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ ان کی بہت سگھڑ، مگر قدرے عام صورت بیٹی گل ناز کو صبیحہ بیگم عبیدالرحمان کے لیے لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گل ناز بھی عبیدالرحمان کو پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف لاڈلی بیگم کی خواہش ہے کہ عبیدالرحمان کے لیے ان کی بیٹی طوبی کو لیا جائے۔ صبیحہ بیگم بہت ہوشیاری سے مطیع الرحمان اور اپنی ساس کو گل ناز کے حق میں راضی کرلیتی ہیں۔

لیکن عبیدالرحمان کسی شادی میں نازنین کو پسند کرلیتے ہیں، جو محسنہ اور شاکر علی کی سب سے چھوٹی اور نہایت حسین بیٹی ہے۔ شاکر علی کی ہی طرح مغرور تھی۔ محسنہ انبالہ سے تعلق رکھنے والی ایک سادہ ان پڑھ اور کم صورت خاتون تھیں۔ جبکہ شاکر علی خوش شکل، خوش لباس پروفیسر تھے۔ انہوں نے محسنہ اور بچوں کی کفالت کے علاوہ کبھی بیوی بچوں میں دلچسپی نہ لی مگر نازنین پر انہوں نے خوب توجہ دی، جس کے باعث وہ مزید مغرور اور خود سر ہوئی۔

عبیدالرحمان بہت مشکل سے اپنے گھر والوں کو نازنین کے لیے راضی کرپاتے ہیں۔

شادی کے بعد ناز بے تحاشا مسائل میں پھنس جاتی ہے۔ عبیدالرحمان اپنی والدہ کے فرماں بردار ہوتے ہیں اور صبیحہ بیگم بہرحال ناز کو پسند نہیں کرتی تھیں، لاڈلی بیگم بھی شادی کے دوسرے دن ہی گلناز کے خلاف اس کے کان بھر دیتی ہیں۔ سسرال والے اس کی خوشیوں میں اچھی خاصی رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ صبیحہ بیگم کے بارے میں نازیبا الفاظ بولنے پر ناز پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ ناز کے دل میں سسرال والوں سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ حتی المقدور اس نفرت کا اظہار اپنی باتوں اور حرکتوں سے کرنے لگتی ہے۔ اس کی دوست عالیہ اسے مزید شہ دیتی ہے۔ وہ عبیدالرحمان کو ان کے گھر والوں سے برگشتہ کرنے کے لیے ایسی حرکت کرتی ہے کہ عبیدالرحمان ٹیپو سے سخت ناراض ہوجاتے ہیں اور الگ ہونے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ سب ناز کی منصوبہ بندی تھی۔ ناز، شاہ زیب اور رامین کو باپ اور ددھیال سے بدگمان کرنا شروع کردیتی ہے۔

رامین کو باپ کی طرف داری کرتے دیکھ کر وہ عبیدالرحمان کو زچ کرنے کے لیے اس پر ظلم کرنے لگتی ہے۔ الگ گھر میں آکر ناز آزاد ہو جاتی ہے۔ اور عبیدالرحمان کے منع کرنے کے باوجود اپنی پرانی ایکٹویٹیز شروع کردیتی ہے۔ وہ غلط بیانی کرکے عبیدالرحمان سے رامین کو پٹواتی ہے۔

ناز اور عبیدالرحمان کے درمیان خراب تعلقات شاہ زیب کو گھر سے لاتعلق کرنے لگتے ہیں۔ وہ غلط صحبت اختیار کرنے لگتا ہے۔ عبیدالرحمان کے کہنے پر شفیق الرحمان اپنے بھتیجے کو اپنے بچوں کے ساتھ گھریلو ایکٹویٹیز میں شامل کرتے ہیں۔ ناز کو پتا چلتا ہے تو وہ شاہ زیب پر ہاتھ اٹھا دیتی ہے۔ نتیجتاً شاہ زیب گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ عبیدالرحمان اپنے دوست کے بیٹے زین سے رامین کا نکاح کردیتے ہیں۔ رامین بہت خوش ہوتی ہے کہ اب اسے اس گھر سے نجات مل جائے گی جبکہ زین کو رامین کی سادگی متاثر کرتی ہے۔ ناز اس نکاح سے خوش نہیں ہوتی۔ وہ زین کو بہت مبہم انداز میں رامین سے بدظن کرتی ہے۔ نکاح کے بعد زین، رامین کو ڈنر پر لے جاتا ہے۔ وہاں رامین کی باتیں اور انداز دیکھ کر زین اس کی طرف سے سخت مشکوک ہو جاتا ہے اور واپسی میں اپنے والد سے کہہ دیتا ہے کہ وہ رامین کو طلاق دے رہا ہے۔ کیونکہ وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔ اس کے والد سمجھاتے ہیں مگر وہ نہیں مانتا۔ یہ خبر عبیدالرحمان کو ملتی ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کرپاتے اور ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ تایا سے رابطہ رکھنے پر ناز، رامین کے سر پر ایسی ضرب لگاتی ہے کہ اس کی بائیں آنکھ کی بینائی چلی جاتی ہے۔ ناز کی اچانک موت کے بعد رامین اس گھر کی ساری چیزوں کو آگ لگا دیتی ہے جو ناز نے بنائی ہوتی ہیں۔ عمر کے ساتھ لیزر ٹریٹمنٹ کرواکے نکلتے ہوئے رامین کی نظر زین پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی بیوی اور چار سالہ بچے کے ساتھ ہوتا ہے۔

—۵—

پانچویں قسط

ٹیلی فون کی بیل خالی ہال کی دیواروں سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔ رامین کا بے حس و حرکت جسم کافی دیر ایک ہی انداز میں بیٹھے رہنے سے اکڑ سا گیا تھا۔ بیل کی آواز پر وہ چیخ کر ایک دم سیدھی ہوگئی۔ تاریک ہال میں جیسے صور پھونکا جارہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔۔۔ اور دوسری بار جب صور پھونکا گیا وہ فون تک پہنچ کر ریسیور ہاتھ میں لے چکی تھی۔

جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو ہر ذی روح پھر سے جی اٹھے گا۔ کیسے؟ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ فون کرنے والے کی آواز سن کر اسے اپنے جسم میں زندگی دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ فون اس کے بھائی شاہ زیب کا تھا۔

چھ سال بعد وہ شاہ زیب کی آواز سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کی خوشی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد۔۔۔ یہ اس کی پہلی خوشی تھی۔ وہ خود کو مبارک باد دے رہی تھی۔ ہنستی روتی سجدے میں گر رہی تھی پھر اٹھ کر مسکراتی ہوئی آسمان کو دیکھتی، چاند کو دیکھتی۔۔۔ ستارے، جو پہلے سے زیادہ روشن محسوس ہونے لگے تھے ان سے کہہ رہی تھی ۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔ پھر اس کا سارا دھیان رب کائنات کی طرف چلا گیا۔

خوب خوب رو لینے اور شکر کرنے کے بعد اس کا دل پھول کی طرح ہلکا ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

لاس اینجلس انٹرنیشنل ایرپورٹ پر ان کے جہاز کو لینڈ کیے آدھ گھنٹہ ہوچکا تھا۔ بیگیج بیلٹ کے سامنے وہ اپنے سامان کے انتظار میں ٹرالی پکڑے کھڑی تھی اور شاہ زیب اس سے دو قدم آگے تھا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔۔۔" شاہ زیب نے سامان رکھنے کے بعد ٹرالی چلاتے ہوئے رامین سے کہا۔

"کیا۔۔۔؟" رامین سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پہلے ہی اسے اپنی شادی کے متعلق بتا چکا تھا۔ طارق ماموں اور مہ جبین خالہ سے تو وہ اسی وقت فون پر بات کرچکی تھی۔ پھر ایسا کون سا سرپرائز رہتا ہے، وہ اندازہ نہیں لگا پائی اور سوچتی رہی۔ شاہ زیب نے چلتے چلتے ایک اور جملہ کہہ کر اس کے شوق میں مزید اضافہ کردیا۔

"ایک بہت ہی اہم شخصیت تمہیں ایرپورٹ سے ریسیو کرنے آئی ہے۔"

"بھائی! کس کی بات کررہے ہیں؟" اس نے بے حد لاڈ کے ساتھ شاہ زیب کا بازو پکڑ کر پوچھا۔

"اگر بتادوں گا تو سرپرائز تو نہ ہوا ناں۔" شاہ زیب اسے پریشان دیکھ کر مزے لے رہا تھا۔

"کوئی ہنٹ تو دیں۔" وہ دونوں چلتے ہوئے ٹرمینل کے باہر کی طرف بڑھنے لگے۔

"ہوں۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں نیلوفر یاد ہے؟"

"نیلوفر؟" رامین نے ذہن پر خوب زور ڈالا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نام کی کوئی بھی لڑکی سے اس کی واقفیت رہی ہے۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔

"حیرت ہے۔۔۔ تم بھول گئیں اسے؟ تمہاری وہ پہلی گڑیا، نیلی آنکھوں والی جو پلکیں جھپکتی تھی۔ تم نے اس کا نام نیلوفر رکھا تھا۔"

"ہاں۔۔۔" وہ ایک دم پرجوش ہوگئی۔ "خالہ امریکہ سے لائی تھیں میرے لیے۔۔۔ میری اتنی پیاری گڑیا ۔۔۔ نیلوفر!"

"ہاں وہی۔۔۔ جس کے بغیر نہ تم کھانا کھاتی تھیں اور نہ سوتی تھیں۔۔۔"

"جی۔۔۔!" رامین نے شاہ زیب کو یاد دلانا ضروری سمجھا "اور آپ نے اسے توڑ دیا تھا نا۔۔۔ کتنا روئی تھی میں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ جس کے ٹوٹ جانے پر ہمارے گھر میں

آنسوؤں کا سیلاب آ گیا تھا۔۔۔ پھر میں نے تم سے پرامس کیا تھا کہ تمہیں بالکل ویسی ہی ایک اور گڑیا خرید کردوں گا۔۔۔" شاہ زیب کے اعتراف جرم کرتے ہی سرپرائز کی گتھی بھی سلجھ گئی۔

"تو کیا آپ نے میرے لیے ویسی ہی گڑیا خرید لی ہے؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔" رامین کی خوشگوار حیرت پر شاہ زیب نے مسکرا کر بس اتنا ہی کہا۔

"ابھی یقین آجائے گا۔۔۔"

☼ ☼ ☼

وہ خاموشی آج بھی اس کے اندر چھپی بیٹھی تھی۔ رامین کو کھونے کے بعد اس نے اپنے دل کے تمام دروازے جیسے مقفل کر چھوڑے تھے۔ اس نے جوگ نہیں لیا تھا' پر جانے کیا تھا؟ جو اس کے دل کو کسی اور کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دے رہا تھا۔

رضا کے گھر گئے ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہونے والا تھا۔ آج شاپنگ کرتے ہوئے رامین دوبارہ نظر آئی۔ اس نے بچی کو ٹرالر میں بٹھایا ہوا تھا اور خود ایک ونڈ چائم کو ہاتھوں سے چھو کر دیکھ رہی تھی۔ یہ ونڈ چائم سیپیوں سے بنا ہوا تھا۔

رامین نے طلب کرنے پر سیلز گرل نے شیلف سے ایک باکس نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تو فورا" ہی وہ ادائی کے لیے کیش کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ رامین کے نظر آتے ہی اس کا ذہن جیسے مفلوج ہو جایا کرتا تھا۔ اور رامین۔۔۔ اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ ایک شخص پر اسے اس قدر اختیار حاصل ہے۔۔۔ اسی کیفیت میں گھرا سیپیوں سے بنے ونڈ چائم کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جہاں کچھ دیر قبل رامین کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سیلز گرل سے ڈسپلے میں رکھا وہی ونڈ چائم پیک کروایا اور ادائی کر کے باہر نکل آیا۔ نظر رامین کے ساتھ اس بچی کو اسٹرالر سے باہر نکالتے شخص پر جا رکی جس کو دور پارکنگ میں ہونے کے باوجود مہریز بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ وہ رامین سے کس قدر نزدیک ہے۔ اس نے بچی کو پہلے رامین کی گود میں دیا تھا اور ہنستے ہوئے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا تھا بہت پیار سے۔۔۔ رامین نے بچی کو پچھلی سیٹ سے بندھی کڈی سیف بوسٹر سیٹ پر بٹھایا اور وہ شخص۔۔۔ جو یقینا" اس کا شوہر تھا اسٹرالر کو فولڈ کر کے ڈگی میں ڈالنے لگا۔ پھر دونوں کسی بات پر قہقہہ لگاتے گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔

مہریز لب بھینچ کر وہیں کھڑا انہیں ہنستے' ملتے' باتیں کرتے وہاں سے جاتا دیکھتا رہا۔ دونوں آج بھی ساتھ تھے۔ پہلے سے زیادہ مضبوط رشتے میں بندھے ایک بچی کے ساتھ اور وہ۔۔۔ آج بھی اکیلا تھا۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔!

جیری نے مہریز کے لیے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنا بریف کیس جیری کو پکڑایا' جسے فورا" ہی اسٹڈی میں اس کی جگہ پر رکھنے کے لیے چلا گیا۔ لاؤنج میں آ کر وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ کوٹ اتار کر اس نے صوفے پر رکھا اور بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ جیری اب اس کا کوٹ اٹھا کر اس کے وارڈ روب میں ہینگ کرنے چلا گیا۔ مہریز اپنے جوتے موزے اتار کر جیسے ہی سیدھا ہو کر بیٹھا اس کی نظر ڈائننگ ہال میں میز کے اوپر سجے چاکلیٹ کیک پر جا رکی۔ جس کے ساتھ ایک تھرماس بھی رکھا ہوا تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے جیری کی طرف دیکھا' جو اس کے جوتے ہاتھ میں اٹھائے اس کے اگلے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔ مہریز کی آنکھوں سے جھلکتے سوال کے جواب میں پہلے اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر نہایت ادب سے گویا ہوا۔

"جناب! آپ کے پڑوسی گھر سے ایک بہت پیاری لڑکی یہاں آئی تھی' اس نے بتایا کہ مسز علوی نے خصوصی طور پر یہ چیزیں آپ کے لیے بھجوائی ہیں۔"

مہریز سوچ میں پڑ گیا۔ مسز علوی کے دو بیٹے تھے جو بیکرز فیلڈ میں نہیں رہتے تھے۔ پھر وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ وہ اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک آیا۔ ایک چمچہ اٹھا کر اس نے کیک کے کنارے سے چھوٹا سا پیس

کاٹ کر منہ میں ڈال لیا۔ ڈارک چاکلیٹ کا ہلکا سا ترش ذائقہ لائٹ کریم اور روسٹڈ آلمنڈ کے ساتھ بہترین مزا دے گیا۔

"بے حد مزے دار!" مہریز نے بے ساختہ کہا۔ جیری بے ساختہ مسکرانے لگا۔ پھر مہریز نے جیری کو تاکید کی کہ وہ اسی وقت مسز علوی کو جا کر یہ پیغام دے کر شام کی چائے مہریز ان کے ساتھ ہی پیے گا۔ جیری اس کی بات سن کر فورا" ہی مسز علوی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کا گھر بھی مہریز کے بالکل ساتھ ہی تھا۔

مہریز کی امی سے مسز علوی کی بہت اچھی دوستی رہ چکی تھی۔ وہ اسے بھی بیٹے کی طرح چاہتی تھیں اور اس کی امی کے انتقال کے بعد سے اس کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں۔ وہ ان کے گھر بے تکلفی سے آیا جایا کرتا تھا۔ کاروباری مصروفیت بڑھنے کے ساتھ جہاں اس کا ان کے گھر جانا کم ہوا تھا' وہیں رابطے میں بھی خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ پھر بھی وہ جب ان سے ملتا' پچھلی ساری کسر نکال دیا کرتا تھا۔ اب شام کو وہ ان کے گھر جا رہا تھا۔

وہ لڑکی پانی کا پائپ ہاتھ میں لے کر اچھلتی کودتی لان کو پانی دے رہی تھی۔ پریشر پائپ سے نکلتی پانی کی تیز پھوار خود اس کے کنٹرول سے باہر ہو رہی تھی۔ تب ہی اچانک اس کے سامنے مسز علوی کی سیامی بلی آئی اور پانی سے بچنے کے لیے گویا کرنٹ کھا کر دوڑ پڑی۔ اس لڑکی نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ جو اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود مہریز کو صاف سنائی دیا۔ وہ قدرے تعجب سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ مسز علوی بہت سوبر خاتون تھیں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ نہ جانے یہ لڑکی ان کی کیا لگتی تھی۔۔۔ جو اتنی دیر سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کیے جا رہی تھی اور وہ اسے روک بھی نہیں رہی تھیں۔ بلکہ چائے پیتے ہوئے گاہے بگاہے اس کے ہنستے کھلکھلاتے وجود پر ایک محبت بھری نظر بھی ڈال رہی تھیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر مہریز اپنے گھر واپس آ گیا۔

مہ جبیں نے نازنین کے غم میں اپنی طبیعت خراب کرلی تھی۔ طارق اور تابندہ دونوں بہن کے پاس آگئے تھے۔

"میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔" ان کی بات سن کر تابندہ اور طارق ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

"اب کیا کریں گی جاکر۔۔۔ ایک ہفتہ ہوگیا اسے دفنائے ہوئے۔" مہ جبیں نے تاسف بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "وہ اچھی بری جیسی بھی تھی ہماری بہن تھی۔

میں، تم، تابندہ ہم سب ہمیشہ اسے غلط کہتے رہے، برا سمجھتے رہے۔ اس کی رہنمائی نہیں کی۔۔۔ اسے گلے نہیں لگایا، اپنا نہیں سمجھا۔ نہ عبید اس کی امیدوں پر پورا اترا، نہ اس کے ماں باپ اور نہ ہم اس کے ماں جائے۔۔۔ ہمیں اس سے لاکھ شکایات سہی پر جب وہ مشکل میں تھی ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔"

"اس نے خود بھی کسی کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش نہیں کی تھی باجی! نہ وہ اچھی بیٹی تھی نہ اچھی بہن نہ ہی اچھی بیوی اور ماں تھی۔ اس نے کسی رشتے کا حق ادا نہیں کیا۔ غلطی صرف ہماری تو نہیں۔۔۔" طارق کے لہجے میں واضح احتجاج تھا۔

"ہماری نظر میں صرف ہماری ہی غلطی ہونی چاہیے طارق۔۔۔ ہماری لاتعلقی نے کچھ سنوارا نہیں۔۔۔ مزید بگاڑ ہی پیدا کیا۔ نازنین کو سب نے تنہا چھوڑ دیا۔ کسی برے شخص کو تنہا چھوڑ کر تو اسے اچھا نہیں بنایا جاسکتا۔"

مہ جبیں صحیح کہہ رہی تھیں۔ طارق اور تابندہ دونوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ ان کے شرمندہ چہرے اور خاموشی اس بات کی گواہی تھے۔ مہ جبیں نے مزید کہا۔

"طیبہ کو بڑی مشکل سے میرا نمبر ملا تھا' اس لیے دیر سے بتایا اس نے۔۔۔ رامین اکیلی ہے وہاں۔۔۔ میں اس کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ شاہ زیب بھی عرصہ ہوا گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہاں ہے۔"

طارق نے چونک کر سر اٹھایا۔ "کل شام میری ایرپورٹ پر۔۔۔ اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصا اسٹیبلش ہے وہ۔ شاید پاکستان جائے۔ میں ابھی آپ کی اس سے بات کروا دیتا ہوں۔"

طارق نے اپنا سیل فون نکال کر شاہ زیب سے مہ جبیں کی بات کروا دی۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ وہ پاکستان جانے کی تیاری کررہا ہے اور اب رامین کو لے کر ہی واپس آئے گا۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں کو آتے دیکھ کر حرا نے ہاتھ ہلایا تو شاہ زیب رامین کو لے کر اس کی طرف چل پڑا۔ "یہ تمہاری بھابھی ہیں' حرا۔" شاہ زیب نے اپنی خوب صورت بیوی سے رامین کا تعارف کروایا' جس کی گود میں سرخ و سفید پھولے پھولے گالوں والی ڈیڑھ سال کی بہت ہی پیاری بچی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل حرا جیسی تھیں گہری نیلی۔۔۔ رامین اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اور یہ ہے تمہاری نیلوفر۔۔۔" شاہ نے ہاتھ بڑھا کر حرا کی گود سے نیلوفر کو لے کر اسے رامین کے بازوؤں میں دے دیا۔

"بھائی! یہ تو بالکل میری گڑیا لگتی ہے۔" اسے خوب پیار کرنے کے بعد وہ شاہ زیب سے لپٹ گئی۔

"تھینک یو بھائی۔۔۔" اس خوب صورت سرپرائز نے آنکھوں میں پانی بھر دیا تھا۔

اپنی گاڑی تک پہنچنے سے پہلے حرا اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس کے دوستانہ مزاج کا بھی رامین کو اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک پرخلوص اور خوش مزاج لڑکی ہے۔ حرا کو دیکھ کر اس سے مل کر پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں وہ اپنے تمام ننھیال والوں سے ملاقات کرچکی تھی۔ مہ جبیں خالہ میں تو اسے اپنی نانی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ تابندہ خالہ بھی بہت پیار سے ملیں۔ ان کا گھر لاس اینجلس میں تھا اور وہ اپنے شوہر اور دو بچوں لیلیٰ اور فرقان کے ساتھ ویک

اینڈ پر اس سے ملنے آئی تھیں۔ وہ سب لوگ اس سے یوں بے تکلفی سے پیش آرہے تھے۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ان کے ساتھ رہتی آئی ہو۔ جبکہ وہ ابھی تک جھجک محسوس کررہی تھی۔ وہ لیلیٰ اور فرقان کو طارق کے بازو سے لٹک کر فرمائشیں کرتے دیکھتی تو مسکرا دیتی' لیکن خود اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتی تھی کہ بے دھڑک ان کے ساتھ گفتگو کرلیتی۔

حرا نے بہت جلد اس کا یہ گریز محسوس کرلیا۔ بظاہر تو یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ اتنے سالوں بعد اپنے ننھیال والوں سے مل رہی تھی یکدم تو فری نہیں ہوسکتی تھی لیکن حرا اسے ایک سائیکالوجسٹ کی نظر سے پرکھ رہی تھی۔

رامین ایک اچھی اور خوب صورت لڑکی ہونے کے باوجود پُراعتماد نہیں تھی۔ زیادہ لوگوں میں وہ نروس رہتی اور ٹھیک طرح سے بات نہیں کرپاتی تھی۔ اس کی قوت فیصلہ بے حد کمزور تھی۔ اس کا مزاج بھی عجب دھوپ چھاؤں سا رہتا تھا۔ کبھی بے انتہا خوش ہوجاتی اور کبھی بے حد اداس۔۔۔ اسے اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ادراک بھی نہیں تھا۔ ہیومن نیچر اور بی ہیویر پر اس کی معلومات قابل رشک تھیں اور وہ رامین کی شخصیت کا ہر خلا محسوس کررہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی ٹیبل پر رامین نیلوفر کی شرارتوں سے محظوظ ہو رہی تھی جب حرا کے اشارے پر شاہ زیب نے اسے متوجہ کیا۔

"تم ناشتا کرلو پھر تیار ہوجانا' حرا تمہیں ڈرائیونگ اسکول لے کر جائے گی۔"

اس کا ردعمل حرا کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"نہیں بھائی! میں ڈرائیونگ نہیں کرسکتی' میں ایکسیڈنٹ کردوں گی۔"

حرا نے مسکراتے ہوئے اس کا جواب سنا اور کہا۔

"تم ایکسیڈنٹ نہ کرو۔ اسی لیے پہلے تمہیں ڈرائیونگ سکھا رہے ہیں' پھر ہی کار دلائیں گے۔" وہ نیلوفر کو بے بی چیئر سے نکال کر اس کا منہ دھلانے چلی گئی۔ شاہ زیب نے گہری نظروں سے رامین کی طرف دیکھا' وہ ناشتا چھوڑ کر باقاعدہ اپنا سر پکڑے بیٹھی تھی۔

"گڑیا! یہاں ڈرائیونگ کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہزاروں کام پڑ جاتے ہیں' کہیں آنا جانا ہو تو آرام سے جاسکو گی' کسی کی محتاج نہیں ہوگی۔"

اس نے منہ بنایا۔

"بس میں کہہ رہا ہوں۔ تم فوراً" ریڈی ہوجاؤ۔۔۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں سنوں گا۔" شاہ زیب نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑے بھائی کی حیثیت سے اسے حکم دیا تھا جو اسے ماننا ہی تھا۔

یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ یہ آئیڈیا حرا کا تھا۔

حرا نے اسے اپنے ساتھ ہر کام میں شامل کرنا شروع کردیا۔ پیٹرول اسٹیشن پر وہ رامین سے کہتی کہ کار سے اتر کر پیٹرول بھرے اور پیسے بھی اسے ہی تھما دیتی۔ چند ایک بار اس سے کچھ غلطیاں ہوئیں۔ اس کے باوجود حرا اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ وہ اسے اپنے قصے سنایا کرتی اور یقین دلاتی کہ جتنی بے وقوفیاں وہ کرچکی ہے' رامین اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

اسی طرح حرا رامین کو اکثر نیلوفر کے ساتھ ڈراپ کرکے خود گروسری کے لیے چلی جایا کرتی۔ اسے خود ہی نیلوفر کے لیے شاپنگ کرنی پڑتی۔ ابتدا میں وہ فیصلہ نہیں کرپاتی تھی کہ کیا خریدا جائے؟ لیکن آہستہ آہستہ خریداری آسان ہوتی گئی۔

اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی اور لائسنس بھی حاصل کرلیا۔ جس دن لائسنس اس کے ہاتھ میں آیا تھا' وہ دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرکے خوشی سے چیخیں مارتی پورے گھر میں بھاگی تھی۔ دوبار اس کا ڈرائیونگ ٹیسٹ لیا گیا۔ جن میں وہ فیل ہوگئی تھی بے حد معمولی غلطیوں پر۔۔۔ پہلی بار تو وہ تھوڑا نروس تھی بریک کے بجائے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا' فیل ہوگئی۔ دوسری بار اس نے کار ٹرن کرتے وقت انڈی کیٹر دینے کے

بعد سائیڈ مرر میں دیکھا مگر دن موڑ کر نہیں۔ دوبارہ فیل ہوگئی۔ اسے بہت غصہ آیا تھا۔ اس رات ٹیبل پر چھوٹے بچوں کی طرح منہ بسور کر شاہ زیب کو پوری روداد سنانے کے بعد۔۔۔ شکوہ کیا "اتنی سی غلطی پر مجھے فیل کردیا بھائی۔" اور شاہ زیب ہنس پڑا تھا۔

"کوئی بات نہیں پھر سے کوشش کرو۔"

اور آج وہ خوشی سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ باربار اپنا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ رہی تھی اور اپنی تصویر بھی' پھر یہ اطلاع فیس بک کے ذریعے ہر خیر خواہ تک پہنچی اور مبارک باد کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔

وہ اب خوش ہونا سیکھ گئی تھی۔ خوش ہونا اور خوشی کا اظہار کرنا اس نے لیلیٰ اور فرقان سے سیکھا تھا۔

خوش رہنا اور خوشی کا بے ساختہ اظہار اس چھوٹی سی فیملی کا خاصہ تھا۔ تابندہ نے اسے ہمیشہ دبتے رنگ پہنے دیکھا تو ان ہی رنگوں میں چار سوٹ اسے لاکر دیے۔

خوشگوار حیرت سے وہ تمام ڈریسز نکال کر دیکھنے لگی۔ ڈل کلرز پہ خوش رنگ کڑھائی اور لیسز اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اس کی پسند کے عین مطابق تمام سوٹوں کے ساتھ بڑے دوپٹے تھے۔

"پسند آئے؟" تابندہ اسے خوش ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگیں تو وہ فوراً" آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔

"تھینک یو خالہ۔۔۔ بہت اچھے ڈریسز ہیں۔"

تابندہ نے بھی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور خوب پیار کرنے لگیں۔

"تم میرے لیے لیلیٰ سے کم تو نہیں ہو' بہت پیار کرتی ہوں میں تم سے۔۔۔ آج کے بعد یہ مت سمجھنا کہ تمہاری ماں نہیں ہے' میں ہوں تمہاری ماں۔۔۔ سمجھیں؟"

وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اسے اپنی ممتا کا یقین دلا رہی تھیں اور رامین ان کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پناہ محبت دیکھ رہی تھی' اس کا دل چاہا وہ اسی طرح ان سے لپٹی رہے' اتنے برسوں کی پیاس تھی یوں پل بھر کی ممتا سے وہ کہاں سیراب ہونے والی تھی لیکن اس کے باوجود بھٹکتے وجود میں تپش کچھ کم ہوگئی تھی۔

باقی جتنے دن وہ ان کے گھر میں رہی نبھانے بہلانے سے ان کے ساتھ لگی رہی۔ وہ جیسی تھی انہیں پیاری تھی اور قبولیت کے اس احساس نے رامین کو سر اٹھا کر بات کرنے کی وہ ہمت عطا کی جو پہلے اس میں نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

سانس لینے کے لیے آکسیجن سے بھرپور ہوا' پیاس بجھانے کے لیے صاف پانی' پیٹ بھرنے کے لیے ضروری اجزا پر مشتمل غذا اور موسم کی سختیاں جھیلنے کے لیے ایک مضبوط اور آرام دہ گھر کو اہم جسمانی ضروریات سمجھا جاتا ہے' بالکل اسی طرح یا شاید اس سے بھی زیادہ اہم نفسیاتی ضروریات کا پورا ہونا ہے۔ ماں باپ کی غیر مشروط محبت' خاندان کا معاشرے میں باعزت مقام' اپنی انا اور خود داری عزت نفس کی تسکین کے لیے بے حد اہم ہے۔ انسانی جسم سوکھی روٹی' گندے پانی اور غلیظ محلے میں پل بڑھ کر جوان ہوسکتا ہے پر والدین کی محبت کے بغیر ذہنی نشوونما ہرگز نارمل نہیں رہتی۔

اپنے پاپا کی "کم بولو۔۔۔ سنو زیادہ" کی تلقین سن کر وہ خاموش رہنے کی کوشش کرتی اور جب کبھی بولنے کا موقع آتا تو اکثر اوٹ پٹانگ بات منہ سے نکل جاتی۔

"تم نے یہ کیوں کہا۔۔۔ ایسے کیوں کہا" یہ نہ کہتیں۔" ایسے فقرے سن سن کر اس نے اپنے بارے میں یہی رائے قائم کرلی تھی کہ اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے اس لیے چپ ہی رہے تو بہتر ہے۔ اپنی گفتگو کی پذیرائی نہ ہوتے دیکھ کر وہ اپنے خول میں سمٹنے لگی' جس قدر وقت گھر کے کام کاج کے بعد بچ جاتا اس کا مشغلہ کتابیں پڑھنا رہ گیا تھا۔

اس کے بعد ڈرائنگ میں مہارت ایک ایسا ہنر تھا جس نے گھر سے باہر کالج میں اسے توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ مگر جو کمی ماں باپ کی محبت پوری کرسکتی ہے وہ تمام تر تعریف و توصیف' پذیرائی اور پسندیدگی نہیں کرسکتی۔ ایک طرف وہ باپ کو ماں پر تنقید کرتے سنتی تو خود کو ان کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ جاتی اور ناز اسے مسترد کردیتیں۔ ان کی محبت پانے کے لیے وہ گدھوں کی طرح گھر کا ہر کام کرتی چلی جاتی کہ اس سے انہیں آرام ملے گا۔ آٹا گوندھنے سے لے کر کھانا پکانے تک' کچن صاف کرنے سے لے کر گھر کے کونے کونے کی صفائی کرنے تک' حتیٰ کہ باتھ روم اور قالین دھونے تک اس نے کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ناز کے دل میں جگہ بنانے میں ناکام رہی تھی۔

ناز کو تو اس کی شکل بھی پسند نہیں تھی۔ جب بھی وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھتیں فوراً" ہی رگڑ کر منہ دھونے کی تاکید کرکے اسے وہاں سے ہٹا دیتیں۔ اس کا دل بجھ کر رہ جاتا' نہ ہی اس کی عادات نہ شکل و صورت۔۔۔ کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اپنی ماں کے لیے قابل قبول ہو' بچپن میں کی جانے والی یہ ساری کوششیں نوجوانی تک آتے آتے ماند پڑنے لگیں۔ بے حسی کی چادر خود پر اچھی طرح لپیٹ کر بے نیازی کا ڈھونگ رچا کر اسے تسکین ملنے لگی۔ جب ناز اسے مارتے مارتے تھک جاتیں اور وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتی۔ آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ گرنے دیتی تو وہ تلملا کر رہ جاتیں۔ اس وقت رامین کو تسکین ملتی۔

نماز پڑھنے میں شروع سے پکی تھی۔ وجہ بے حد عجیب سی تھی کہ اسے سچے خواب دیکھنے کا شوق تھا جو نظر آتے' پر سچے تھے یا نہیں۔۔۔ اسے کبھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ بچپن میں نانی امی یعنی محسنہ نے ایک بار سونے سے پہلے اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ قصہ سنایا تھا جس میں وہ اپنے بھائیوں کے متعلق مستقبل کی پیش گوئی کرتا ایک خواب دیکھتے ہیں اور والد سے اس کا مطلب پوچھتے ہیں۔ پورا واقعہ سن لینے کے بعد رامین نے ان سے پوچھا تھا کہ "سچے خواب کیسے نظر آتے ہیں؟"

"سچے خواب معصوم لوگ کو نظر آوے ہیں۔۔۔ نہ برا دیکھو نہ برا سوچو' نہ کرو نہ ہی بولو۔۔۔ آپ ہی سچے خواب آویں گے۔" اللہ کی سادہ بندی نے سادہ سی بات کہی جو رامین کے دل میں بیٹھ گئی' محسنہ نے مزید سمجھایا کہ ہر برائی سے بچنے کے لیے نماز پڑھنا ضروری ہے۔

زین کے اپنی زندگی میں آنے کے بعد تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ جتنا اونچا اڑ رہی تھی' اسی تیزی سے منہ کے بل زمین پر گرادی گئی تھی۔۔۔ اس رات وہ بہت لڑی تھی اللہ سے۔

وہ روتی لڑتی بے دم سی ہوکر فرش پر گر گئی تھی۔ یہ دکھ' یہ تکلیف اتنی بڑی نہیں تھی۔ اس کا ادراک اگلی شام اسے تب ہوا جب عبیدالرحمان کے ہارٹ اٹیک کی خبر سننے کو ملی۔ پاپا کی موت نے ہر چیز پس پشت ڈال دی۔

اس نے سب کچھ سوچا' پر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی ماں مرجائے گی۔ اپنی موت کی بارہا دعا مانگی پر یہ خواہش کبھی نہیں کی تھی کہ ماما اس دنیا سے چلی جائیں۔ وہ تو ان کے سامنے مرنا چاہتی تھی جانے کیوں اسے یقین تھا کہ اس کے مرنے کے بعد نازنین کو اپنے کیے کا پچھتاوا ضرور ہوگا۔ جب وہ اس کے نیل و نیل بدن کو اپنے ہاتھ سے غسل دیتیں تو انہیں معلوم ہوتا کہ ان کے ہاتھوں نے کیسی کاری ضربیں لگائی ہیں' شاید انہیں پتا چلتا کہ اس کی آنکھ بینائی سے محروم ہوگئی ہے۔ اس کے لمبے بالوں کے ٹوٹے گچھے اگر ان کی انگلیوں میں پھنس جاتے تو شاید انہیں افسوس ہوتا' شاید وہ اس کے لیے روتیں۔ اس کے مردہ جسم سے لپٹ کر۔۔۔ شاید ایک بار اسے پیار کرلیتیں۔۔۔ بس ایک بار۔۔۔ لیکن ان کی موت کے ساتھ ہی ازالے کا ہر امکان ختم ہوگیا۔

شاہ زیب اسے لے کر کیلی فورنیا آگیا۔ وہ گھر' گلی کوچہ' شہر وہ دیس چھوٹ گیا تھا' پر اس سے منسلک ہر اچھی بری یاد اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی۔ تنہائی کے چند لمحے اسے واپس ماضی میں دھکیل دیا کرتے۔ وہ اس تکلیف سے گزر چکی تھی۔ پر وہ تکلیف نہیں گزری تھی۔ وہ درد آج بھی اس کے اندر

تھا۔ پھر حرا اس کی تنہائیوں میں کچھ غیر محسوس انداز سے دخیل ہونے لگی۔ وہ رامین کی پیدوانگا کرتی تھی' ہر اس کام میں جو اس کے آنے سے قبل وہ اکیلی کرتی آئی تھی۔ وہ تکلفاً" اسے اپنے ساتھ پارٹیز میں چلنے کے لیے نہیں کہتی تھی بلکہ نیلوفر کو تیار کر کے فوراً" اس کی گود میں دے کر کار میں بیٹھنے کا کہہ دیتی۔ رامین سے کسی بھی قسم کی ہمدردی یا ماضی کے متعلق کوئی سوال کیے بغیر وہ اس کے ساتھ آنے والے دن کی پلاننگ کرتی۔ مشورہ مانگتی' مدد طلب کرتی۔ یوں جب ویک اینڈ پر لیلیٰ اور تابندہ خالہ اسے لینے کے لیے آئے تو وہ انکار کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ اس کے بغیر حرا اکیلی کیسے سب کچھ سنبھال پاتی' پر اس وقت وہ حیران ہی رہ گئی جب حرا نے خود اس کی طرف سے ہامی بھرلی اور اسے اپنا سامان پیک کرنے کے لیے کہا۔ یعنی وہ چاہتی تھی کہ رامین لاس اینجلس ضرور جائے۔

حرا نے جان بوجھ کر اسے اتنا مصروف رکھنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اندازہ ہی نہیں لگا پائی تھی کہ یہ سب کچھ اس کے منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ اب اس کے ویک اینڈز دونوں خالاؤں کے گھر آنے جانے میں گزرنے لگے تھے اور وہاں اسے سوچنے کے مواقع ذرا کم ہی میسر آتے تھے۔ لیلیٰ کی ہنس مکھ طبیعت سے اس کے اپنے مزاج پر بہت مثبت اثر ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے... آہستہ آہستہ... نرمی سے...

شاہ زیب نے اسے آئی اسپیشلسٹ کو دکھایا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی بے حد ہمت افزائی کی تھی۔

✡ ✡ ✡

ہلکی میوزک کی آواز سرسراتی ہوا کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ رامین نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اس وقت گانے کون سن رہا ہے؟" آواز یقیناً" ساتھ والے گھر سے آرہی تھی۔ اپنی کتاب بند کر کے وہ بستر سے نیچے اتری' سلیپرز پہنے اور دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

مہ جبیں خالہ کے گھر کا عقبی لان نہایت وسیع و عریض تھا اور اس کے کمرے سے لے کر گھر کے آخری سرے تک جو حصہ لان کی طرف تھا' اس کی دیواریں نہیں تھیں بلکہ گلاس سلائیڈنگ ڈورز تھے۔ لان کے اختتام پر تین فٹ اونچی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر نشیب میں پورا شہر دکھائی دیتا تھا۔

یہاں اس لین میں تمام گھر اسی طرز پر تعمیر تھے جس گھر سے رات کے پونے بارہ بجے کوئی غزل سنائی دے رہی تھی۔ وہ چلتی ہوئی اس باؤنڈری وال تک آئی اور سامنے دیکھنے لگی۔ اس گھر کے آخری سرے پر موجود کمرے میں روشنی تھی اور اس کا گلاس ڈور بھی کھلا ہوا تھا جس غزل کو سنتے ہی وہ بے اختیار اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی اس کی آواز اب اور واضح سنائی دے رہی تھی۔

وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں

ابھی تک وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی' لیکن اگر وہ شخص پلٹتا تو رامین کو ضرور دیکھ سکتا تھا۔ رات کے اس پہر وہ ایک غیر شخص کو یوں گھور گھور کے کیوں دیکھ رہی ہے۔ انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی... اپنے آپ کو دل ہی دل میں سرزنش کرتی وہ فوراً" ہی وہاں سے ہٹ گئی۔ برآمدہ پار کرتے ہی اشعار کے الفاظ مبہم سے ہو گئے' اس کے لبوں نے بے اختیار وہی غزل چھیڑ دی... پھر وہ رک گئی... ٹھہر گئی۔

اسے کوئی یاد آیا تھا۔ گم صم سی بے چہرہ یاد کو سوچتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ کھلا رہنے دیا۔ ہلکی سی خنک ہوا کے خوشگوار جھونکے اس کے ساتھ اندر آئے تھے۔

اسی پل بارہ کا گھنٹہ بجا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا' اس میں بھی تاریخ تبدیل ہو چکی تھی۔ 23 اکتوبر۔ رامین کے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔ کئی منزلوں کے تھکے ہوئے مسافر کی طرح وہ بستر کا سہارا لے کر نیچے بیٹھتی چلی گئی اور بہت دیر سے رکی ہوئی سانس کو ایک آہ کے ساتھ سینے سے خارج کیا۔

وہ یہ دن بھول سکتی تھی؟ نہیں... کبھی بھی نہیں...! یہ سچ تھا کہ بیتے ہوئے سالوں میں اس نے اس دن کبھی اسے یاد نہیں کیا تھا' مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اسے کبھی بھول نہیں پائی تھی۔ 23 اکتوبر ہمیشہ سے بہت خاص دن ہوا کرتا تھا۔ اس دن... کسی بھی لمحے اچانک مہریز کا خیال ایسے آتا تھا' جیسے دھند میں چلتے ہوئے اچانک روشنی دکھائی دے اور ہر منظر واضح کر دے۔

اس رات وہ کتاب پڑھنے کے بجائے اپنے اسکول کے دنوں کے بارے میں سوچتی ہوئی نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

صبح اٹھ کر اس نے ڈارک چاکلیٹ براؤن کیک بنایا۔ اس کی اچھی سی ڈریسنگ کی۔ بھنے ہوئے بادام کے ساتھ سجاوٹ کرنے کے بعد میز پر رکھ دیا۔ خالہ کی عادت تھی۔ وہ اکثر کچھ نہ کچھ بنا کر پڑوسیوں کو بھجوایا کرتی تھیں' اب بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دو کوارٹر پلیٹس میں الگ الگ کیک کے پیس کاٹ کر رکھے اور رامین سے کہا۔

"تمہارے ساتھ دائیں والے گھر میں جیری کو یہ پلیٹ اور گرین ٹی کا تھرماس دے دینا' کہنا آپ کے رز ماسٹر کے لیے ہے اور بائیں والے گھر میں مسز ہلی کو خود پکڑا کر آنا' اوکے..." اسے اچھی طرح سمجھا کر انہوں نے دروازہ کھول کر اسے باہر بھیجا تھا۔ جیسے انہوں نے کہا تھا اس نے ویسا ہی کیا اور گھر واپس آگئی۔

لنچ کے بعد اس نے اپنے لیے ایک پیس پلیٹ میں ڈالا اور ماچس اٹھا کر کمرے کے اندر آگئی۔ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس نے کیک کی پلیٹ ٹیبل پر رکھی اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ماچس کی ڈبیا سے ایک تیلی نکال کر اس کیک کے بیچ میں موم بتی کی طرح سیدھی کھڑی کر دی۔ پھر دوسری تیلی سلگا کر کیک پر لگی تیلی کو آگ دکھائی اور زیر لب گنگنانے لگی' ہیپی برتھ ڈے ٹو یو' گاتے ہوئے اس نے خود ہی تیلی کو پھونک مار کر بجھا دیا اور تالیاں بجاتے ہوئے زیر لب مسکرا کر مہریز کو وش کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سرگوشی کبھی اس کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔

شام کو شاور لے کر باہر آئی تو مہ جبیں اس کے کمرے میں آگئیں... تولیے سے اپنے بال پونچھتے ہوئے وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ مہ جبیں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد اس میں کافی تبدیلی آئی تھی۔ حرا نے اس پر بہت محنت کی تھی جو صاف نظر آرہی تھی۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لیتیں۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے نے تو ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی اور ایک بیٹے کا باپ بھی بن گیا تھا جبکہ دوسرا بیٹا آج کل کسی فلسطینی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ورنہ رامین انہیں اتنی پیاری لگی تھی کہ اسے اپنی بہو بنانے میں وہ ایک منٹ نہ لگاتیں' لیکن اس وقت انہیں اس سے ایک شکایت تھی جس کا اظہار کرنے وہ اس کے پاس آئی تھیں۔

"تم اگلے ویک اینڈ میرے پاس نہیں آرہیں نا۔"

رامین نے سر پر تولیہ لپیٹ کر ان کے چہرے کو دیکھا جس پر پیار بھری خفگی نظر آرہی تھی' وہ ان کے پاس چل کر آئی اور ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر زمین پر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"سوری خالہ... مجھے سان فرانسسکو جانا ہے۔ ساری بکنگ ہو چکی ہے اب اگر میں نہ گئی تو لیلیٰ مجھ سے زندگی بھر بات نہیں کرے گی۔

آپ بھی میرے ساتھ چلیں نا... بھائی بھابھی تو جا نہیں رہے ہیں۔ آپ چلیں گی تو مجھے بھی بہت مزا آئے گا... چلیے نا..."

رامین کے اصرار پر انہوں نے بے بسی سے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے اس سے کہا۔ "بہت مشکل ہے بیٹا... یونیورسٹی میں فائنل سمسٹر چل رہے ہیں۔ میرا جانا بہت مشکل ہے۔"

"میری تو مجبوری ہے مگر شاہ زیب اور حرا کو تو تمہارے ساتھ جانا چاہیے۔ وہ دونوں کیوں نہیں

جارہے؟"

"پہلے وہ بھی چل رہے تھے۔" رامین انہیں تفصیل بتانے لگی۔ "لیکن پھر حرا بھابھی کی امی آ گئیں آنٹی کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ وہ اتنے گھٹنے تک گاڑی میں سفر نہیں کر سکتیں۔ اس لیے بھائی بھابھی نے اپنا جانا کینسل کر دیا۔ اب صرف میں جا رہی ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ تمہاری آنکھ کا کیا حال ہے؟" انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کا گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔ رامین زمین سے اٹھ کر ان کے پاس بستر پر بیٹھ گئی۔ "پہلے سے کافی بہتر ہے۔ آہستہ آہستہ ہی بہتر ویژن ہوگا۔"

"تمہیں ڈرائیونگ میں پرابلم تو نہیں ہوتی؟" ان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ارے نہیں خالہ! بہت مزا آتا ہے۔ اپنی پرنسز کو لے کر اس کے ساتھ شاپنگ کرتی ہوں، گروسری خریدتی ہوں اور ڈزنی لینڈ کا تو پاس بنوالیا ہے۔ تقریباً ہر روز وہیں پہنچی ہوتی ہوں۔"

"ہاں نیلوفر بہت اٹیچ ہو گئی ہے تم سے۔"

"جی بہت زیادہ۔"

"بھابھی مجھ سے کہتی ہیں تم نے ہماری بیٹی کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ہر وقت اچھو اچھو کرتی رہتی ہے۔ ہمیں تو کسی خاطر میں نہیں لاتی۔" رامین ہنستے ہنستے انہیں ساری بات بتا رہی تھی۔ مہ جبیں بھی مسکرا کر بولیں۔

"حرا بھی بہت اچھی لڑکی ہے۔ شاہ زیب نے پسند کی شادی کی تھی نا؟"

"جی لو میرج ہے دونوں کی۔" رامین نے ٹھہر ٹھہر کر ان کی بات کی تصدیق کی۔ "ویسے خالہ۔ ان دونوں کا آپس میں پیار اور سلوک دیکھ کر مجھے احساس ہوا ہے کہ شادی شدہ زندگی ایسی مشکل بھی نہیں بس اس کی کامیابی کا انحصار دونوں فریقین کے احساس ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ ورنہ میں سمجھتی تھی کہ لو میرج کا حشر میرے والدین کی طرح ہوتا ہے۔"

مہ جبیں نے چونک کر اسے دیکھا تو کیا یہی وجہ تھی کہ رامین مسلسل شادی سے انکار کر رہی ہے؟ وہ اسے سمجھانے کی غرض سے بولیں۔

"نہیں رامین! تم غلط سمجھتی تھیں اور شکر ہے کہ اپنے اس نظریے کی تصحیح تم نے خود ہی کر لی۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے والدین کی بھی آپس میں نہیں بنتی تھی حالانکہ وہ سراسر ارینجڈ میرج تھی۔"

"لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے خالہ۔ کہ اگر میرے ماما پاپا کو ایک دوسرے سے محبت تھی تو وہ ایک ساتھ خوش کیوں نہیں رہ سکے۔ یہ رشتہ کیا اتنا کچا ہوتا ہے کہ غلط فہمی یا چند ناپسندیدہ عادات کو بنیاد بنا کر اسے توڑا جا سکے۔"

مہ جبیں، رامین کو الجھتے دیکھ کر سنجیدگی سے اس کی بات سن رہی تھیں۔ اس کے خاموش ہوتے ہی انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں رامین۔ محبت کا رشتہ ایسا کچا بھی نہیں ہوتا کہ اتنی آسانی سے توڑ لیا جائے، اسی لیے تو عبید، نازنین کو طلاق نہیں دے سکا۔ اس نے تمہاری ماں سے محبت کی تھی۔"

"نہیں خالہ۔ میں نہیں مانتی۔" اسے ان کی بات سے ہرگز اتفاق نہیں تھا۔ "آپ نہیں جانتیں، پاپا ماما کو کس بری طرح زدوکوب کیا کرتے تھے۔ یہ محبت نہیں ہو سکتی۔"

"غصے کا جذبہ بے حد طاقت ور ہوتا ہے بیٹا۔ یہ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا۔ اسی لیے تو حرام ہے۔ اس کے باوجود تم سوچو تو سہی کہ عبید نے نازنین کو وہ تین لفظ کبھی نہیں کہے۔ جن کی دھمکی ہر مرد اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ کم از کم عبید کی حد تک یہ شادی محبت کی تھی۔ لیکن نازنین کے بارے میں مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ عبید سے محبت کرتی تھی۔"

اور یقین رامین کو بھی نہیں تھا لیکن جو حق عبید کے پاس موجود تھا وہ نازنین کے پاس بھی تھا۔ اگر عبید کے نازنین سے علیحدہ نہ ہونے کی خواہش محبت سمجھا جا

ہے تو کیا یہی چیز ناز کو عبید سے الگ ہونے سے نہیں روک رہی تھی؟ مہ جبیں نے جیسے رامین کی سوچ کو پڑھ لیا۔

"اس کے پاس عبید کے علاوہ ایسا کوئی نہیں تھا' جو اسے سہارا دے سکتا۔ ہم بھائی بہنوں سے اس کی بنتی نہیں تھی' وہ اپنے سسرال والوں سے بھی بہت پریشان تھی۔" مہ جبین نے اندازہ لگایا تھا اور رامین نے فوراً" ہی اس خیال کی تردید کردی تھی۔

"میں نے کبھی اپنے ددھیال والوں کو بلا تکلف ہمارے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ ایک دو بار تایا جان پاپا کے بہت بلانے پر آئے تھے ورنہ اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ماما کا روکھا رویہ برداشت کرسکے۔ ہم لوگ بھی انتہائی اہم مواقع پر دادی کے گھر جاتے اور وہاں جاکر بھی مجھے کسی سے بات کرنے یا کھیلنے کی اجازت نہیں تھی' ماما گھر سے ہی سمجھا کرلے کر جایا کرتی تھیں کہ میرے پاس سے ہلنا مت۔۔۔ اور اپنے گھر میں ماما ہر طرح سے آزاد تھیں۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ وہ سسرال والوں سے تنگ ہوکر یہاں آنے کا سوچ رہی تھیں۔"

"تو پھر۔۔۔ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟" مہ جبیں نے پُرسوچ انداز میں کہا اور رامین تلخی سے مسکرادی۔

"آپ اور تابندہ خالہ تھیں اس کی وجہ۔۔۔"

مہ جبیں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"میں نے ماما کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا خالہ۔۔۔ امریکا سے واپس آنے کے بعد وہ پاپا سے آپ دونوں کا نام لے کر جھگڑا کیا کرتی تھیں۔ وقار خالو اور آپ کا جوائنٹ اکاؤنٹ تھا شاید۔۔۔ اور تابندہ خالہ بھی اپنے گھر کے تمام فیصلے خود کرتی ہیں۔۔۔ حیدر خالو ان کے آگے پیچھے پھرتے ہیں' میں نے ہمیشہ ماما کو اپنی لائف کا آپ لوگوں سے موازنہ کرتے دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ماما آپ دونوں جیسا بننا چاہتی تھیں' بہت آئیڈیلائز کرتی تھیں وہ آپ دونوں کو۔۔۔"

مہ جبیں تاسف سے مسکرادیں' لیکن کہا کچھ نہیں۔۔۔ وہ اپنی مری ہوئی بہن کی بیٹی سے یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ تمہاری ماں مادہ پرست تھی۔ صرف ظاہر کو دیکھتی تھی۔ چیزوں کی گہرائی اور اصلیت پر اس نے کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

"یہاں امریکا میں میاں بیوی کا جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا "مجبوری" ہوتا ہے۔ شوہر آفس میں سارا دن گزارتا ہے اور بیوی کے لیے ڈرائیونگ سیکھنا' گھر کے اندر باہر کے سارے کام دیکھنا' بچوں کو اسکول لے جانا اور واپس لانا' گروسری کا سامان خریدنا' بلز جمع کروانا۔۔۔ "مجبوری" ہوتا ہے۔ یہ سب وہ اپنی خوشی سے نہیں کرتی جس مجبوری کو ناز اپنی بہنوں کی آزادی سمجھ کر جیلس ہورہی تھی' خود ان سے کہیں بہتر حال میں زندگی بسر کررہی تھی۔

تابندہ کے شوہر حیدر کا اپنی بیوی کے آگے پیچھے پھرنا تو ناز کو نظر آگیا مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ دس سال تک تابندہ نے کیا کیا سہا تھا' سگریٹ' شراب اور گرل فرینڈز کی لمبی قطار' تابندہ کو منہ دکھائی میں اپنے شوہر کی بد خصلتیں تحفتاً" ملی تھیں۔

بہت کچھ سہا تھا تابندہ نے۔۔۔ پھر بھی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے اپنے شوہر کو سدھارنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس نے صبر سے وہ انتہائی سخت وقت گزار لیا تھا جس کے بعد حیدر ایک بے دام کے غلام کی طرح اس کے قدموں میں آبیٹھا۔ ناز نے بہن کی مشکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کو ملنے والا "اجر" اسے نظر آگیا تھا۔ صبر کا پھل تو اسی کو ملتا ہے' جو "صبر" کرے۔ جو اپنی ذرا سی تکلیف پر واویلا شروع کردے اسے "صبر و شکر" کی نعمت نہیں ملتی۔ نہ ہی اجر کی دولت اس کا نصیب بنتی ہے' ناشکری کے عدسے الٹے ہوتے ہیں' ہر بڑی شے کو چھوٹا کرکے دکھاتے ہیں۔ ہر نعمت چھوٹی لگتی ہے۔

☆ ☆ ☆

روانگی سے ایک رات قبل ہی تابندہ خالہ اور ان کی فیملی شاہ زیب کے گھر آگئی۔ گھر میں یکایک ہی رونق اور چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ لیلیٰ' رامین کے ساتھ پیکنگ کروا رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ کپڑے بھی لائی تھی' جو اس نے سیدھے اس کے سوٹ کیس میں ڈال دیے تھے۔

"اُف بس کرو لیلیٰ! میں کیا کروں گی اتنے کپڑوں کا۔ تین چار دن کی تو بات ہے بس تین جوڑے کافی ہیں۔ باقی واپس رکھ دو۔" رامین نے اوپر رکھے ہوئے دو تین ایمبرائڈڈ سوٹ اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیے جنہیں لیلیٰ نے زور سے گردن ہلاتے ہوئے واپس سوٹ کیس میں رکھا۔

"تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ دو سوٹ تو سفر کرنے میں ہی مسک جائیں گے۔ آنے اور جانے کا دن۔ باقی وہاں دریا کنارے اگر کپڑے بھیگ گئے تو چینج کرنے کے لیے جوڑے تو ہونے چاہئیں۔" وہ چڑ گئی تھی۔

"دریا میں نہانا نہیں ہے مجھے۔۔۔ جو کپڑے بھیگ جائیں گے۔ میرے سوٹ کیس میں جگہ نہیں ہے۔ نکالو انہیں۔۔۔ کیمرہ رکھنا ہے مجھے۔۔۔" رامین اب تھوڑی خفا ہوکر کہہ رہی تھی' لیکن لیلیٰ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"تم سوٹ کیس ذرا میڈیم سائز کا لے لو لیکن کپڑے کم نہیں ہوں گے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ کہتے ہی لیلیٰ اس کا جواب سنے بغیر ہی حرا سے دوسرا بیگ لینے کے لیے چلی گئی۔ رامین شکست خوردہ انداز میں ہاتھ میں پکڑا دوپٹا ایک طرف پھینک کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے جھنجلاہٹ ہورہی تھی' پتا نہیں کیوں؟ اس نے ایک نظر اپنے کپڑوں سے بھرے سوٹ کیس کی طرف دیکھا نہ چاہ کر بھی اسے وہ وقت یاد آیا جب اسے کپڑوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اسے نہیں ملتے تھے۔ وہ ضرورتیں جو پوری ہونے کے لیے اس قدر انتظار کرنا پڑتا تھا کہ وہ ضرورت ہی ختم ہوجاتی تھی۔ آج بن چاہے بن مانگے اس کے اردگرد آسائشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیومز کی بھرمار تھی جن میں سے ایک بھی اس نے خود اپنے لیے نہیں خریدا تھا' الماری میں کپڑوں اور ہینڈ بیگ کی بہتات تھی۔ وہ بھی حرا کی محبت۔۔۔ خالاؤں کے تحفے۔۔۔ بھائی کا دلار۔۔۔ اس نے اپنے کانوں کی لوؤں کو دونوں ہاتھوں سے چھو کر اطمینان کیا' شاہ زیب کے گفٹ۔۔۔ ڈائمنڈ سٹڈز۔۔۔ شکر ہے موجود تھے ـــــ اپنی ماں کو ہمیشہ نئے کپڑوں' زیورات کی شاپنگ میں ہلکان ہوتا دیکھ کر وہ اس قدر اوب چکی تھی کہ اسے ان قیمتی چیزوں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اپنی ماں کو ہیرے سونے کے ڈھیر پر بیٹھ کر روتے دیکھا تھا اس نے۔ یہ خزانے اسے خوش نہیں رکھ پائے تھے۔

ان سب نعمتوں کی اس نے خواہش کی ہو یا نہ کی ہو۔۔۔ بہرحال اسے وہ مل رہا تھا' جو اس کے نصیب میں تھا۔ شکر کرنا بھی واجب تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر احساس تشکر سے نم ہوتی آنکھوں کو بند کرکے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اللہ سے کہا۔ "تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سو مچ فار ایوری تھنگ۔"

"یور ویلکم۔۔۔" کمرے میں داخل ہوتی لیلیٰ نے رامین کا فقرہ سن کر جواب دیا تھا۔ رامین نے اس کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں اور پھر۔۔۔ اسے ہنسی آگئی۔

"شکر ہے۔۔۔ موڈ ٹھیک ہوگیا۔" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ بھی شرمندہ ہوگئی۔

"سوری یار میں نے خوامخواہ تمہیں ڈانٹ دیا۔"

۔۔۔ لیلیٰ ـــــ مسکرا کر تمام کپڑے بیگ میں سلیقے سے رکھنے لگی۔ "ویسے تم نے اچھا کیا یہ ہیر کٹ بہت سوٹ کررہا ہے تم پر' یو آر لکنگ سو پریٹی۔" کپڑے تہ کرکے رکھتے ہوئے اس نے رامین کو ایک نظر دیکھ کر اس کے نئے ہیر کٹ پر تبصرہ کیا تھا جس کے جواب میں رامین نے مدھم آواز میں صرف تھینکس کہا۔

لیلیٰ نے ایک پرفیوم اٹھا کر کپڑوں کی تہہ پر رکھنے کے بعد اس کی دو کتابیں بھی سوٹ کیس میں رکھیں اور اسے بند کردیا۔

"کیمرا ہینڈ بیگ میں رکھ لیتی ہوں۔۔۔ اس بڑے سے ہینڈ بیگ کا کچھ تو فائدہ ہو۔۔۔"

لیلیٰ کے پاس سوائے اس کی بات مان لینے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

Merced River کے کنارے سے ذرا فاصلے پر موجود ڈھلان کے آخری سرے پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ سب آپس میں اچھی طرح گھلنے ملنے لگے۔

وہ کچھ دیر بے مقصد کھڑی رہی پھر سب سے الگ ہو کر ذرا دور تنہائی میں جا کر بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر اس نے اپنا چہرہ بازوؤں پر ٹکا لیا اور دل سے اس منظر کو پوری جزئیات کے ساتھ دیکھنے اور محسوس کرنے لگی۔ شرڑ شرڑ کی مسلسل آواز پیدا کرتے دریا کا شور' اس کا راستہ روکتے چھوٹے بڑے پتھر' دریا کے دوسرے کنارے پر جا بجا اونچے درختوں کی قطاریں۔۔۔ اور تیز رفتار مرسڈیز۔

کچھ دور لڑکے لڑکیاں دوڑتے بھاگتے ڈھلان سے اتر کر دریا کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے اور مرسڈ کے تیز بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرتی ٹراؤٹ مچھلیوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

فرقان نے ایک بچے کی دیکھا دیکھی اپنی ٹی شرٹ اتاری اور دریا کے بیچ میں کھڑا ہو کر اپنی ٹی شرٹ کی جھولی بنا کر ٹراؤٹ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

سمندر کے کنارے سی گل یہاں سے وہاں اڑتے ہوئے پل کے اوپر بھی پرواز کر رہے تھے۔ لیلیٰ نے ہاتھ پھیلا کر اپنے سر پر اڑتے پرندے کی نقالی میں یہاں سے وہاں بھاگنا شروع کر دیا۔ رامین اس کی شرارتیں دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ پائی۔

ایک بھرپور ہنسی ہنس کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ماضی کے تمام دریچے ایک کے بعد ایک کھلتے گئے۔ ان پرانی یادوں میں وہ ایک چہرہ بھی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

اب وہ اکثر دن کے مختلف حصوں میں کبھی نہ کبھی اسے یاد آ ہی جاتا تھا۔ یہ دوستی اس نے اپنی مرضی سے نہیں توڑی تھی۔۔۔ پاپا کا حکم تھا' اس نے مان لیا۔ لیکن آج اپنی مرضی سے۔۔۔ اسی دوستی کو یاد کرتے ہوئے ڈھونڈنے کے باوجود اسے کوئی قابل گرفت بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا پاپا کو اس کا مہرز اور حسن کے ساتھ بیٹھنا برا لگا تھا۔۔۔

اس دن وہ روتی ہوئی گھر میں واپس آئی تھی تو ماما نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا' پھر عبید سے سوال کیا۔ "کیا ہوا ہے؟"

عبید کا پارہ گھر پہنچنے تک قدرے نیچے آ گیا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔۔۔ بس میں نے اسے منع کر دیا ہے کہ آئندہ یہ کسی لڑکے سے نہ بات کرے گی۔"

"مکافات عمل سے ڈرتے ہیں؟"

"اس بکواس کا مطلب؟ شاہ زیب اور رامین دونوں ایک ہی اسکول میں رہیں گے۔۔۔ میں دونوں کو الگ الگ نہیں کر سکتا۔۔۔"

"تو ذرا اشور سے بلوا لیجیے گا۔۔۔" ناز مزے سے کہتی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"میں اپنی بچی کو کسی کے بھروسے نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔ تم میری بات کا جواب دو پہلے۔۔۔ مکافات عمل سے کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ ایسا کون سا گناہ کیا ہے میں نے۔۔۔ جو میری بیٹی کے آگے آئے گا؟" جواباً ناز ناگن کی طرح پھنکاری۔

"مجھے بہکایا آپ نے۔۔۔ جھوٹے وعدے کیے محبت کے' خواب دکھائے۔۔۔ اپنے جال میں پھنسایا۔۔۔ میری خواہش کو پورا کرنے کا دعویٰ کیا۔۔۔ میں نادان تھی کم عمر تھی آپ کی باتوں میں آ گئی۔۔۔ اسی لیے آپ خوفزدہ ہیں کہ آپ کی بچی کے آگے بھی یہی آئے گا۔۔۔ جس طرح آپ نے میری زندگی برباد کی۔۔۔ آپ کی بیٹی کی بھی ہو گی۔۔۔"

"میں نے۔۔۔ میں نے تمہاری زندگی برباد کی ہے؟ اس پرانے بوسیدہ مکان سے اٹھا کر لایا ہوں تمہیں' بیاہ کر تمہیں سر آنکھوں پر بٹھایا' ہر خواہش پوری کی میں نے تمہاری۔۔۔ اور تم کہتی ہو میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی؟"

رامین چھپ کر والدین کا جھگڑا سن رہی تھی۔ اسے تجسس تھا یہ جاننے کا کہ پاپا نے آخر اسے منع کیوں کیا تھا مگر اس دھواں دار جھگڑے کو سن کر بھی وہ کوئی نتیجہ نکال نہیں پائی۔

"زندگی تو میری برباد ہوئی تم جیسی ناشکری عورت سے شادی کی میں نے۔۔۔ جس حسین چہرے کی محبت میں مبتلا ہو کر میں نے اپنی ماں کا دل دکھایا آج اس پر تھوکنے کو جی چاہتا ہے۔" انہوں نے ناز کو بازوؤں سے پکڑ کر سختی سے جھنجوڑ ڈالا "اور تم۔۔۔ میری اور میری بیٹی کی فکر مت کرو۔۔۔ جو گناہ میں نے کیا اس کی سزا تم ہو اور تمہیں میں ساری عمر بھگتوں گا۔ رہا سوال میری بیٹی کا۔۔۔ تو کان کھول کر سن لو۔۔۔ وہ تمہاری طرح "بدکردار" نہیں ہے۔ وہ میری بیٹی ہے اور کبھی میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔۔۔"

بدکردار کا خطاب پا کر نازنین کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی اور رامین۔۔۔ اس کے لیے تو پاپا کا ایک ہی جملہ کافی تھا' جس نے زندگی کے ہر موڑ پر اپنی بازگشت سنائی تھی۔

"رامین میری بیٹی ہے اور وہ کبھی میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔"

اس کے بعد اس نے ہر اس کام سے اجتناب کیا تھا جس میں پاپا کی ذرا سی بھی خفگی کا امکان تھا۔ اس کا دوست چھن گیا اور وہ جبراً "خود کو محصور رکھنے لگی۔ وہ دوست جس کے ساتھ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز اس نے شیئر کی تھی' اپنے دل کی ہر بات' ہر نیا تجربہ پہلے اس کے گوش گزار کیا تھا۔ اس رشتے کی ڈور کاٹتے ہوئے اس کے اپنے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے اور آج تک ان ہاتھوں میں خون کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

رامین نے آنکھیں کھول کر چہرے پر پھیلے پانی کو آستین سے پونچھا اور بے خیالی میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے جیسے لہو کی غیر موجودگی کا اطمینان کرنے لگی۔

اس کا مہرز سے ملنے کا دل چاہنے لگا۔ جانے کیوں وہ یہ خواہش کر رہی تھی۔ اسے افسوس تھا دوستی ٹوٹ جانے کا۔۔۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افسوس تو اس زیادتی پر تھا' جو اس نے مہرز کے ساتھ کی تھی۔ کاش ہم دوبارہ مل سکیں۔۔۔ ویسے ہی مل بیٹھیں' میں اسے سب کچھ بتاؤں جو مجھ پر گزری' ان تمام سالوں میں۔۔۔ میں اس سے پوچھوں۔۔۔ وہ کہاں رہا؟ میں اس سے اپنے کیے کی معافی مانگوں اور وہ مجھے معاف کر دے۔۔۔ ایک لمحہ مکمل ہونے سے پہلے ہی۔۔۔ جیسے ہمیشہ وہ میری خطائیں معاف کرتا آیا تھا۔" کاش۔۔۔!

وہ پوری سچائی کے ساتھ اپنے رب سے دعا مانگ رہی تھی۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو۔۔۔ چلو دریا کا پانی اتنا ٹھنڈا ہے' پیر ڈال کے بیٹھتے ہیں۔۔۔" لیلیٰ نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔ ڈھلان سے اتر کر دونوں دریا کے کنارے بیٹھ کر پانی میں ہاتھ ڈال کر اس کی ٹھنڈک کے مزے لینے لگیں۔

"دیکھو! مجھ پر پانی مت پھینکنا۔۔۔" رامین نے پہلے ہی لیلیٰ کو وارننگ دے دی۔ لیلیٰ مسکرائی۔

"ابھی تک تو مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔۔۔ لیکن آئیڈیا برا نہیں ہے۔" اور اس سے پہلے کہ رامین سمجھ پاتی' لیلیٰ نے ایک ہاتھ سے چلو بھر پانی اس پر اچھال دیا۔ چہرے پر پانی پڑتے ہی رامین بدک کر پیچھے ہٹی۔

"اف۔۔۔ کیا کر رہی ہو لیلیٰ؟" اس کی آنکھ میں پانی چلا گیا تھا اور انگلیوں سے آنکھ رگڑتے ہوئے لیلیٰ کو اس سرگرمی سے باز رکھنے کی پوری کوشش بھی کر رہی تھی۔ چند ایک حملوں کے بعد بالآخر لیلیٰ خود ہی رک گئی۔

"ریور کراس کریں؟" لیلیٰ کے ایسے سوال' محض سوال نہیں ہوتے تھے۔ اس بات کا اعلان ہوا کرتے تھے کہ وہ یہ کام تو ضرور کرے گی۔

رامین کا دل چاہا سر پیٹ لے' ایک اور فضول آئیڈیا۔ لیکن اسی وقت ان کے پیچھے سے ان کے گروپ میں شامل کچھ لڑکے لڑکیاں بھاگتے ہوئے ڈھلان سے اترے اور دریا کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے۔ رامین کے ساتھ لیلیٰ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب سیدھے ایک لائن میں کھڑے ہوئے اور گیٹ سیٹ گو کہتے ہی بھاگ

کھڑے ہوئے۔

رامین ان سب کو آگے پیچھے دوڑتے بھاگتے دیکھنے لگی۔۔۔۔ بیچ دریا میں ایک لڑکی کا پیر مڑ گیا اور توازن خراب ہوتے ہی وہ غڑاپ پانی کے اندر گر پڑی۔ رامین نے بے اختیار ہنستے ہوئے لیلیٰ کو دیکھا' وہ بھی اسی لڑکی کی طرف۔ دیکھ رہی تھی' جسے اس کا دوست ہنستے ہوئے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ خلاف توقع لیلیٰ اس منظر کو دیکھ کر مسکرا نہیں پائی تھی۔

رامین نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا پھر اس سنہری بالوں والی امریکن لڑکی کی طرف۔ جس نے دریا میں گرنے کے بعد بھیگ کر اب اپنے دوستوں پر پانی اچھالنا شروع کر دیا تھا اس کا خاص ہدف وہی نوجوان تھا' جو پہلے پانی سے باہر آنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ وہ لڑکی بے تکلفی سے اس پر پانی اچھالتی ہنستی ہوئی اس کی کمر سے لپٹ گئی تھی۔

"ٹریکسی کو تو بہانہ چاہیے رضا سے لپٹنے کا۔۔۔۔" لیلیٰ کا تبصرہ سن کر رامین نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ لیلیٰ جیسی لڑکی کے منہ سے پہلی بار وہ کوئی طنزیہ جملہ سن رہی تھی۔ اس نے پھر سے دریا سے واپس آتے اس نوجوان اور لڑکی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"رضا۔۔۔۔ ہاں یہی نام تو تھا نرگس آنٹی کے بیٹے کا۔" اسے یاد آگیا۔ ایک بار وہ عید ملن پارٹی اٹینڈ کرنے ان کے گھر گئی تھی۔ لیکن اس کا نام یاد نہیں رکھ پائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کنارے پر اترتے' لیلیٰ نے رامین کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"چلیں۔۔۔۔ اوپر ہام کے ساتھ چل کر بیٹھتے ہیں۔" لیلیٰ یہ کہتے ہی مڑ کر چڑھائی چڑھنے لگی۔

رامین نے ناسمجھی کے عالم میں پہلے لیلیٰ اور پھر رضا کی طرف دیکھا۔ رضا نے بھی شاید لیلیٰ کا یکدم پلٹ کر واپس جانا نوٹس کیا تھا۔ وہ ٹریکسی کا ہاتھ پکڑ کر کنارے تک آنے میں اس کی مدد تو کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں لیلیٰ پر تھیں' جو پیٹھ موڑے سیدھی اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ لوگ اپنے کیبن تک پہنچے اندھیرا پھیل چکا تھا' رامین نے گاڑی سے اتر کر اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر خود کو ذرا سا اونچا کیا اور دلچسپی سے کیبن کے آس پاس دیکھنے لگی۔ کچھ ہی فاصلے پر دوسرے کیبنز بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مرسڈ کا پانی پرسکون جھیل کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

اس کا سامان کیبن میں پہنچ گیا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو دیکھا کیبن کے باہر بڑے سے ڈیک پر کچھ فرنیچر کے ساتھ باربی کیو گرل اور پکنک ٹیبل بھی موجود تھی۔ کیبن بھی بے حد کشادہ آرام دہ تھا۔ وہ مزے سے اپنے سویٹر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ادھر ادھر گھومنے لگی۔

فرقان اس کے پاس کچھ کہتا ہوا آیا۔۔۔۔ وہ اپنے خیالات میں مگن تھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"سوری میں نے سنا نہیں۔۔۔۔ کیا کہا تم نے؟" اور جواباً" فرقان غصے میں چلاتے ہوئے بولا تھا۔

"اس کی رضا سے لڑائی ہوئی اور اب وہ بچوں کی طرح باتھ روم میں بند ہو کر رو رہی ہے۔۔۔۔"

"لیلیٰ رو رہی ہے؟" رامین کو یقین نہیں آیا۔

جب اس نے رضا سے ٹریکسی کو اس کی حد میں رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ ایک بے ضرر سی' نہایت حسین مگر جلد بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی اور دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی اس کے ساتھ کام کرتی تھی اور رضا نے خود دعوت دے کر اسے یہاں بلایا تھا۔ لیلیٰ کا یوں شک کرنا اسے اپنی تذلیل ـــ محسوس ہوا اور اس نے فوراً" لیلیٰ کو ڈانٹ دیا۔

اپنے ترش رویے کی بدصورتی کا اسے بعد میں احساس ہوا تو اس کی تلافی کرنے کی غرض سے وہ لیلیٰ کی پسندیدہ چاکلیٹس لے کر آیا تھا۔

★ ★ ★

شاہ زیب رات کو تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔ حرا اس کے لیے کھانا گرم کرنے کے لیے کچن میں آگئی۔ کام کے دوران وہ شاہ زیب کے بارے میں سوچتی رہی۔ کتنا بدل گیا تھا وہ۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد تو اس کا غصیلا مزاج جیسے جادو کی چھڑی سے غائب کر دیا گیا تھا اور ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ شاہ سے پوچھے بغیر رہ نہ سکی تھی اور شاہ زیب بھی اس سے کچھ چھپا نہیں سکا تھا۔

اپنا ماضی' اپنی محرومیاں۔۔۔۔ ماں' باپ کے جھگڑے ذہنی انتشار اس نے اپنا دل جیسے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ جن حالات سے وہ گزر چکا تھا اس کا ہلکا سا سایہ بھی اپنی اولاد پر نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔ اس کا سلوک بیوی کے ساتھ اچھا تھا۔ غصہ کا وہ تیز تھا۔ لیکن خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ حرا کو اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ شاہ زیب ہر لحاظ سے ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اچھا باپ ثابت ہوا تھا۔ اگر کوئی کمی بیشی تھی بھی تو وہ خود ہی احساس کرتا اور اسے درست کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

وہ دونوں پہلی بار فلائٹ میں ملے تھے۔ حرا اپنے امی' ابو کے ساتھ اپنے رشتہ داروں سے ملنے جا رہی تھی۔ جو سوات میں رہتے تھے۔ شاہ زیب بھی پشاور جا رہا تھا۔ فلائٹ کے دوران یا ایئرپورٹ پر ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

دوبارہ اس نے حرا کو مینگورہ میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کزن کے ساتھ شاپنگ کرنے یہاں آئی تھی۔ شاہ زیب بھی وہیں ٹھہرا تھا۔ ایک' دو دن رسمی علیک سلیک میں گزر گئے تھے۔ پھر شاہ زیب نے ایک صبح ناشتے کے دوران اسے اپنے متعلق سب کچھ بتانا شروع کیا۔ وہ تھوڑا گھبرائی۔ ان دو' تین دنوں میں اسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ شاہ زیب اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن وہ اس حد تک سنجیدہ تھا کہ اپنے بارے میں سب کچھ بتا کر اسے یوں اچانک پروپوز کر دے گا۔ یہ گمان اسے ہرگز نہیں تھا۔

شاہ زیب نے گھر چھوڑنے کے بعد اپنے ایک دوست کے پاس رات گزاری تھی۔ جس نے صبح عبدالرحمان کو فون کر کے اپنے گھر بلا لیا تھا۔ عبید کے اصرار کے باوجود اس نے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا۔ عبید اسے یوں اس کے حال پر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ بہت سوچ کر انہوں نے یہ حل نکالا کہ شاہ زیب کو اپنے دوست عباس رضوی کے پاس بھجوانے کا انتظام کروا دیا' جو نارتھ کیرولینا میں رہتا تھا۔

شاہ زیب کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے عباس رضوی نے اسے ایک جیولری اسٹور کھلوانے میں مدد فراہم کرنا شروع کر دی۔ اس اسٹور میں زیادہ تر ڈائمنڈ جیولری ہوتی تھی۔ پھر شاہ زیب کو ایک ایسی کمپنی کے ساتھ بزنس کرنے کا موقع ملا' جو پاکستان کے اندر سوات اور مینگورہ میں موجود کانوں میں کان کنی کی غرض سے پاکستانی حکومت کے ساتھ اگریمنٹ کر چکی تھی۔ ان کانوں سے نکلنے والے پتھروں کو خام حالت میں امریکہ لایا جاتا اور وہاں انٹر نیشنل اسٹینڈرڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے مہارت سے تراشا جاتا تھا۔ جس کے باعث اس کی مارکیٹ ویلیو میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔ شاہ زیب بھی اسی سلسلے میں دو' تین بار پاکستان آچکا تھا۔ لیکن وہ لاہور نہیں گیا تھا' نہ ہی اس نے رامین اور اپنی ماما سے رابطہ کیا تھا۔ صرف اس کے پاپا جانتے تھے کہ وہ یہاں آیا ہوا ہے۔

چند سالوں بعد اب وہ دوبارہ سوات آیا تھا اور مینگورہ میں قیام کر رہا تھا۔ اس امریکن کمپنی کی معرفت اس کی رسائی ان کانوں تک ہو گئی تھی۔ لیکن پھر ایک رکاوٹ آڑے آگئی۔ اس کمپنی کا حکومت کے ساتھ لین دین میں کچھ جھگڑا ہو گیا اور معاملہ کورٹ تک جا پہنچا تھا۔ شاہ زیب کا کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ ان ہی دنوں وہ حرا سے ملا' وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ حرا اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ میں ہی سکونت پذیر تھی اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے پاکستان آئی تھی۔

چند ہی دنوں میں خوب صورت نیلی آنکھوں والی حرا نے شاہ زیب کا دل جیت لیا تھا۔ وہ نرم خو اور حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔ شاہ زیب نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پروپوز بھی کر دیا۔

عبدالرحمان اس سے ملنے کے لیے آئے اور

رامین کے نکاح کی خوش خبری دیتے ہوئے اسے اس موقع پر گھر واپس چلنے کو کہا۔

شاہ زیب رامین کے نکاح کا سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے پاپا کو حرا کے متعلق بھی بتا دیا کہ وہ بھی اب شادی کرنا چاہتا ہے۔ شاہ زیب کی خواہش نے عبید کو سخت برہم کر دیا تھا۔ ان کا پکا ارادہ تھا کہ رامین کی شادی کے بعد وہ اپنی بہن قدسیہ بیگم کی بیٹی کا رشتہ مانگیں گے۔ دن رات محنت سے شاہ زیب اپنے آپ کو اسٹیبلش کر چکا تھا۔ اگر عبید اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا بھی لیتے تو اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

وہ کوئی بھی پریشر قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر عبید نے اسے رامین کے نکاح میں بھی شرکت کرنے سے منع کر دیا۔ شاہ زیب ان کے جذباتی ہتھکنڈوں سے اس قدر دلبرداشتہ ہوا کہ اپنی ماں، بہن سے ملے بغیر ہی امریکہ واپس چلا آیا۔ صرف یہی نہیں، اس کے بعد اس نے عبید سے بھی کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ نارتھ کیرولینا سے اپنا کاروبار سمیٹ کر وہ کیلی فورنیا آکر اپنا ہائم میں سیٹل ہو گیا۔ یہاں اسے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا پڑا۔ حالات بہتر ہونے کے بعد اس نے حرا سے شادی کر لی۔

حرا کے ماں، باپ نے شاہ زیب کے بارے میں ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد اپنی بیٹی اس سے بیاہی تھی۔ حرا کے والد شاہ زیب کو بہت پسند کرنے لگے تھے۔ یوں ان دونوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی۔ دونوں خالاؤں اور ماموں کا ان کی زندگی میں کوئی اہم رول نہیں رہا تھا۔ شاہ زیب کو ان سے ملنے کا شاید اسی لیے خیال بھی نہیں تھا۔

اسے اپنی بہن کی فکر تھی۔ وہ بھی اس کے نکاح کے بارے میں سن کر اسے تھوڑا اطمینان رہنے لگا تھا کہ جلد ہی وہ بھی اپنی زندگی میں سیٹل ہو جائے گی۔ اپنی دعاؤں میں وہ اس کے لیے دنیا بھر کی خوشیاں مانگا کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔ کبھی کبھی صرف دعا کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اپنی ذمہ داری اور فرائض کو دعا مانگ کر ادا نہیں کیا جاتا۔ عمل سے کیا جاتا ہے۔ حقوق صرف ہمارے تو نہیں ہوتے۔ دوسروں کے بھی ہوتے ہیں اور ان حقوق کی ادائیگی کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جس کے گزر جانے کے بعد قضا نہیں پچھتاوا اور افسوس لازم ہو جاتا ہے۔ جیسے شاہ زیب کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھانے والا باپ اس دنیا سے چلا گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ اسے جنم دینے والی ماں نے بھی آخری دم تک اس کا انتظار تو کیا ہوگا۔ پر وہ پلٹ کر گیا ہی نہیں۔ وہ ان دونوں سے ناراض ہو کر گیا تھا۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے اور وہ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے اس جہان سے چلے گئے تھے۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

وہ بہت پچھتا رہا تھا۔

بہت پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا وہ حرا کے شانوں پر سر رکھ کے۔۔۔ بہت رویا تھا۔ اسے چپ کرواتے ہوئے حرا بھی ضبط کھو بیٹھی تھی۔ بنا دیکھے، بنا جانے ہی اسے شاہ زیب کے والدین پر بہت ترس آ رہا تھا۔ جنہوں نے اپنی زندگی لڑائی جھگڑوں میں گزار دی تھی۔ ہر نعمت کو اپنے ہاتھوں سے راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

جب اسے ایئرپورٹ پر طارق ماموں سے اپنے والدین کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے رامین کو فون ملا کیا تھا۔ اس سے بات کی تھی۔ تسلی کے الفاظ اس کے پاس نہیں تھے۔

اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا وہ خود میں رامین کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسے میں حرا نے اسے سنبھالا تھا۔ سمجھایا تھا۔ جب تک اس کے پاکستان جانے کے انتظامات ہوئے وہ بہت حد تک سنبھل گیا تھا۔ اس لیے وہاں پہنچنے کے بعد نہایت اہم فیصلے کرنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔

آراستہ محل کو بیچ دیا گیا رامین کی رضامندی سے۔

ٹرے میں کھانا اور پانی کا گلاس رکھ کر حرا اپنے بیڈ روم میں آئی تو شاہ زیب سونے کے لیے کپڑے تبدیل

کرکے باتھ روم سے باہر آچکا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک نڈھال سی مسکراہٹ نمودار ہوئی شاہ زیب کے چہرے پر پھر اس نے کہا۔

"سوری یار مجھے بتانا چاہیے تھا تمہیں۔ بہت تھک گیا ہوں اس لیے بالکل بھی کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ آئی ایم سوری۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں واپس لے جاتی ہوں۔"

اس نے ٹرے بستر سے اٹھائی اور دروازے سے باہر نکلتے ہوئے یکدم مڑ کر پوچھا۔

"گرم دودھ لادوں؟ یوں خالی پیٹ سونے سے اور زیادہ نڈھال ہو جائیں گے۔"

شاہ زیب نے اثبات میں سرہلایا۔

پانچ منٹ بعد وہ دودھ گرم کرکے لے آئی۔ شاہ زیب نے مگ ہاتھ میں لے لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

"شاہ زیب! میں رامین سے متعلق ایک ضروری بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔۔۔" کچھ لمحوں بعد اس نے ذرا جھجکتے ہوئے شاہ زیب سے کہا تو وہ ٹی وی سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں کہو۔۔۔ کیا کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل میں۔۔۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ہمیں رامین کی شادی کردینی چاہیے۔" حرا نے اتنا کہہ کر تھوڑا وقفہ لیا' پھر کہا۔

"امی کو رامین بہت اچھی لگی ہے۔ وہ میرا کزن ہے نا۔۔۔ اس کے لیے سوچ رہی تھیں۔"

"کون۔ ہاشم کی بات کررہی ہو کیا؟" شاہ نے پہلے سوال کیا پھر اسے یاد آگیا۔

ہاشم حرا کی خالہ کا بیٹا تھا اور نیویارک میں آرکیٹیکٹ تھا اور ہر طرح سے رامین کے لیے موزوں بھی۔ لیکن۔۔۔ شاہ زیب اس سے آگے سوچتے ہوئے رک سا گیا۔

"تم نے آنٹی کو بتایا ہے کہ رامین کو ڈائیورس ہو چکی ہے؟" حرا نے اطمینان سے کمفرٹر کھولا اور کہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ جانتی ہیں کہ رخصتی سے پہلے ہی رامین کو ڈائیورس ہو گئی تھی۔ شاہ زیب! یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے کہ جو کسی کے لیے قابل اعتراض ہو۔ آپ جانتے تو ہیں میری فیملی کو۔۔۔"

شاہ زیب کو اس بات سے اتفاق تھا کہ حرا کی فیملی نہایت سلجھی ہوئی تھی۔

"تم نے رامین سے اس بارے میں کچھ کہا؟" شاہ زیب کے لیے رامین کی مرضی جاننا بھی ضروری تھا۔

"پوچھا تھا میں نے رامین سے۔۔۔ خاص "ہاشم" کا نام لے کر نہیں' مگر ایسے ہی کہ شادی کے بارے میں وہ کیا سوچتی ہے؟"

"تو کیا کہا اس نے؟"

"اس نے صاف انکار کردیا۔ شاہ زیب۔۔۔ وہ کہتی ہے' اسے زندگی بھر شادی نہیں کرنی ہے۔ آپ اسے سمجھائیے نا۔"

رامین کا جواب سننے کے بعد شاہ زیب کو فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ لگا تھا بس' اس نے قطعی لہجے میں حرا سے کہا۔

"دیکھو حرا۔۔۔ ڈونٹ ٹیک می رانگ' لیکن آج کے بعد تم اس بارے میں کچھ نہیں کہوگی۔۔۔ نہ مجھ سے نہ رامین سے۔ اگر وہ نہیں چاہتی تو ہم میں سے کوئی اسے مجبور نہیں کرے گا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی نہ سہی۔ میں ساری زندگی اس کے لاڈ اٹھاؤں گا اور اس کی ہر خواہش پوری کروں گا اور جب تک وہ خود نہیں چاہے گی۔ کوئی اسے شادی کرنے کے لیے فورس نہیں کرے گا۔" وہ نہایت نرم لیکن مضبوط لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"حرا! میں چاہتا ہوں رامین اپنی زندگی کا ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرے۔ میں اس کے ساتھ روا رکھی گئی ہر زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ اینڈ آئی ہوپ کہ تم میری فیلنگز کو سمجھنے کی کوشش کروگی۔" اس نے حرا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"ہاں ایک بات ضرور اس تک پہنچا دینا۔۔۔ کہ اسے اپنے تمام فیصلے کرنے کی آزادی ہے۔ اسے کوئی پسند آئے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر وہ ساری زندگی اسی طرح رہنا چاہتی ہے۔۔۔ تو بھی۔۔۔ ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔۔۔ اوکے۔ کہہ دوگی نا تم؟"

شاہ زیب کو یقین دہانی کی ضرورت تھی' حرا نے گہری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے اپنے محبوب شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آں جان من' ام اس کو بول دے گا۔" حرا کی پشتو لہجے میں دی جانے والی گارنٹی شاہ زیب نے بھی مسکراتے ہوئے وصول کی تھی۔

☼ ☼ ☼
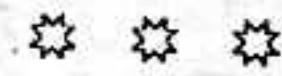
ناشتا سب نے مل کر ڈیک پر ہی کیا تھا۔ سوائے لیلیٰ اور رامین کے۔۔۔ لیلیٰ تو رضا کو نظر انداز کررہی تھی۔ اس لیے اور رامین کو اسے اکیلا اندر چھوڑ کر جانا گوارا نہیں تھا۔ اس لیے وہ بھی کچن کاؤنٹر پر اس کے ساتھ ہی ناشتا کرنے لگی تھی۔

دس بجے تک پورے گروپ کا ——— Mariposa جانے کا ارادہ تھا۔ چائے کافی سرد کردی گئی تھی۔ کچھ اپنے ہاتھوں میں مگ اٹھا کر ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ رامین کپڑے تبدیل کرچکی تھی۔ مگر لیلیٰ کو ابھی تیار ہونا تھا۔ ناشتا ختم کرکے وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے میں تیار ہونے چلی گئی۔ رامین وہیں اسٹول پر بیٹھی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی کہ رضا اس کے پاس آیا اور نہایت شائستگی سے گویا ہوا۔

"رامین آئم سوری۔۔۔ میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن میرے ایک دوست نے ابھی ابھی ہمیں جوائن کیا ہے۔ کیا اس کے لیے بریک فاسٹ بن سکتا ہے۔"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں ابھی بنا دیتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اسٹول سے اتر کر اسٹوو کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور رضا شکریہ کہتے ہوئے واپس ڈیک پر چلا گیا۔ فریج سے ناشتے کی چیزیں نکال کر وہ پلٹی تو نظر گلاس وال سے باہر نظر آتے رضا کے دوستوں پر جا رکی' ایک نیا اضافہ تھا تو سہی۔۔۔ کرسی پر بیٹھا ہوا۔ جس کے پیروں کے پاس ایک بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔ لیکن صورت اس کی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود کچھ تھا جو رامین کو جانا پہچانا سا محسوس ہوا تھا۔

براؤن لیدر جیکٹ۔۔۔ اس کے ذہن میں صبح دکھائی دینے والے شخص کا سراپا ابھرا تھا۔ اوہ تو یہ رضا کے دوست ہیں۔ معما حل کرتے ہی وہ ناشتا بنانے میں پھر سے مصروف ہو گئی۔

ناشتا بنانے کے بعد اس نے رضا کی طرف دیکھا' جو اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں ایسا مگن ہوا تھا کہ رامین سے تھوڑی دیر پہلے کی گئی درخواست بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا۔ اس نے چیز آملیٹ کی پلیٹ اپنے ہاتھ میں پکڑی اور کافی کا مگ لے کر ڈیک پر آگئی۔ نووارد کے دائیں طرف کھڑے ہو کر اس نے جیسے ہی پلیٹ اس کے آگے رکھی۔ اس شخص نے رامین کو دیکھا اور رامین نے اسے' اور دونوں ہی اپنی جگہ جم گئے تھے۔

وہ اجنبی نہیں تھا۔ ہرگز نہیں۔ وہ نووارد شخص۔۔۔ اسے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہے۔ ٹھٹک کر رک جانے کے بعد۔۔۔ سانس لینا' پلکیں جھپکنا' وہ سب بھول گئی تھی۔ اس کا تو دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

پیئے ہیں سات سمندر مگر وہی ہے پیاس
نگاہ بھرتی نہیں ہے کسی کو پاکر بھی

یہ کیفیت چند سیکنڈ پر مشتمل تھی اور اس شخص نے یک دم اپنا رخ موڑ کر اس کے اور اپنے درمیان بندھی نظروں کی ڈور کو جھٹکا دے کر واپس کھینچ لیا۔ اس کے حصے کی ڈور لپک کر آنکھ میں واپس آئی تو مجبوراً" پلکیں جھپکنا پڑ گئی تھیں۔ اپنے بڑھتے قدم واپس پلٹنا آسان نہیں تھا اور ٹھہرے وقت کے ساتھ ٹھہرنا بھی ناممکن۔۔۔ لرزتے جسم اور ڈگمگاتے قدموں سے کیبن میں آتے ہوئے اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بکھری لٹوں کو پیچھے ہٹایا۔ کچھ سوچا اور

ایک بار پھر مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھنے لگی۔
وہی چہرہ۔ وہی انداز۔ ہاں وہ وہی تھا۔ آس پاس کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا کہ وہ کسے نوٹس کر رہی ہے۔ سوائے اس ایک شخص کے جو اس کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مہرز سب کچھ جان کر بھی انجان بنتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں۔۔۔ اور وہ۔ سراپا انتظار۔۔۔ نہایت بے قراری سے اس کی توجہ کی طالب۔

مہرز خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔۔۔ سر جھکائے۔۔۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی رامین کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کا بے گانہ رویہ دیکھ کر رامین کو شک سا ہونے لگا۔۔۔ شاید وہ غلط سمجھی ہے۔۔۔ لیکن وہ سو فیصد وہی تو تھا۔ بالکل بھی نہیں بدلا تھا کہ اسے پہچاننے میں کسی بھی قسم کی کوئی دقت نہیں پیش آئی تو پھر وہ اس کی طرف دیکھتا کیوں نہیں۔۔۔
کیا میں بدل گئی ہوں؟ میری صورت بدل گئی ہے؟ وہ بھی اس قدر کہ مہرز مجھے پہچان نہیں سکا۔ یا پھر وہ ابھی تک مجھ سے خفا ہے۔ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لیے مجھے پہچان کر بھی انجان بن رہا ہے۔

الگ الگ سہی دنیا کا اور دوست کا غم
کبھی یوں ہی ذرا دیکھو انہیں ملا کر بھی

ایک طویل ترین تھکی ماندی سانس۔۔۔ اس کے سینے سے خارج ہوتی گئی۔ بالکل بے آواز۔۔۔ گونگا دکھ۔۔۔ دل میں بھاری پتھر کی طرح آن بیٹھا۔ آنکھوں میں دھندلا غبار بھرتا چلا گیا۔ چاہنے کے باوجود وہ رو نہ سکی۔

عجیب قحط پڑا اب کے سال اشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہوئی خون میں نہا کر بھی

اپنی بے بسی پر ہنستے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح خود سے بے تحاشا نفرت محسوس کی تھی۔
"میں اسی قابل ہوں۔"
سخت طیش کے عالم میں خود کو اچھی طرح لعنت ملامت کرنے کے بعد اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

☆ ☆ ☆

یہ جو ریگ دشت فراق ہے' یہ رکے اگر
یہ رکے اگر تو نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے' یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں
مرے آسماں سے کدھر گئی' تیرے التفات کی کہکشاں
مرے بے خبر' مرے بے نشاں
یہ رکے اگر تو پتا چلے
میں تھا کس نگر تو رہا کہاں
کہ زماں و مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
وہ میرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پہ برس گئیں

مہرز بھی کبھی کبھار ایک اچٹتی سی نگاہ رامین پر ڈال لیتا اور پھر اپنے سیل فون پر میسج کرنے لگتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا فون جیکٹ کی جیب میں واپس رکھ لیا اور واک مین کان سے لگا لیا۔ رامین اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن سوچ وہ ایک دوسرے کے بارے میں ہی رہے تھے۔ لیکن کسی شخص سے تجدید تعلقات کی آرزو میں ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ عرصۂ جدائی دکھائی نہ دینے کے باوجود بہر حال اپنا وجود رکھتا ہے۔ ہر گزرتا لمحہ مابین فاصلہ بڑھاتا چلا جاتا ہے اور یہ دوری' یہ خلا' اس کے سامنے آتے ہی درمیان میں حائل ہو جاتا ہے۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر کھڑے دوست تک رسائی ناممکن لگنے لگتی ہے۔ بچھڑے ہوؤں کے درمیان سکوت بھر جائے تو ہر صدا کھو جاتی ہے۔ دشت سکوت پار کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

شٹل اپنے روٹ پر رواں دواں اور مسافر۔۔۔ کچھ ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف۔۔۔ کچھ باہر دیکھتے ہوئے اپنے خیالوں میں مگن۔۔۔ اور وہ دونوں ہر تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ دونوں ایک ہی کام کر رہے تھے اور دونوں۔۔۔ اسی کوشش میں تھے کہ ایک دوسرے کو خبر نہ ہونے دیں۔ جس میں کسی حد تک کامیاب بھی تھے۔ رامین بالآخر سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔ اس نے جتنی دفعہ مہرز کو دیکھا تھا وہ کہیں اور ہی متوجہ نظر آیا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے بھی منہ پھیر لیا۔

بس لاٹ میں آ کر شٹل رک گئی۔ رضا کے گروپ میں سات لوگ تھے اس کے علاوہ دو فیملیز تھیں۔ بس کے رکتے ہی آٹومیٹک دروازہ کھل گیا اور وہ سب اترنے لگے۔

رامین کو رش میں گھسنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ صبر سے اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ جب تمام لوگ نکل کر آگے بڑھے تب اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور شٹل کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اترتے ہوئے اس کی نظر سامنے کھڑے مہرز پر پڑی۔ وہ اپنا بیگ پیر کے پاس رکھ کر اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔
سورج کھل کر چمک رہا تھا۔ اکتوبر میں یوسیمیٹی کے دن گرم ہی محسوس ہوتے ہیں جبکہ راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ اسے بھی گرمی لگ رہی ہوگی ورنہ بس میں تو اے سی آن تھا۔ وہ ایک قدم نیچے اتری۔ مہرز نے ایک کندھے پر اپنا بیگ لٹکایا۔ دوسرے ہاتھ میں جیکٹ پکڑتے ہوئے اس کی نظر رامین سے الجھ گئی۔ اب کی بار لاکھ چاہنے کے باوجود وہ فوراً" اس سے نگاہ ہٹا نہیں سکا۔۔۔ اور وہ لمحہ اسیری تھا۔ کتنی کوشش کی تھی ان آنکھوں کے حصار سے بچنے کی۔۔۔ سوال کرتی شکوہ کناں آنکھیں۔۔۔ اس کی لاتعلقی پر اداس تھی وہ یا پھر۔۔۔ وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکا کہ اب کی بار پہلے نظر چرانے والی رامین تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی یکدم تبدیل ہوئے تھے۔ مہرز مبہم سا مسکرایا۔ برسوں بعد وہ شناسا بیگانگی دکھائی دی تھی رامین کے چہرے پر۔ اب وہ اسے مکمل نظر انداز کر رہی تھی جبکہ مہرز بار بار اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ رامین خفا ہے۔۔۔ اور یہ دیکھ کر اسے اچھا لگ رہا تھا۔ لاتعلقی کا اظہار بھی تعلق ہونے کا اعتراف ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

رضا' حیدر انکل کے ساتھ کچھ کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس لینے اندر چلا گیا۔
ان کا ارادہ ٹرام میں بیٹھ کر پورے ماری پوسا کا چکر لگانے کا تھا۔ معلوم نہیں یہ اتفاق تھا یا رامین کی ہمیشہ کی طرح رش سے بچ کر کھڑے ہونے کی عادت۔۔۔ کہ وہ کود کر اوپر چڑھنے والوں میں سب سے آخری نمبر پر تھی اور جو سیٹ اسے ملی' وہ مہرز کے عین مقابل تھی۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ایک ایسے شخص کی نظروں کے سامنے جمے رہنے میں' جو اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے دوبارہ غصہ آنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح صرف اپنے آپ پر۔

امبر فرقان کے ساتھ ہی تھی۔ اس گروپ میں اور کوئی اس کی عمر کا تھا بھی نہیں' یہ دونوں بچے لیلیٰ اور رامین کی ذمہ داری تھے۔ رامین نے فرقان کو آواز دے کر گروپ کے نزدیک رہنے کو کہا۔
"مجھے رضا کے ساتھ ہائکنگ کرنی ہے۔" لیلیٰ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر ادھر بھٹکنے کی تم ہم کے ساتھ ٹرام پر رہو گے سمجھے۔" فرقان برا سا منہ بنا کر وہاں بھاگتا ہوا حیدر کے پاس چلا گیا' شاید یہی درخواست دہرانے۔۔۔ رامین نے اسے کچھ فاصلے پر کھڑے حیدر خالو سے بات کرتے دیکھا اور جیسے ہی خالو نے اثبات میں سر ہلایا فرقان "یاہو" کا زبردست نعرہ لگاتا پلٹ کر لیلیٰ کی جانب آیا۔
"پاپا سے اجازت مل گئی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ہائکنگ پر چلنا ہوگا۔۔۔!"
"نو وے۔" لیلیٰ نے فوراً" انکار کیا تھا۔ اس کی رضا سے ناراضی چل رہی تھی اور وہ اس کے ساتھ کسی تفریح میں شریک نہیں ہونا چاہتی تھی۔
"میں پاپا کو منع کر دوں گی' تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔۔۔

میں نہیں آؤں گی۔" وہ دونوں آپس میں الجھتے جھگڑتے دوبارہ حیدر کے پاس چلے گئے تھے۔ رامین تابندہ کے ساتھ ٹرام میں آکر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ بھی ایک ایک کرکے آتے گئے اور ٹرام بھر گئی۔ پھر چل بھی پڑی لیکن مہریز نظر نہیں آیا تھا اب تک۔۔۔ رامین جو اس بار سب سے آخری سیٹ پر بیٹھی تھی اپنے آگے پیچھے تمام لوگوں کو با آسانی دیکھ سکتی تھی۔ جسے وہ نظر انداز کرنا چاہ رہی تھی' فی الحال وہ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے بے نام سی الجھن ہونے لگی۔

اوپن ایر ٹرام۔۔۔ گہرے سبز رنگ کے بڑے سے ٹریکٹر کے پیچھے کوچ پر تیس چالیس سیٹیں نصب تھیں اور چڑھنے کے لیے دونوں جانب سے رستے چھوڑے گئے تھے تمام سیاح ٹرام کے رکتے ہی نیچے اترتے' تصویریں اتارتے اور دس منٹ تک واپس ٹرام میں پہنچ جاتے' جو نہ پہنچ پاتا' ٹرام اس کے لیے رکنے والی نہیں تھی' اسے وقت کی پابندی سے مطلب تھا۔

ست روی سے ٹرام چلتی ہوئی کلوتھسپن ٹری کے نزدیک پہنچ گئی۔ مجبوری تھی۔ وہ گروپ کے ساتھ تھی جو وہ کرتے' اسے بھی وہی کرنا تھا۔ جبکہ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اکیلی کچھ دیر اس جنگل کے کسی خاموش حصے میں جاکر بیٹھ جائے۔ اتنے سارے لوگوں کے درمیان ان کی باتوں کی آواز اسے پوری طرح محظوظ نہیں ہونے دے رہی تھیں۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی خواہش کو دبانے کی بھرپور کوشش کی۔

آخری پڑاؤ فالن واوناٹری کے پاس تھا۔ اس نے ٹرام سے اتر کر ڈھیر ساری تصویریں اتاریں۔

ریسٹ روم کے پاس دس منٹ کا قیام اور پھر واپسی کا سفر۔۔۔ یہاں رضا اور اس کا پورا گروپ اتر گیا۔

انہیں ہائکنگ کرتے واوناٹا لاجز تک پہنچنا تھا۔ حیدر کے حکم پر لیلیٰ کو بھی فرقان کے ہمراہ جانا تھا۔ اس لیے تابندہ نرگس اور ان کے شوہر حضرات ٹرام میں رامین کے ساتھ بیٹھے رہے اور لیلیٰ فرقان فقرہ بازی کرتے ٹرام سے اتر گئے۔ رامین کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ خود سے کہہ سکے "میں بھی جانا چاہتی ہوں۔"

منتظر نگاہوں سے وہ لیلیٰ کو دیکھتی رہی' جو فرقان سے الجھنے میں اتنی مصروف تھی کہ اسے رامین سے پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس گروپ کو ٹرام سے دور ہوتے دیکھنے لگی۔ ٹرام چلنے لگی تو نرگس آنٹی نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"ارے رامین! تم بھی چلی جاتیں نا سب کے ساتھ ہائکنگ پر۔۔۔ ہماری تو ہمت نہیں اتنا چلنے کی تم تو جا سکتی ہو۔" تابندہ خالہ کو بھی خیال آیا۔

"وہ لوگ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔۔۔ وہ دیکھو سامنے جارہا ہے پورا گروپ۔" انہوں نے ایک طرف اشارہ کیا اور رامین تو جیسے تیار بیٹھی تھی۔

"خالہ میں جاؤں!"

"ہاں ہاں فوراً" جاؤ۔۔۔" رامین اجازت ملتے ہی فوراً" اٹھی' اپنا ہینڈ بیگ خالہ کو دے دیا اور صرف کیمرا ہاتھ میں لے کر ٹرام سے اتر گئی۔ ٹرام چل پڑی تو رامین نے اس راستے کی جانب دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے پورا گروپ نظر آرہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس طرف بڑھنے لگی۔

اس نے گروپ کی تلاش میں ہر طرف نظر دوڑائی' ہائکنگ ٹریل پر تیز تیز چلتی ہوئی کافی آگے آگئی لیکن بے سود' جانے وہ سب کس طرف نکل گئے تھے۔ پروگرام تو یہی طے ہوا تھا کہ وہ سب ایر گروسے قطرلوپ تک جائیں گے۔ اس نے رضا کو کہتے سنا تھا' وہ قریباً" پانچ میل کی مسافت تھی' ناری پوسا سے واوناٹا لاجز تک یہ رستہ پیدل چلنے والوں کے لیے تھا۔ قدرتی مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہوتے اترائی میں دو ہزار فٹ اتر جانا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ نہ ان سب کے لیے اور نہ ہی رامین کے لیے۔۔۔ اگر وہ ان کے ہمراہ نکلی ہوتی یوں اکیلی انہیں یہاں سے وہاں ڈھونڈتی نہ پھر رہی ہوتی۔

وہ الٹے قدموں واپس ہولی۔ اپنا موبائل اپنے ہینڈ بیگ میں ہی چھوڑ دیا تھا اور ہینڈ بیگ کو خالہ کے پاس۔

"کیا بے وقوفی کردی میں نے۔" اپنے آپ کو کوسنے کا یہ سنہری موقع وہ کیسے جانے دیتی۔ بہرحال غلطی تو اس نے کی تھی۔ اب کف افسوس ملتے رہنے سے کوئی فائدہ تو تھا نہیں' ایک ہی راستہ بچا تھا اس کے پاس کہ اگلی ٹرام میں سوار ہو کر واپس چلی جاتی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اسی مقام پر آکر کھڑی ہو گئی جہاں سے ٹرام گزرنی تھی۔ ٹرام ٹریک پر فی الحال دور دور تک کسی ٹرام کا نام و نشان نہیں تھا۔ اب سوائے انتظار کرنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ٹریک سے ہٹ کر وہ کچھ پل ادھر ادھر دیکھتی رہی' پریشانی کے عالم میں اسے کچھ دیر پہلے کی خواہش یاد آئی جب وہ اکیلی اس جنگل میں وقت گزارنے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اب وہ اکیلی تھی۔۔۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑا۔ بجائے کڑھنے کے وہ اتنا وقت کسی جگہ سکون سے بیٹھ کر بھی تو گزار سکتی ہے۔ یہی سوچتی وہ مڑ کر ریسٹ روم کیبن سے آگے جاکر ڈھلان کے سرے پر آگئی' یہاں اس کے عقب میں جنگل تھا اور سامنے واوناٹا ویلی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے اپنا کیمرا ہاتھ میں لیا اور تصویریں لینے لگی۔ اپنی تنہائی سے اچھی طرح لطف اندوز ہوتی وہ ہر منظر کو کیمرے میں قید کررہی تھی۔۔۔ بہت مزا آرہا تھا اسے۔۔۔ کوئی گیت گنگناتے اس نے ایک منظر کو ذرا بہتر انداز سے فوکس کرنے کے لیے زمین پر بکھرے کچھ بڑے پتھروں میں سے ایک پتھر پر پاؤں ٹکا کر خود کو اٹھایا۔ ابھی کلک کرنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی "رامین۔۔۔؟"

اتنی دیر سے خود کو تنہا سمجھنے والی رامین اپنا نام سن کر چونکی اور بے ساختہ ہی مڑ کر دیکھا۔ یوں ایک دم ہلنے سے توازن خراب ہوا تھا اور وہ جو ایک چھوٹے سے پتھر پر اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈال کر کھڑی تھی' پہلے لڑکھڑائی اور پھر گر پڑی۔ اس نے ہاتھ سے کیمرا چھوڑ کر پیر پکڑ لیا اور چیخ اٹھی "اف۔"

آواز کس نے دی تھی' فوراً" ہی معلوم ہو گیا جب اس کے زمین پر گرتے ہی مہریز "اوہ نو آئی ایم سوری" کہتا اس کے سامنے آکر بیٹھا تھا۔ "تم ٹھیک ہو رامین! پیر دکھاؤ مجھے۔۔۔"

رامین نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پیر کو پکڑے ہوئے آنکھیں میچ کر اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے سختی سے دباتے ہوئے اپنی تکلیف کو ضبط کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ مگر چوٹ اچھی خاصی تھی۔ اسے زور کا چکر آیا تو اس نے پاؤں چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"تم پلیز اپنا پاؤں تو سیدھا کرو پہلے۔۔۔" مہریز کی آواز سن کر اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ بے حد پریشان تھا اس کے لیے۔ لیکن فی الحال اس کی ہدایت پر عمل کرنا رامین کے بس میں نہیں تھا۔ اس کا پیر ابھی تک ٹانگ کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارہی تھی کہ اسے خود سیدھا کرسکتی۔ مہریز کے دوبارہ کہنے پر اس نے گہری سانسیں کھینچ کر درد سے کراہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

"مہریز! مجھ سے ہلا نہیں جارہا۔۔۔" یہ سن کر وہ کچھ دیر تو اسے ناکام کوشش کرتے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر اس نے ایک ہاتھ کو رامین کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دبے پاؤں کے ٹخنے کو جکڑا اور آہستگی سے ٹانگ کو سیدھا کردیا۔ باوجود کوشش کے ایک ہلکی سی کراہ نکل ہی گئی۔ مہریز نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا پھر دوزانو ہو کر اس کے متاثرہ پاؤں کا جائزہ لینے لگا۔

رامین کے ٹخنے اور ایڑی کے درمیان کا حصہ فوراً" سوج گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں موچ کے ساتھ ٹخنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مہریز نے نرمی اور احتیاط کے

ساتھ انگلیوں کی پور سے وہ باریک پتھر ہٹائے جو رامین کے پاؤں میں کھب گئے تھے۔ نرم تلوؤں پر ان پتھروں کے نشان ۔۔۔ نظر آرہے تھے۔ جو سلیپرز رامین پہن کر آئی تھی یہاں کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا۔ لیکن کیبن میں اچانک مہرز کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن نے جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے جاگرز پہننا بھول گئی تھی۔ مہرز نے باریک سنگ ریزوں کو جھاڑنے کے بعد انگلیوں سے پیر کو ذرا سا سہلایا تاکہ تکلیف کا احساس کم ہو سکے۔

پاؤں کی ایڑی کے کنارے ٹخنے تک آتی ایک نس ابھر آئی تھی۔ چند لمحوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ پیر کس جگہ سے مڑا ہے۔ مہرز کو لگا' وہ اس کا پاؤں ٹھیک کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے رامین سے بغیر کچھ کہے دونوں ہاتھوں سے اس کا پیر اور ٹخنہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ جواب تک مندی آنکھوں سے اپنے درد میں کمی کا انتظار کر رہی تھی۔ پاؤں کے پکڑے جاتے ہی پوری آنکھیں کھول کر یکدم سیدھی ہو بیٹھی۔

"یہ تم کیا کرنے لگے ہو۔۔۔؟" مہرز نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اسی دم اس کا پیر پنجوں سے پکڑ کر گھما دیا۔ رامین تکلیف سے تڑپ اٹھی۔

"مہرز کے بچے' میرا پیر چھوڑو۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا پیر چھڑانے کے لیے مچلنا شروع کر دیا لیکن مہرز کی گرفت مضبوط تھی۔ اس کے اس طرح مچلنے پر وہ جھلا گیا۔

"تم دو منٹ سیدھی نہیں بیٹھ سکتیں؟ بند کرو یہ کتھک۔"

"تم میرا پاؤں تو چھوڑو۔۔۔"

"نہیں چھوڑوں گا' جب تک تم تمیز سے سیدھی ہو کر نہیں بیٹھو گی۔" اب وہ باقاعدہ ڈانٹ رہا تھا۔ رامین ساکت ہو گئی۔ مہرز نے کام جاری رکھا۔ پہلے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے ٹخنے پر چڑھی نس کو دبایا اور اس کا پنجہ ایک بار پھر مخالف سمت میں موڑ دیا۔ یہ مہرز کی ڈانٹ کا اثر تھا شاید۔۔۔ جو اس بار زیادہ تکلیف ہونے کے باوجود رامین کے حلق سے آواز نہ نکلی تھی۔ لیکن آنکھ کے کناروں سے دو آنسو بے اختیار پھسل پڑے تھے۔

مہرز نے اس کا پیر چھوڑ دیا۔ رامین آنکھیں بند کر کے سر جھکائے درد کی لہروں کے مدھم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر مہرز کی طرف دیکھا' جو اپنا بیگ کھول کر کچھ سامان نکال رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے پیر کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر درد کا احساس آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنا پاؤں آگے پیچھے گھما کر دیکھا۔ ذرا سی چیخ پیخ کی آواز کے ساتھ پیر با آسانی ہل جل کرنے لگا۔ موچ ٹھیک ہو گئی تھی لیکن چوٹ لگنے کے باعث ہڈی میں ابھی تک درد ہو رہا تھا۔ اس نے پیر پیچھے کر کے اسے ہاتھ سے سہلانا شروع کر دیا۔

"تم یہاں اکیلی کیا کر رہی تھیں۔۔۔ باقی سب لوگ کہاں ہیں؟" مہرز نے اپنے بیگ سے بینڈیج رول باہر نکال کر اس کے پیروں کے نزدیک رکھی۔ رامین برستی نظریں جھکائے ہوئے بولی تھی "کوئی نہیں ہے سب چلے گئے ہیں۔"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر؟" وہ حیران ہوا "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟" مہرز کا پوچھنا غضب ہو گیا' رامین پھٹ پڑی۔

"کیوں؟ تم نے بھی تو یہی کیا تھا' میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی اور تم۔۔۔ بغیر کچھ سنے چلے گئے تھے۔" اسکول کے باہر مہرز کا رویہ اسے آج بھی یاد تھا۔

"میں کہیں گیا نہیں تھا' وہیں پر تھا۔۔۔"

"مجھے تو نظر نہیں آئے تم۔۔۔"

"تم نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہو گی۔۔۔ ورنہ میں وہیں تھا' تمہارے آس پاس۔"

"کیا فائدہ ایسے۔۔۔ پاس ہونے کا جب انسان دکھائی ہی نہ دے۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی تم پھر بھی نہیں رکے۔۔۔"

"تم آواز دے لیتیں' شاید رک جاتا۔"

"سب کچھ میں کرتی۔ کیوں؟" وہ بری طرح چڑ گئی تھی "اور آواز تو میں نے اب بھی نہیں دی تھی پھر

کیوں آئے ہو؟" اس کی آواز رندھ گئی۔

"دوست کڑے وقت میں خود پہنچ جایا کرتے ہیں، انہیں بلانا نہیں پڑتا۔" مہرز لب کچلتی اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں مصروف رامین کو نرمی سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا "تمہیں میری ضرورت پڑی تو میں آگیا۔"

"تو پہلے کیوں چلے گئے تھے؟" اب کی بار رامین نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا اور مہرز کے لیے اسے روتا دیکھنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

"اب نہیں جاؤں گا۔" مہرز نے اس کے پیر پر کوئی ٹیوب لگائی۔ پھر کہا "آئم ایم سوری۔۔۔ میری وجہ سے تمہیں چوٹ لگ گئی۔۔۔ لیکن پلیز تم روؤ مت۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں غلطی تمہاری تو نہیں ہے، یہ سلیپرز نہیں پہننے چاہیے تھے مجھے۔۔۔"

"تو تم نے معاف کر دیا مجھے۔۔۔" مہرز ہلکے سے مسکرایا تھا۔

"اب یوں پیر پکڑ کر معافی مانگو گے تو معاف کرنا ہی پڑے گا۔" رامین اتنی دیر میں پہلی بار کھل کر مسکرا رہی تھی، پھر اس نے اپنا پاؤں ذرا سا پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "تم رہنے دو میں خود لگا لوں گی۔۔۔"

لیکن مہرز نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ فوراً اس کا پاؤں پکڑ کر اپنے گھٹنے پر رکھا اور تحکمانہ انداز میں کہا "ابھی میں بینڈیج کروں گا۔ تم بالکل سیدھی بیٹھی رہو، سمجھیں۔"

کریم ملنے کے بعد وہ اس کے پیر پر بینڈیج لپیٹنے لگا پھر اس کا پاؤں اپنے گھٹنے سے ہٹا کر نیچے رکھ دیا۔

"تھینکس۔۔۔" اسے واقعی بے حد آرام مل رہا تھا، لیکن ابھی وہ ایک پاؤں پر سارا بوجھ ڈال کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ مہرز نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ مجبوری تو تھی۔ اسے اٹھنے کے لیے مہرز کا سہارا درکار تھا، سو اپنا ہاتھ خاموشی سے اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں تھی۔ بظاہر اس چھوٹے سے حادثے نے ان کے درمیان موجود گرہ کو کھول دیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا لیکن۔۔۔ اس ساری گفتگو میں۔۔۔ جو دونوں نے آغاز میں کی تھی۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ رامین اس سے ماضی کے حوالے سے شکوہ کر رہی تھی جبکہ مہرز۔۔۔ حال میں ہی رہا تھا۔ وہ آج صبح رامین کو دیکھ کر چونکا تھا لیکن اتنا حیران نہیں ہوا تھا جتنی وہ نظر آ رہی تھی۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ رامین کو پہچان کر بھی انجان بن رہا تھا تو اس کی وجہ سوائے جھجک کے اور کچھ نہیں تھی۔ وہ یوں بے تکلفی سے اسے سب کے سامنے مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ رامین اس کا گریز دیکھ کر ہرٹ ہوئی تھی۔ مہرز واٹر سے نیچے آ رہا تھا، جب اس نے رامین کو پہاڑ کے ایک طرف وادی کی تصاویر کھینچتے دیکھا تھا۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ رامین سے خیر خیریت پوچھ کر وہ آگے بڑھ جاتا لیکن رامین کو چوٹ لگ گئی تھی اور یہ جان کر کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے، وہ اسے یہاں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ اپنے ہاتھ کا مضبوط سہارا دے کر وہ اسے چلاتا ہوا ٹرام ٹریک تک لا رہا تھا راستے میں رامین نہایت بے تکلفی سے اپنی تمام بے وقوفیوں کی تفصیل سناتی رہی اور وہ سر جھکائے سنتا رہا مسکراتا رہا۔

جب رامین نے اپنی بات ختم کی تو مہرز نے اپنا موبائل نکالا اور رضا کا نمبر ملایا۔ انہیں بتانا ضروری تھا کہ رامین خیر خیریت سے ہے اور ٹرام کے ذریعے ہی ماری پوسا سے واپس شٹل میں واوتا پہنچے گی۔ شٹل کو ابھی مزید آدھا گھنٹہ لگنا تھا۔ رضا نے ساری صورت حال اچھی طرح سمجھ کر حیدر انکل کو بھی فون پر بتا دی تھی۔

ٹرام آ چکی تھی۔ رامین مہرز کی مدد سے اس میں سوار ہوئی، اس کے آرام سے بیٹھ جانے کے بعد مہرز بھی کندھے سے بیگ اتار کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اپنا بیگ اس نے رامین اور اپنے درمیان رکھ لیا تھا۔ کوچ مسافروں سے بھر گئی اور پھر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ مہرز کو لگا وہ ٹرام میں نہیں، کسی ٹائم مشین میں بیٹھ گئے ہیں۔ رامین۔۔۔ جو اسکول میں بلا تکان اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔ اپنے بچپن کا ہر نیا انکشاف پہلے اس کے گوش گزار کرتی تھی۔

"کل پاپا نے مجھے نئے شوز دلائے ہیں، یہ دیکھو۔"

"ٹارزن کی واپسی" میں نے تو پڑھ لی ہے تمہارے لیے لائی ہوں۔۔۔ لو!"

"تمہیں پتا ہے ہفتے کو میں رکشے پر بیٹھی تھی، اتنا مزا آیا۔۔۔" وہ تالی بجا کر اپنے ہاتھ ان دیکھے ہینڈل پر جما لیتی اور بولتی جاتی۔ "یوں پھٹ پھٹ پھٹا پھٹ چلاتا گھماتا شور مچاتا وہ ہمیں نانی کے گھر لے گیا۔۔۔" اور کبھی کہتی۔

"کل رات بابا ہمیں برگر الیون لے کر گئے تھے، لبرٹی میں۔۔۔ اف کیا بتاؤں مہرز! کتنے مزے کا برگر تھا۔" اور بھی بہت کچھ۔۔۔ باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔۔۔ وہ سلسلہ جہاں رکا تھا جب رامین کے پاپا اس دوستی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر گئے تھے، آج وہیں سے دوبارہ شروع ہو رہا تھا۔ مہرز نہیں جانتا تھا کہ رامین کا ذہن اسے آج بھی اسی مقام پر سمجھ رہا ہے، جہاں یہ دوستی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اسی ٹرانس میں تھی۔ اس ٹائم مشین میں بیٹھنے کے بعد اس نے پہلی بات وہیں سے شروع کی۔۔۔ جہاں آخری بات ختم کی تھی، تب جب وہ کلاس فور میں تھے اور مہرز اس کی یادداشت پر حیران ہو کر سن رہا تھا۔ وہ جو بھی کہہ رہی تھی، جیسے کہہ رہی تھی وہ صرف سن رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے" اس دن کے بعد میں نے رات کو پہلی بار جگنو اپنے ہاتھ میں پکڑا تھا۔ وہ بھورا بے ڈھنگا عجیب سا کیڑا ہوتا ہے۔ اف مہرز! بڑا مزا آیا اور پتا ہے میں نے بھائی کے ساتھ پتنگ بھی اڑائی تھی۔ اف! میرا ہاتھ کٹ گیا اتنی زور سے۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔"

اس نے سی کی آواز نکالتے ہوئے مہرز کے سامنے اپنی انگلی پیش کی۔۔۔ اور وہ جو اس تیز گام ایکسپریس کی نان اسٹاپ گفتگو میں بھول ہی گیا تھا کہ اسے بھی کچھ کہنا چاہیے، رامین کے سیدھے ہاتھ کی انگلی پر ہلکے سے کٹ کا نادیدہ نشان بڑے غور سے دیکھتے ہوئے افسوس کرنے لگا اور تب ہی اس کی نظر کلائی پر پڑی۔

"یہ ہاتھ کیسے جلا تمہارا؟" رامین نے بھی اس نشان کو دیکھا اور کہا "یہ۔۔۔ یہ تو میں فریج فرائز تل رہی تھی مہمانوں کے لیے، ساتھ چولہے پر پانی ابل رہا تھا، پانی اچھل کر کڑاہی میں گرا اور کڑاہی کا تیل اچھل کر میرے ہاتھ پر۔۔۔ بہت بڑا آبلہ پڑ گیا تھا، اب تو بہت سال ہو گئے ہیں۔ پر یہ نشان جاتا ہی نہیں۔"

مہرز نے دیکھا، رامین اپنے پرانے زخم کو دیکھ کر تھوڑی افسردہ ہو گئی تھی، کہیں کھو سی گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا رامین کے ہر ہر زخم کے ساتھ کیسی یادیں وابستہ ہیں۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بالکل چپ چاپ ان درختوں کو دیکھنے لگی۔۔۔ مہرز نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا شاید وہ دوبارہ بات شروع کرے گی۔ جب ایسا نہ ہوا تو وہ خود ہی پوچھ بیٹھا۔

"اوہ تو۔۔۔ تمہیں کھانا وغیرہ بنانا آتا ہے؟ سیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں۔۔۔! میں تمہیں بتاتی ہوں۔" مہرز کے سوال پر وہ اچھل کر سیدھی ہو بیٹھی اور پورے جوش و خروش سے اسے بتانے لگی۔

"کلاس سکس میں تھی میں اور میرا دل چاہا کہ میں کلیجی پکا کر کھاؤں' ماما سے پوچھا انہوں نے بتایا۔ پیاز فرائی کرو' نمک چٹکی بھر' مرچیں ایک چائے کا چمچہ اور ہلدی بس۔۔۔ میں کلیجی پکانے کھڑے ہو گئی۔ پک گئی' بڑی خوش ہو کر ماما کو چکھائی' انہوں نے غور سے دیکھا اور باریک باریک کالی پتیوں کو انگلی پر لے کر مجھ سے پوچھا' یہ کیا ڈالا ہے؟ سارا منہ کڑوا کر دیا۔۔۔ تو پتا ہے میں نے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" مہرز نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کہا چائے کی پتی! آپ ہی نے تو کہا تھا ایک۔۔۔ چائے کا چمچہ۔"

پھر وہ اور مہرز دونوں ایک ساتھ دل کھول کر ہنستے رہے۔

ٹرام سے اتر کر وہ دونوں آہستہ آہستہ واک کرتے ہوئے اسنیکس شاپ کی طرف جا رہے تھے۔ مہرز نے رامین کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ ابھی اپنے پیر پر زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ لنگڑا کر چلتی ہوئی رامین کی زبان بڑی روانی سے چل رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا' میں تم سے ہر بات کیسے کر لیتی ہوں۔" اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے؟ "میں نے اپنی کسی دوست کو نہ ہی اسکول اور نہ کالج میں یہ سب کہا جو آج تم سے کہہ دیا۔ تم سے اپنی فیلنگز شیئر کرنے میں مجھے کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ بلا جھجک بے دھڑک سب کہہ دیتی ہوں تم سے' یہ سوچے بغیر کہ تم میرے بارے میں کیا سوچو گے یا تم پر میرا کیا امپریشن پڑے گا؟ مجھے کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا' ایک منٹ کے لیے نہیں۔" وہ چلتے چلتے رک گئی اور مہرز کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔

"اور۔۔۔ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں خود اپنے ساتھ ہوں۔" مہرز ابھی تک اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اور وہ جیسے تہیہ کیے ہوئے تھی کہ سب کچھ آج ابھی اور اسی وقت کہہ دینا ہے۔

"میرا بہت دل چاہتا تھا' میں تم سے ملوں اور یہ صرف ایک سرسری سی ملاقات نہ ہو۔ ہم بالکل اسی طرح اکٹھے ہوں۔ جیسے اسکول میں ہوا کرتے تھے۔ آنے والے کل سے بے خبر ہر فکر سے آزاد' فرصت کے اسی عالم میں مل بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کریں۔۔۔"

وہ خواب آگیں لہجے میں صرف اپنی خواہشات کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مہرز کی دلی تمنا بھی یہی رہی تھی اور وہ بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خوابوں کی دنیا میں کھڑی تھی اور مہرز کو بھی اپنے ساتھ اسی مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بالکل بے اختیار تھا۔

کیسی معصومیت تھی ان جملوں میں۔۔۔ ہنسی میں کیسی بے ساختگی۔۔۔ اور پھر ایک بار اس نے مہرز سے پوچھا۔

"تمہیں یاد ہے نا۔۔۔؟"

مہرز پورے انہماک سے اس کی گفتگو سن رہا تھا' محسوس کر رہا تھا' سانس روکے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ پلکیں جھپکانا یا اپنے اعضا کی اور کوئی ہلکی سی جنبش بھی فی الحال اسے گوارا نہ تھی۔ وہ تو اسے دور سے ہی دیکھ کر مکمل اس کے اختیار میں چلا جایا کرتا تھا۔ اب تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دنیا ہی بھلائے دے رہی تھی۔

"کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔" دل نے شدت سے خواہش کی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تسنیم شریف

سوداگری

نقرئی گھنٹیوں کا ترنم ایک واضح شور کی صورت اختیار کرنے لگا تھا' ہولے سے پکارے جانے والے اس کے نام میں باقاعدہ تقاضا شامل ہو گیا تھا جب یہ دونوں آوازیں مل کر سماعت خراش ہونے لگیں تو یک

لخت گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ تیز ہوتا شور کمرے میں موبائل کی رنگ ٹون میں ڈھل چکا تھا اور بلند آواز سے پکارے جانے والے نام میں استحقاق اور اپنائیت تھی چند لمحے ہانیہ اندازہ ہی نہ کر سکی کہ وہ کہاں ہے اور یہ کس طرح کی آوازیں ہیں معاً اس کی نگاہ سامنے بیڈ پر سوئے اپنے والد پر پڑی تو اسے یاد آگیا کہ وہ ہسپتال میں ہے وہ دوڑ کر اپنے باپ کی طرف لپکی مگر وہاں مکمل سکوت اور خاموشی تھی سانسوں کا زیر و بم زندگی کا پتا دے رہا تھا اس نے ایک آہ بھری اسی لمحے دوبارہ اس نے سنا۔

"ثانی..... ثانی بیٹا۔" اس دفعہ ہانیہ آواز کا تعین کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ فضل صاحب تھے اس کے والد کے بیڈ سے دائیں طرف کے تیسرے بیڈ کے مریض اور واضح طور پر اسی سے مخاطب تھے۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس پہنچی۔

"جی انکل!"

"ثانی بیٹا! پانی تو دو۔" اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر ان کی طرف بڑھایا اور ایک نگاہ سوتی ہوئی مسز فضل پر ڈالی وہ اپنے شوہر کی تیمارداری کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ تھکن ایسی تھی کہ اتنے ہنگاموں کے بعد بھی ان کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔ اس کا موبائل جو چیخ چیخ کر خاموش ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر گنگنانے لگا تو وہ فضل صاحب سے معذرت کر کے فون سننے کے لیے کوریڈور میں آ گئی۔ لائن پر اس کا شوہر رضوان تھا اور سخت ناراض تھا۔

"میں نے کل تمہیں بتایا تھا کہ امی بیمار ہیں۔"

"ہاں تو میں نے انہیں فون کر لیا تھا۔" ہانیہ نے حیرت سے جواب دیا۔

"فون کر لیا تھا..... کیا مطلب؟ کیا مجھے اب یہ یاد دلانا پڑے گا کہ انہیں تمہاری خدمت کی ضرورت ہے۔ ماں ہیں وہ میری اور ان کی خدمت کرنا تمہارا فرض ہے۔"

"معاف کرنا' ان کی خدمت کرنا میرا نہیں تمہارا فرض ہے۔ میرا فرض جن کی خدمت کرنا ہے میں ان کے پاس موجود ہوں۔" ہانیہ کو اس کی بات سن کر شدید غصہ آیا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرا کیا فرض ہے مگر روزی روٹی کے چکر میں' دن بھر جو خوار ہوتا ہوں کس کے لیے؟ تمہارے لیے' بچوں کے لیے' تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ میرے سکون کی خاطر دو گھڑی ان کی طرف ہو آؤ۔"

"جب اپنا فرض پورا کرنے کا وقت آتا ہے تب تو کسی کو خیال نہیں آتا نہ تمہیں یاد آتا ہے۔

پتا نہیں لوگ اپنا سلوک کیسے بھول جاتے ہیں اور حیرت ہے کہ امیدیں بھی وابستہ کر لیتے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ہانیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"تم..... امیدیں ہمیشہ اپنوں سے ہی لگائی جاتی ہیں غیروں سے نہیں..... تم کوئی غیر نہیں ہو' بہو ہو ان کی ہمیشہ بیٹی جیسا سمجھا ہے انہوں نے تمہیں۔"

یہ بات کہتے کہتے رضوان کا لہجہ مدافعتی ہو گیا اس کی آواز میں شرمندگی تھی مگر ہانیہ کو اس کا احساس ہی نہیں ہوا اور اس نے جواب دیے بغیر لائن کاٹ دی۔ واپس کمرے میں پہنچی تو فضل صاحب جیسے اس کے منتظر تھے انہوں نے ایک بار پھر اسے بلایا۔

"اور پانی دوں؟"

"نہیں' بیٹھ جاؤ۔"

"کس کا فون تھا؟"

"جی!" وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"تمہارے میاں کا ہو گا کیا کہہ رہا تھا؟" فضل صاحب نے تجسس سے پوچھا۔ ہانیہ نے نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا پھر ایک نظر کمرے میں دوڑائی اس کے والد ہنوز بے ہوش تھے مسز فضل دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھیں۔ باقی بیڈ خالی پڑے تھے کمرے میں صرف وہ دونوں ہی جاگ رہے تھے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ٹال دے مگر فضل صاحب بڑے اشتیاق سے اس کی طرف متوجہ تھے اسے جواب دیتے ہی بنی۔

"جی ان ہی کا تھا ان کی امی بیمار ہیں ان کے پاس جانے کا کہہ رہے تھے۔"

"تو تم نے انکار کر دیا؟" لہجہ کا تجسس برقرار تھا۔

ہانیہ جواب دیتے ہوئے ہچکچائی۔

"جی..... وہ دیکھیں ابو دو ماہ سے بیمار ہیں آپ ان کی حالت دیکھ ہی رہے ہیں۔ میں بھلا انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔"

"صحیح کہا..... بالکل صحیح کہا..... اب میری ثانی کو دیکھ لو دو ہفتے سے بیمار پڑا ہوں ایک دفعہ بھی آئی دیکھنے..... نہیں نا کیوں؟ وجہ وہی ساس۔ اس نے چڑیل کی طرح میری بچی پر قبضہ کر لیا۔ دن بھر اس سے گھر کے کام کراتی ہے جانتی بھی ہے کہ اس کے گھر خوشی ہونے والی ہے مگر اس عورت کے تو گھر کے کام ہی ختم نہیں ہوتے اور وہ اس کا میاں ایک نمبر کا لفنگا ہے بدمعاش' بدذات تمہیں پتا ہے وہ ثانی کو مارتا بھی ہے۔"

"مارتا بھی ہے مگر کیوں؟" ہانیہ کے لہجے میں حیرت در آئی "جب ثانیہ اتنی اچھی ہے تو پھر کیوں مارتا ہے۔"

"بس کمینے آدمی سے کمینے پن کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔" فضل صاحب ایک آہ بھر کے خاموش ہو گئے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

"سارا قصور میرا ہے میں ہی اس کی وجاہت پر مر مٹا' میرا خیال تھا کہ امیر کبیر ہے۔ میری بیٹی کو خوش رکھے گا مگر میں تمہیں بتاؤں اصل چیز ہوتی ہے شرافت کردار انسانیت' ہائے ہائے کیوں میں نے اپنی بچی کی شادی ایک ناقدر شناس آدمی سے کر دی..... میں تمہیں بتاؤں میری بچی وہاں خوش نہیں ہے۔" فضل صاحب کے لہجے میں زمانے بھر کا درد تھا۔

"آپ اس سے فون پر بات کر لیا کریں۔" ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے سو اس نے مشورہ جڑ دیا۔

"لو اور سنو' ارے بے وقوف لڑکی! فون بھی تو اس کی ساس کے قبضے میں ہے وہ بات کرنے دے گی تو کروں گا نا۔" انہوں نے جواب دیتے دیتے کروٹ بدل لی تو ہانیہ وہاں سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

ہانیہ کے والد دو ماہ سے کوما میں تھے ڈاکٹرز پرامید تو نہیں تھے مگر مایوس بھی نہیں تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کبھی ہوش میں آئیں گے بھی کہ نہیں۔ ہانیہ کا شوہر کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا اسی لیے وہ روز رات کو اپنے والد کے پاس ہسپتال میں رک جاتی تھی۔ اس کے دونوں بیٹے ماشاء اللہ سمجھ دار تھے اور میٹرک کے طالب علم تھے پڑوس میں ہی اس کی بہن کا گھر تھا سو وہ بغیر کھٹکے روز رات کو اپنے والد کے پاس آ جاتی دن میں یہ ذمہ داری اس کی دونوں بہنیں وقفے وقفے سے انجام دیتی تھیں۔

فضل صاحب ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی وارڈ میں آئے تھے ان کا جگر خراب ہو گیا تھا۔ ہانیہ بارہا ان کے منہ سے ثانی کا ذکر سن چکی تھی۔ وہ اکثر جب ان کی بیگم سو جاتیں تو ہانیہ کو بلا کر اس سے باتیں کرتے اور یہ باتیں صرف اور صرف ثانی کا ذکر ہوتیں۔ اس کا بچپن' اس کی شرارتیں' اس کی تعلیمی کامیابیاں' اس کے اعزازات ان سب کا ذکر وہ بڑے فخر سے کرتے مگر جوں ہی اس کی شادی اور سسرال کا ذکر آتا وہ آبدیدہ ہو جاتے کبھی کبھی ان کے بے ربط جملوں اور واقعات سے ہانیہ کو ان کی ذہنی صحت بھی مشکوک لگتی تھی وہ دو دنیاؤں میں جی رہے تھے ایک دنیا جو خوشحال اور محبت سے بھرپور تھی اور دوسری دنیا جس میں پچھتاوے اور آنسو تھے۔

کبھی کبھی فضل صاحب کے آنسو ہانیہ کو اپنے دل پہ گرتے ہوئے محسوس ہوتے اور اس کا دل بھی بھر آتا۔ غیر محسوس طریقے سے وہ کبھی اپنی اور ثانی کی ساس کا موازنہ کرنے لگتی تو ہمیشہ ثانی کی ساس کا پلڑا بھاری

ہوتا مگر اس کے باوجود اس کے دل میں اپنے بچوں کی دادی کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

فضل صاحب کی حالت رفتہ رفتہ بگڑتی جارہی تھی۔ وہ نحیف و نزار بوڑھا ہر روز ثانی کا انتظار کرتا اور مایوس ہو جاتا ان کی یہ مایوسی ہانیہ سے چھپی ہوئی نہیں تھی مگر خلاف توقع وہ آج خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا کھلا چہرہ دیکھ کر ہانیہ خود ہی ان کے پاس چلی آئی۔

"کیا بات ہے انکل بہت خوش نظر آرہے ہیں اور یہ آنٹی کہاں ہیں؟" اس نے مسز فضل کو نہ پاکر پوچھا تو وہ مسکرائے۔

"گھر گئی ہے کپڑے بدلنے کے لیے ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔۔۔ میرا سوٹ بھی لیتی آئے گی۔"

"اچھا تب ہی اتنے خوش ہیں۔ آزادی جو ملی ہے۔" ہانیہ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"جیتی رہو۔۔۔ آباد رہو اور سنو گی تو تم بھی خوش ہو جاؤ گی۔ آج ثانی آئی تھی ملنے کے لیے۔"

"واقعی!" ہانیہ حیرت سے اچھل پڑی "کب کس وقت؟ آپ نے اسے روکا کیوں نہیں؟ مجھ سے تو ملوا دیتے۔ پتا ہے اس کی اتنی تعریفیں سن سن کر مجھے تو تھوڑی تھوڑی جلن ہونے لگی ہے اس سے۔" یہ سن کر وہ دوبارہ ہنس پڑے۔

"کل پھر آئے گی اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔"

"ارے آپ ڈسچارج ہو رہے ہیں۔" ہانیہ نے ان کی بات کاٹی "گویا یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

"ارے صبح جاؤں گا ابھی تھوڑی۔۔۔ خیر سے اللہ کرے تم بھی اپنے باوا کو گھر لے جاؤ۔"

"آمین!" ہانیہ نے ان کی دعا پر صدق دل سے کہا "اور یہ تو بتائیں کہ ثانی کو اس کی ساس نے آنے کیسے دیا؟"

اس سے پہلے کہ فضل صاحب کوئی جواب دیتے اس کا موبائل چیخ اٹھا۔ رضوان کا نام دیکھ کر وہ فضل صاحب سے معذرت کرتے ہوئے کوریڈور میں آگئی۔

دونوں کے درمیان پھر تکرار ہونے لگی۔ اس دفعہ تقاضا تھا کہ ہانیہ دونوں بچوں سمیت اس وقت تک ساس کے گھر ٹھہری رہے جب تک کہ وہ صحت یاب نہ ہو جائیں مگر ہانیہ کا دل اپنے باپ میں اٹکا ہوا تھا نتیجتاً" تلخ کلامی بڑھنے لگی۔ ہانیہ کو بڑی دیر بعد احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہی چلا رہی ہے دوسری طرف سے لائن کب کی منقطع ہو چکی تھی۔

اس نے چند ثانیے کوریڈور میں ٹھہر کر اپنے آنسو صاف کیے اور اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کی اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ فضل صاحب کے استفسار پر وہ اپنے آنسو نہ روک سکے گی۔ کچھ دیر ٹہل کر وہ اپنے غصے کو دباتی اور رضوان کی بدتمیزی پر دل کو سمجھاتی رہی دوبارہ جب وہ اندر گئی تو خلاف توقع فضل صاحب سو چکے تھے اور مسز فضل آچکی تھیں۔

وہ خاموشی سے اپنے والد کے نزدیک بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے ان کا سر دبانے لگی۔ اس کے والد ہر احساس سے ماورا آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ وہ اپنی بیٹیوں کی خدمت سے بے نیاز تھے ان کی محبت، دعائیں، آنسو، تڑپ ہر چیز سے بے گانہ۔ سر دباتے دباتے ہانیہ کو رونا آگیا۔ مسز فضل کچھ دیر اسے روتے ہوئے دیکھتی رہیں پھر آکر اس کی کمر سہلانے لگیں۔

"رو و مت اللہ سے دعا کرو وہ تو پتھر میں جان ڈال دیتا ہے تمہاری دعائیں ضرور رنگ لائیں گی۔۔۔ بیٹیوں کی دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

ہانیہ چپ رہی مگر آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

"ہمت کرو۔ مجھے دیکھو میں اکیلی تمہارے انکل کو سنبھال رہی ہوں کہ نہیں۔۔۔ نہ کوئی بیٹا نہ بیٹی اگر تمہاری طرح رونے بیٹھ جاؤں تو پھر انہیں کون دیکھے گا۔"

"میں آپ کی طرح بہادر نہیں ہوں کہ اتنے برے حالات مردانہ وار سہہ سکوں۔" اس کے ذہن میں ثانی کا

نام گونجا اور وہ بے اختیار بول اٹھی۔

انہوں نے ایک لمبی آہ بھری۔ "برے حالات تو کب کے گزر چکے، یہ میرا ہی جگرا تھا کہ ایسی ساس کے دل میں جگہ بنائی جو زمین پر پاؤں نہ رکھتی تھی اللہ بخشے گھر میں کوئی تنگی نہ تھی مگر سویوں کو کھانے سے ترسا رکھا تھا۔ گھر میں مویشی پال رکھے تھے۔ گھر کے کام کے ساتھ ساتھ ان کی خبر گیری بھی میری ذمہ داری تھی۔ تمہیں بتاؤں کہ جب میں بھوک سے بے تاب ہو جاتی تھی تو کبھی دودھ دوہتے دوہتے بھینس کا تھن منہ سے لگا لیتی تھی، یہ جو میری ہڈیوں میں دم خم دیکھ رہی ہو، اسی دودھ کی دین ہے۔"

انہوں نے اپنے نحیف بازو کو کسی باڈی بلڈر کی طرح فخریہ اٹھا کر دکھایا تو ہانیہ کو ہنسی آگئی، آنٹی نے بات جاری رکھی۔

"مگر وہی ساس جب بیمار پڑی تو یقین جانو میں نے ان کی اتنی خدمت کی کہ کوئی بیٹی بھی کیا کرے گی۔ میں جب ان کی نجاست صاف کرلی تو جھولیاں اٹھا اٹھا کر دعائیں دیتی تھیں وہ مجھے اور بس وہ دعائیں ہی کام آرہی ہیں آج تک۔"

"کیا کام آرہی ہیں ان دعاؤں سے آپ کو کیا ملا؟ آپ کی زندگی بھی دکھ بھری تھی اور آپ کی بیٹی کی بھی۔۔۔ مجھے یقین ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے ساس کی خدمت کا ہی درس دیتی ہوں گی۔" ہانیہ منہ بنا کر بولی تو مسز فضل کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنی کبیدہ خاطر کیوں ہو؟ کیوں اپنی ساس سے اتنی نالاں ہو۔ اس بچاری نے ایسا کیا ظلم کر دیا تم پر۔ بس آج تم دل کی بھڑاس نکال ہی لو۔"

ان کی یہ بات سن کر کئی زیادتیاں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں مگر عین اسی لمحے اس پر انکشاف ہوا کہ یہ کتنی فضول باتیں ہیں کتنے بے قیمت شکوے ہیں جنہوں نے اس کے دل میں گھر بنا رکھا ہے کوئی سنتا تو انہیں چٹکی میں اڑا دیتا اس نے خوامخواہ اپنی زندگی کو بوجھل بنا رکھا تھا۔ مگر ایک شکایت ان تمام باتوں پر بھاری تھی اس نے بتانا شروع کیا۔

"میں جب ماں بننے والی تھی تو وہ مجھے چھوڑ کر پندرہ دن کے لیے اپنے بھتیجے کے گھر رہنے چلی گئیں۔۔۔ بتائیے، جانا چاہیے تھا انہیں؟ میں بہت ڈری ہوئی تھی اور مجھے ان کی مدد کی سخت ضرورت تھی مگر انہیں خیال نہ آیا۔ اس موقع پر محلے کی ایک خاتون نے میری مدد کی۔ اب خود کو ٹائیفائیڈ ہوا ہے تو بہو یاد آرہی ہے۔"

یہ سن کر مسز فضل نے بردباری سے سر ہلایا۔

"یہ صحیح ہے کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا انہوں نے جو کچھ کیا۔ وہ پھانس بن کر ابھی تک تمہارے دل میں ہے۔ اس کے بدلے میں جو کچھ تم کرو گی، چاہے اچھا یا برا۔۔۔ وہ بھی ہمیشہ اسے یاد رہیں گی۔ وقت اچھا ہو یا برا گزر ہی جاتا ہے۔ تمہارا گزر گیا تو ان کا بھی گزر ہی جائے گا مگر وہ گرہ جو رشتے میں لگ جائے گی وہ کبھی نہ کھل سکے گی۔ دل بڑا کرو انہیں معاف کر دو۔ خدمت کر کے ان کی دعائیں لو اور اگر بدلہ ہی لینا چاہتی ہو تو انہیں احسان کی مار مارو۔ انہیں شکست نہ دو، ان کا دل جیتو وہ خود بخود ہار جائیں گی۔"

"اپنی ساس کو جیت کر آپ کو کیا ملا؟" ہانیہ نے پھر پوچھا اب اس سوال کا جواب دینا ضروری ہو گیا تھا مسز فضل چند لمحے خاموش رہیں پھر اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

"آج کی نسل لینے دینے پر یقین رکھتی ہے۔ ہر چیز کا بدلہ چاہتی ہے اس کی تو دوستیاں بھی حساب کتاب کے دائرے سے باہر نہیں نکلتیں اسی لیے میں نے تم سے یہ سب کہا۔ میں نے اپنی ساس کی خدمت اپنا فرض اور عبادت سمجھ کر کی تھی۔ سوداگری سمجھ کر نہیں، محبت اور سوداگری میں بڑا فرق ہے۔ میری بچی اگر تم سمجھو تو۔۔۔ سوداگر لین دین کا ہشیاری کا نام ہے اس میں ریاکاری، مکر و فریب، جھوٹ سچ سب چلتا ہے مگر محبت صرف دینے کا نام ہے۔ جزا کی تمنا سے خالی محبت تو مانو ایک ایسی نعمت ہے۔ جس کو بھی مل جائے جس صورت میں بھی ملے اسے لے لینا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ جا بیٹھیں ہانیہ بہت دیر گم صم گو مگو کی

حالت میں بیٹھی رہی مسز فضل تسبیح کے دانے گراتی جا رہی تھیں ان کے لب پروردگار کی ثنا میں مصروف تھے مگر نگاہیں ہانیہ کا طواف کر رہی تھیں بالآخر ہانیہ نے فیصلے پر پہنچ کر موبائل اٹھایا اس کی آواز مسز فضل کے کانوں میں رس گھولتی جا رہی تھی۔

"امی! میں کل بچوں سمیت آ رہی ہوں۔"

"نہیں نہیں رہنے نہیں' آپ کو لینے آ رہی ہوں۔"

"جی جی!"

"جب تک آپ کا دل چاہے۔۔۔"

"مجھے بھی آپ کی ضرورت ہے۔۔۔"

"جی جی۔۔۔ ٹھیک ہے اللہ حافظ۔"

ہانیہ فون بند کر کے مسز فضل کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ انہوں نے دور سے ہاتھ ہلایا مگر ہانیہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ دوڑ کر ان کے پاس پہنچی۔

"مجھے ثانی سے ملنے کا بہت شوق تھا مگر اب کل اس سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اس کا مجھے افسوس رہے گا۔"

"کل؟" مسز فضل کے لہجے میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ مجھے انکل نے بتایا ہے کہ کل ثانی انہیں لینے آئے گی۔" وہ ان کی حیرت دیکھ کر متعجب ہوئی۔

"تمہارے انکل کے ذہن میں ان کے خیالوں میں ثانی ابھی تک زندہ ہے ورنہ اسے تو مرے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔"

"کیا؟" اس دفعہ ہانیہ کی حیرت بھری آواز ابھری۔

"مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ اس کے گھر خوشی ہونے والی ہے۔"

"ہاں اللہ نے میری بچی کو چاند سا بیٹا دیا تھا مگر اس کا نکھٹو شوہر دن بھر پلنگ توڑتا نہ کھانے کی فکر نہ دوا کی۔ بڑے دن میری بچی نے تنگی ترشی میں گزارا کیا مگر بیٹے کی موت نے اسے دیوانہ کر دیا تھا وہ اس کی دوا کے لیے ماری ماری پھری مگر نہ کسی نے مدد کی نہ وہ بچا۔ مجھے تو یہ باتیں اس وقت پتا چلیں جب میں اسے اسپتال دیکھنے گئی۔ وہ اسے ہمارے گھر بھی نہیں آنے دیتا تھا اور میں ہمیشہ یہ سوچ کر چپ رہتی تھی کہ اس کا گھر برباد نہ ہو مگر مجھے کیا پتا تھا کہ اس کی زندگی برباد ہو رہی ہے روز روز کی مار پیٹ۔۔۔ جھگڑا فساد ان سب ہنگاموں میں جنم لینے والی جان ان ہی کی بھینٹ چڑھ گئی غربت' تنگدستی اور جھگڑوں سے تنگ آ کر ثانی نے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور جس دن اس کا سوئم تھا اسی روز اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر آیا۔"

وہ بلا تکان بولتی چلی گئیں اور ہانیہ بدحواس ہو کر سنتی رہی۔

"جب اسے آگ نے جلایا ہو گا تو کیسی تڑپی ہو گی۔۔۔ چیخی ہو گی' روئی ہو گی۔ سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔" وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگیں۔

"وہ جل گئی تھی یا اسے جلایا گیا تھا؟" ہانیہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ اب ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے میری ثانی تو واپس آنے سے رہی۔"

"مگر انکل تو کہہ رہے تھے کہ وہ کل انہیں لینے آئے گی۔" ہانیہ نے اٹک اٹک کر اپنا جملہ مکمل کیا۔

مسز فضل نے کچھ جواب نہ دیا۔ خاموشی سے روتی رہیں پھر اچانک ہی انہیں نجانے کیا خیال آیا کہ ایک جھٹکے سے اٹھیں اور فضل صاحب کی طرف لپکیں ان کی ناک پر اپنا ہاتھ رکھا۔ بدحواس ہو کر ان کے سینے پر اپنے کان رکھے مگر وہاں دھڑکنوں کا شور تھم چکا تھا۔ انتظار ختم ہو گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار ڈاکٹر ڈاکٹر چلاتی ہوئی باہر بھاگیں ہانیہ کے قدم من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہ وہیں دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ ثانی بات کی دھنی نکلی تھی وہ صبح ہونے سے پہلے ہی فضل صاحب کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

پہلے کہاں دلوں میں تعصب کا زہر تھا
یہ شہر پیار اور محبت کا شہر تھا

امن و امان کے ساتھ گزرتے تھے صبح و شام
کوئی عذاب تھا نہ یہاں کوئی قہر تھا

شیرینیٔ خلوص کی ایسی کمی نہ تھی
زم زم محبتوں کا رواں نہر نہر تھا

وہ حوصلہ دیا تھا ہمیں اتحاد نے
طوفان بھی ہمارے لیے ایک لہر تھا

میدانِ کارزار ہے کیوں آج اے شعور
یہ عافیت کدہ جو کبھی رشک دہر تھا

انور شعور

(کراچی کے لیے)

وہ رات' وہ طویل سی اک راہ داری تھی
جو زندگی کے نام پہ ہم نے گزاری تھی

اب جو گزر ہوا تو گلی تھی وہی مگر
کانٹوں کی باڑھ تھی نہ وہ پھولوں کی کیاری تھی

ہم جسم و جاں بچا کے تو لے آئے تھے ضرور
دل پر مگر لگی تھی جو وہ ضرب کاری تھی

دن بھر جہاں کے ظلم و ستم دیکھتے رہے
آنکھوں میں گرچہ رات بھی ہم نے گزاری تھی

وہ دن گراں تھا اہلِ محبت پہ کس قدر
وہ رات کتنی اہلِ تمنا پہ بھاری تھی

اجمل سراج

نظر ثانی

"بیگم! آج میرا دوست ڈنر پر آرہا ہے۔" شوہر نے بیوی سے کہا۔ بیگم سخت برا منہ بنالیتی ہیں۔

"آپ کو پتا ہے' آج ملازمہ چھٹی پر ہے۔ برتن دھونے کے لیے سنک میں پڑے ہیں۔ باتھ روم میں میلے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ منا بھی بیمار ہے اور۔۔۔"

"میں جانتا ہوں' سب جانتا ہوں۔" شوہر نے بیوی کی بات کاٹ کر تحمل سے کہا۔

"دراصل وہ بے وقوف آدمی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اسی لیے اسے ڈنر پر بلایا ہے تاکہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرسکے۔"

صباحت منصور۔۔۔ اسلام آباد

مجبوری

"پندرہ برس تک تصنیف و تالیف کرنے کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ مجھ میں تو لکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لیکن اب میں مجبور ہوں۔۔۔ کیونکہ میں اب مشہور ہوچکا ہوں۔"

ماہین شکیل۔۔۔ لاہور

سودا

"مجھے کسی اور لڑکے سے محبت ہوگئی ہے۔ یہ لو اپنی انگوٹھی۔" لڑکی نے پرانے منگیتر کو انگوٹھی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"اس لڑکے کا نام اور ایڈریس بتانا چاہو گی؟" لڑکے نے غصے سے پوچھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا تم اسے راہ سے ہٹانے کے لیے قتل کروگے؟" لڑکی نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔۔۔" لڑکے نے ایک دم چونک کر جواب دیا۔

"میں تو اسے صرف یہ انگوٹھی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

نازیہ فراز۔۔۔ حیدر آباد

تجربہ

ایک سردار جی کپ میں چمچہ چلاتے' چائے کی چسکی لیتے' برا سا منہ بناتے اور کپ نیچے رکھ دیتے۔ پھر دوبارہ چمچہ ہلاتے' چسکی لیتے اور منہ بنا کر کپ نیچے رکھتے اور پھر یہی عمل شروع کردیتے۔ کئی دفعہ جب وہ یہ عمل دہرا چکے تو چمچہ میز پر پٹخ کر کہنے لگے۔

"تو بھئی دوستو! یہ بات تو آج ثابت ہوگئی کہ اگر چائے میں چینی ڈالی ہی نہ جائے تو لاکھ چمچہ چلائیں۔۔۔ چائے میٹھی ہرگز نہیں ہوسکتی۔"

حنا شاہد۔۔۔ ملیرہالٹ

ناقد

"تم نے تخلیق کے نام پر ایک سطر نہ لکھی' نہ کوئی شعر' پھر تمہیں نامور ادیبوں کی تحریروں پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟"

ایک ابھرتے ہوئے مصنف نے ناقد پر قدرے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"تنقید کرنے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں۔" ناقد نے اطمینان سے کہا۔ "انڈا مرغی تخلیق کرتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے کبھی انڈا نہیں دیا ہوگا۔ لیکن آپ یقیناً" انڈے کے بارے میں مرغی سے زیادہ جانتے ہیں۔"

حمنہ عدنان۔۔۔ گلستان جوہر

شیر دل

دنیا میں شیر دل نوجوانوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر لمحے جائز مقاصد کے لیے لڑنے بھڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان میں بہت سے جواں مرد فوج میں چلے جاتے ہیں اور اعلا مقاصد کے حصول کے لیے سب کچھ داؤ پر لگادیتے ہیں اور پھر باعزت طور پر ریٹائر ہوجاتے ہیں۔ بیشتر شادی کرلیتے ہیں اور آخری سانس تک اس محاذ پر لڑتے رہتے ہیں اور کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔

نورین فیاض۔۔۔ میٹرو ول

سلیپنگ سوٹ

"جلدی سے میرا فشنگ کا سامان تیار کردو۔ میں اپنے باس کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے فشنگ پر جارہا ہوں۔ باس کے کچھ بے تکلف دوست بھی ساتھ ہوں گے۔ بہت اچھا موقع ہوگا۔ میں اپنے پروموشن کی بات کرسکوں گا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا۔ میں سامان اٹھاؤں گا اور نکل جاؤں گا۔ پلیز۔ میرے سارے کام تیار رکھنا اور میرا نیلا سلیپنگ سوٹ بھی یاد سے رکھ دینا۔"

شوہر نے دفتر سے بیوی کو فون کرکے کہا۔ بیوی سعادت مند تھی۔ جیسا کہا گیا' ویسا ہی کردیا۔ ایک ہفتے بعد شوہر خوش و خرم لوٹا تو بیوی نے پوچھا۔

"کیسا رہا ٹرپ؟ خوب مچھلیاں پکڑی ہوں گی۔"

"زبردست یار۔۔۔ ٹراؤٹ کے تو ڈھیر لگ گئے۔ کبھی فرائی کرتے' کبھی پکاتے' بہت مزا آیا' مگر یار۔۔۔ تم نے میرا نیلا سلیپنگ سوٹ نہیں رکھا۔"

"وہ فشنگ والے سامان کے تھیلے میں تھا۔" بیوی نے پیار سے کہا۔ "اسے کھولا ہوتا تو سلیپنگ سوٹ بھی مل جاتا آپ کو۔"

کرن جاوید۔۔۔ ڈھرکی

ایڈریس

ایک صاحب بہت عجلت میں تھے۔ ان کی گاڑی کے بریک بھی خراب تھے۔ کچھ نشے میں بھی تھے۔ لہٰذا ایک مکان کی دیوار توڑ کر اندر جا گھسے۔ گھبرا کر گاڑی سے اترے تو سامنے خاتون خانہ کھڑی تھیں۔ بوکھلاہٹ میں ان سے پوچھ بیٹھے۔ "معاف کیجیے گا میکلوڈ روڈ کہاں ہوگا؟"

"سامنے بیڈ روم میں داخل ہو کر بیڈ کے سرہانے سے دائیں طرف مڑ جائیے گا۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل ہوگی۔ اس کی دائیں ہاتھ پر کچن کی دیوار توڑ کر نکلیں گے تو سامنے میکلوڈ روڈ ہوگا۔"

خاتون خانہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

سحر سہیل۔۔۔ بفرزون

قانون

"میرے گھر میں چور گھس آئے ہیں۔ جلدی کسی کو بھیجو۔" پولیس اسٹیشن پر ایک فون آیا۔

"سب گشت پر گئے ہوئے ہیں۔ کوئی دستیاب نہیں۔" آگے سے جواب موصول ہوا۔ ساتھ ہی ٹھک سے فون بند کردیا گیا۔

"وہ تین ہیں۔۔۔ تینوں ہی مسلح ہیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا ہے۔" چند منٹ بعد اسی کا گھبرایا ہوا دوبارہ فون آیا۔

"اپنے گھر کے دروازے مقفل کرکے اندر چھپے رہو۔ کوئی آیا تو تمہاری طرف بھیج دیا جائے گا۔ اس وقت کوئی نہیں۔" تھانے کا فون اس ہدایت کے بعد دوبارہ بند کردیا گیا۔

"میں مارا جاؤں گا۔ وہ گرل اکھاڑ رہے ہیں۔ کسی بھی لمحے اندر گھس سکتے ہیں۔" تیسری بار اس کا ہانپتے

ہوئے فون آیا۔

"مسہری کے نیچے یا الماری کے پیچھے چھپ جاؤ۔ مزاحمت ہرگز نہ کرنا۔ بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ تھانے میں اس وقت تمہاری مدد کے لیے کوئی دستیاب نہیں۔"

فون پھر بند کردیا گیا۔ چند ثانیے بعد اسی نمبر سے پرسکون انداز میں فون پر کہا گیا۔

"اب کسی کو آنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں نے تینوں کو شوٹ کردیا ہے۔"

اب کی بار جواب سننے کی زحمت ہرگز نہیں کی گئی اور فون خود ہی بند کردیا۔

پندرہ منٹ بعد تین موبائلوں میں بیس سپاہی وہاں جا پہنچے اور تینوں چوروں کے ساتھ اس شخص کو بھی گرفتار کرلیا۔ کیونکہ اس نے جھوٹ بول کر بلاوجہ ان کی دوڑ لگوائی تھی۔

صالحہ نعمان۔۔۔ ضلع گجرات

رازونیاز

"بہت دن بعد نظر آئے' کہاں تھے؟"

"میں اسپتال میں تھا۔"

"اوہ! یہ سن کر افسوس ہوا۔"

"نہیں۔۔۔ افسوس کی کوئی بات نہیں۔ میں نے نرس سے شادی کرلی۔"

"بہت خوب! یہ تو اچھا ہوا۔"

"اچھا کہاں سے ہوا۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ اس کے تین بچے ہیں۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں۔۔۔ ایسا بھی کچھ برا نہیں ہوا۔ اس کے ایک کنوارے ماموں اس کے لیے بہت بڑی کوٹھی چھوڑ کر مرگئے ہیں۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہوگئی۔"

"خاک اچھی بات ہے۔ پچھلے دنوں آگ لگ گئی کوٹھی میں۔۔۔ بالکل تباہ ہوگئی۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں ایسا بھی برا نہیں ہوا۔ میری بیوی بھی اسی کوٹھی میں جل کر مرگئی۔"

"چلو یہ تو اچھا ہوا۔"

"ہاں یہ واقعی اچھا ہوا۔"

سونیا۔۔۔ کراچی

کیا مطلع صاف ہے؟

فون کی گھنٹی بجی۔ بوڑھا شوہر قریب بیٹھا تھا۔ نوجوان بیوی کے اٹھنے سے پہلے اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' دوسری طرف سے ایک سوال کیا گیا۔ بوڑھے شوہر نے تیوریوں پر بل ڈال کر جواب میں کہا۔

"معاف کیجئے گا! یہ سوال آپ محکمہ موسمیات سے کریں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

بیوی نے پوچھا۔ "کون تھا؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "پتا نہیں کون بے وقوف تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ آج شام کو مطلع صاف رہے گا کہ نہیں۔۔۔؟"

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

سادگی

کالج کے ایک پروفیسر کو کسی وجہ سے مکان چھوڑ کر دوسری جگہ فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ فلیٹ چوتھی منزل پر واقع تھا اور لفٹ نہیں تھی۔ مزدور کتابوں کے بنڈل چوتھی منزل پر پہنچاتے پہنچاتے تھک گیا۔ ساتویں پھیرے میں وہ سر پکڑ کر عاجزی سے بولا۔

"پروفیسر صاحب! یہاں منتقل ہونے سے پہلے اگر آپ یہ سب کتابیں پڑھ لیتے تو مجھے اتنی مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔۔۔"

عائمہ عمران۔۔۔ جوہر ٹاؤن

شگفتہ جاہ

یادوں کے جھروکے سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو بندہ باوضو سوتا ہے' پھر رات کو اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ وہ اللہ سے دنیا کے معاملات میں سے یا آخرت کے معاملات میں سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو اللہ اسے وہ چیز دے دیتا ہے۔"

فائدہ:-

باوضو سونا بہت باعث برکت ہے' اس لیے باوضو سونا چاہیے تاکہ رات کو جاگ آئے تو اللہ سے کچھ نہ کچھ مانگ لیا جائے۔ خواہ ہدایت و مغفرت کا سوال کیا جائے یا مرض سے شفا، مصیبت سے نجات اور قرض کی ادائیگی کے لیے دعا کی جائے۔

اہل بیت کا اخلاق،

حضرت سجاد ابن حسینؓ لوگوں میں کھانا تقسیم کررہے تھے۔ قطار میں کھڑے ایک شخص کی باری آئی تو اس نے کہا۔

"کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

حضرت سجاد نے فرمایا۔ "تجھے کیسے بھول سکتا ہوں؟ جب ہم قیدی تھے تو تو نے ہمیں پتھر مارے تھے۔"

اس نے کہا۔ "آپ پھر بھی مجھے کھانا دے رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔ "وہ تیرا سلوک تھا اور اب تو ہمارے در پر آیا ہے۔ یہ ہم اہل بیت کا سلوک ہے۔"

رانیہ شمس۔ گھوٹکی

ذرا غور کیجیے،

- حسد کی انتہا نفرت اور نفرت کی انتہا انتقام ہے۔
- غم کتنا ہی سنگین ہو' نیند سے پہلے تک ہے۔
- اللہ نہایت کریم ہے' اس نے ہمیں بھولنے کی صفت دی کہ ہم غموں اور برے واقعات کو بھول سکیں لیکن ہم اسے ہی بھول بیٹھے۔
- وہ لوگ جن کے پاس بولنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے' وہ عام طور پر مختصر ترین لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔
- عادتیں بے شک آپ کی اپنی ہوتی ہیں مگر آپ دوسروں کے لیے ہوتے ہیں۔
- تعجب ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا ہے اور ان پر بھروسا کرتا ہے۔
- میں اپنے تو سے ایسی یاد کیوں باندھوں کہ بعد میں جس کا بوجھ سر کی چادر ہی کھینچ لے۔

ثمینہ کوثر عطاری، صبا نوشاہی۔ ڈوگہ گجرات

کامیابی،

- مصیبت میں صبر کامیابی کی کنجی ہے۔
(حضرت امام حسینؓ)
- دن کا کام رات پر اور آج کا کام کل پر مت رکھ بلکہ برعکس اس کے کل کی فکر آج کر کہ بجز اس کے بہتری اور کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی۔
(فرینکلن)
- بے حد زیادہ کی امید مت رکھ کم کی امید کرنا اور اسے بھی زیادہ خیال کرنا کامیابی کی چابی ہے۔
(گیٹی)

انکساری

طبقات ناصری یا تاج المآثر میں ایک حکایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا۔
"بنی اسرائیل کے سب سے اچھے اور افضل انسان کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"
حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے سو بہترین آدمی منتخب کر کے لائے جائیں۔
سو آدمی آگئے تو پھر ان سو آدمیوں کو حضرت موسیٰؑ نے ہدایت کی کہ تم لوگ اپنے گروہ میں دس بہترین آدمیوں کا انتخاب کرو۔
انہوں نے دس آدمی منتخب کر لیے، پھر ان دس آدمیوں سے کہا۔
"اب تم لوگ اپنے میں سے تین آدمیوں کو منتخب کرو۔"
تین آدمی منتخب کر لیے گئے تو انہوں نے تین آدمیوں سے کہا۔
"تم صرف ایک آدمی کا انتخاب کرو۔ جو تم میں سب سے اچھا ہو۔"
انہوں نے ایک آدمی منتخب کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے سامنے اس آدمی کو پیش کیا کہ "باری تعالیٰ بنی اسرائیل میں سب سے اچھا یہ ہے۔"
اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اے موسیٰ! اس سے کہو کہ بنی اسرائیل میں سب سے خراب آدمی کو ہمارے حضور میں پیش کرے۔"
حضرت موسیٰ نے اللہ کے حکم کے مطابق اس آدمی کو ایک رسی دی اور کہا۔
"جاؤ، سب سے خراب آدمی کو تلاش کرو اور اس کے گلے میں رسی ڈال کر اسے یہاں لے آؤ۔"
وہ شخص سب سے خراب آدمی کی تلاش میں نکلا اور ایک ایسے شخص کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا جسے سب لوگ بدترین آدمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ بہترین آدمی نے بدترین آدمی کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال دیا۔ راستے میں اچھے آدمی نے اس بدترین آدمی سے اس کی زندگی کے حالات پوچھے تو اس نے اپنے تمام گناہوں اور بداعمالیوں کو یکے بعد دیگرے بیان کر دیا۔
پھر جب دونوں حضرات حضرت موسیٰ کے پاس پہنچے تو اچھا آدمی رسی کا پھندا برے آدمی کی گردن سے نکال کر اپنی گردن میں ڈال چکا تھا۔ اس نے کہا۔
"راستے میں اس نے جتنے برے کاموں کا اعتراف کیا ہے، ان میں بہت سے برے کام مجھ سے بھی سرزد ہوئے ہیں۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدترین یہ نہیں میں ہوں۔"
حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے جب یہ حال بیان کیا تو ارشاد ہوا۔
"ہاں اب یہ شخص جسے تم نے پہلے اچھا آدمی سمجھ کر منتخب کیا تھا۔ واقعی اچھا ہے۔"
نمرہ، اقرا۔ کراچی

دُعا

بخارا میں کسی بڑے عالم یا شیخ الاسلام نے ایک بچے کو بازار سے انگور لانے کے لیے بھیجا۔ اتفاق سے ایک قراضہ (اس وقت کا سکہ) ——— جو بچے کو انگور خریدنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بے خیالی میں کہیں گر گیا۔ بچے پر اپنے مالک کا خوف طاری ہوا اور وہ بے بسی کی حالت میں کھڑا زاروقطار رو رہا تھا۔
اتنے میں سفید داڑھی اور پُرنور چہرہ لیے ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے بچے سے رونے کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں شیخ الاسلام کا زرخرید ہوں۔ میرے ہاتھ سے قراضہ کہیں گر گیا ہے۔ اب میں بغیر انگور لیے جب واپس جاؤں گا تو شیخ الاسلام غضب میں آکر مجھے قتل کر دیں گے۔"
اس زمانے میں غلاموں کو ان کے مالک قتل بھی کر سکتے تھے اور کہیں اور فروخت بھی کر سکتے تھے۔ ان بزرگ نے اپنے دامن سے بچے کے آنسو پونچھے اور اسے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر ایک قراضہ اپنی جیب سے نکال کر اسے دیا تاکہ وہ انگور خرید کر واپس جائے۔
بچہ خوشی خوشی انگور لیے واپس جانے لگا تو ان بزرگ نے اس کو روک کر کہا۔
"جب تم بڑے بادشاہ ہو جانا تو اپنے جیسے بچوں کا خیال رکھنا اور اگر بادشاہ ہو جانا تو درویشوں اور فقیروں کی مدد کرنا۔"
یہ بچہ سن بلوغ کو پہنچ کر فروخت ہوتے ہوتے خراسان پہنچا پھر ہندوستان آکر سلطان التمش کے نام سے بادشاہ ہوا۔
التمش کہتا تھا۔ "میں اسی بزرگ کی دعا کی وجہ سے اس بلند درجہ تک پہنچا ہوں۔"
عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

دو لوگ

زندگی میں دو لوگوں کا بہت خیال رکھنا۔
1۔ ایک وہ جس نے تمہاری جیت کے لیے بہت کچھ ہار دیا، تمہارا باپ۔
2۔ دوسرا وہ جس کی دعاؤں سے تم نے سب کچھ جیت لیا۔ تمہاری ماں۔
طیبہ۔ گوجر خان

غور و فکر

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر بہت بڑی عبادت ہے۔"
☆ حضرت سفیان بن جبیر کا قول ہے۔
"جب آدمی میں غور و فکر کی عادت ہو تو ہر چیز میں اس کے لیے سامان عبرت ہے۔"
☆ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں۔
ایک لمحہ غور و فکر کرنا ایک شب کے قیام سے بہتر ہے۔"
☆ حضرت فضیلؒ کا بیان ہے۔
"فکر ایک آئینہ ہے جو انسان کی اچھائیاں اور برائیاں ظاہر کرتا ہے۔"
☆ حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا گیا کہ آپ اتنا طویل فکر کیوں کرتے ہیں، تو آپ نے جواب دیا۔
"فکر عقل کا جوہر ہے۔"
☆ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں۔
"اللہ کی نعمتوں پر غور کرنے سے انسان اللہ کا شکر ادا کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔"
ارم کمال۔ فیصل آباد

خلیل جبران نے کہا

☆۔ بے شک وہ ہاتھ جو کانٹوں کے تاج بناتے ہیں، ان ہاتھوں سے بہتر ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔
☆۔ جس چیز کا ہمیں اشتیاق ہو اور وہ ہمیں حاصل نہ ہو، وہ ہمارے دل کو اس چیز سے زیادہ محبوب ہوتی ہے، جو ہمیں حاصل ہو۔
☆۔ تمہیں کیا اندیشہ ہے جبکہ فکر تمہارے گھر کی مشرقی دیوار کا ایک نیا روشن دان ہے۔
نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

سخاوت اور انصاف

کسی نے ابوالحسن سیمجور سے دریافت کیا۔
"آپ تیس سال تک خراسان کے سپہ سالار رہے۔ اور کبھی تلوار کو میان سے نکالنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس کے باوجود نہ تو ملک میں کوئی بغاوت رونما ہوئی اور نہ کوئی منحرف ہوا، اس کی کیا وجہ ہے؟"
اس نے کہا۔ "اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ میں نے ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لیا۔ دوسرا یہ کہ سخاوت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور دوست و دشمن کے ساتھ یکساں سلوک کیا۔"
قابل آدمی کو کام مل جاتا ہے تو وہ بغاوت اور سرکشی نہیں کرتا اور کمینے کو منصب ملتا ہے تو اسے بغاوت کی سوجھتی ہے۔ ان دونوں کا علاج صرف احسان و کرم سے ہو سکتا ہے۔"

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

ارم کمال ــــــ فیصل آباد

کس قدر بے ساختہ پن چاہتی ہے زندگی
شاخ سے اڑتا پرندہ دیکھنا تو سوچنا

ثنا سلیم اعوان ــــــ آخون باندی

کیا زمین، کیا آسمان کچھ بھی نہیں
ہم نہ ہوں تو یہ جہاں کچھ بھی نہیں
دیدہ و دل کی رفاقت کے بغیر
فصل گل ہو یا خزاں کچھ بھی نہیں

صدف عمران ــــــ کراچی

ملن کی ساعت کو اس طرح سے امر کیا ہے
تمہاری یادوں کے ساتھ تنہا سفر کیا ہے
گھٹن بڑھی ہے تو پھر اسی کو صدائیں دی ہیں
کہ جس ہوا نے ہر اک شجر کو بے ثمر کیا ہے

ثوبیہ ــــــ اٹک

کتاب زندگی کا میری وہ خوبصورت باب تھا
یوں حرف حرف پڑھا ہے جیسے وہ شخص میرا نصاب تھا
سر راہ مجھے چھوڑ کر وہ کسی اور کے ہمراہ ہو لیا
وہ شخص جسے چاہا میں نے بے حساب تھا

ــــــ کراچی

شہد زندگی کا ملا کرتا ہے تھوڑا تھوڑا
جانے والوں کے لیے کبھی دل تھوڑا نہیں کرتے
غم کے ساحل سے جو بہتا ہے اسے بہنے دو
ایسے دریا کا رخ کبھی موڑا نہیں کرتے

نسبت سنبعہ ــــــ کہروڑ پکا

میری طرح سے ہے کوئی جو اپنی زندگی
تمہاری یاد کے نام انتساب کر دے گا

گڑیا شاہ ــــــ کہروڑ پکا

میں اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پہ بیٹھا ہوں
مجھے مہلت ذرا سی ہے کبھی ملنے چلے آؤ

شمع مسکان ــــــ جام پور

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

یاسمین حقی ــــــ کراچی

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دکھ ہے کہ چہرے دھواں ہمارے ہوئے

ثمینہ کوثر عطاری ــــــ ڈوگہ گجرات

صعوبتوں کے ڈر سے کیوں، آرزوئے وصل بدر ہو جائیں
کیوں کر کے ترک کاوش بازیافت، گرد رہگزر ہو جائیں
میں کاٹ سکوں گا تنہا، نہ تم کاٹ سکو گے تنہا
یہ زیست کے کٹھن راستے، آؤ ہم سفر ہو جائیں

آسیہ جاوید ــــــ علی پور چٹھہ

کب کے چشم سمندر خشک ہو گئے
اک دل ہے جو آج بھی نم رہتا ہے

اقرا آفرین، فائزہ بلال ــــــ جام پور

نہ کچھ رہا جو پاس اپنے تو سنبھال کے رکھ لیے نقد تنہائی
یہ وہ سلطنت ہے، جس کے شاہ بھی ہم، گدا بھی ہم

فوزیہ ثمر بٹ ــــــ گجرات

بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کے کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا
ایک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے وفاداروں کو خفا سوچ کے کرنا

سیدہ نسبت زہرا ــــــ کہروڑ پکا

مٹ گئے حرف غلط کی شکل میں الفاظ سب
آنکھ میں تحریر تھے جو قربتوں کے سلسلے
دل لگی دل کی لگی ہونے کو ہے امجد مگر
ختم ہوتے ہی نہیں یہ فاصلوں کے سلسلے

عذرا ناصر ــــــ کراچی

جب کبھی خود کو سمجھاؤں تو میرا نہیں
مجھ میں کوئی چیخ اٹھتا ہے نہیں ایسا نہیں
کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

عنبرین ضیاء ــــــ لاہور

طے کیا ہے تو کر ہی جانا ہے
دل نے حد سے گزر ہی جانا ہے
ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں
ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے

کوثر ناز ــــــ حیدر آباد

احتیاط بھی لازم ہے دل دنیا سے لگانے میں
مگر یہ کم بخت محبت دیواریں کہاں دیکھتی ہے

عالیہ ــــــ ٹنڈو آدم

جو حقیقت کی راہ پہ چل پڑے انہیں منزلوں نے پناہ دی
جنہیں وسوسوں نے ڈرا دیا، وہ قدم قدم پہ بھٹک گئے

سونیا ــــــ ٹنڈو آدم

نہ بجھا چراغ دیار دل نہ بچھڑنے کا تو ملال کر
تجھے دے گی جینے کا حوصلہ میری یاد دیکھ لے سنبھال کر
یہ بھی کیا کہ ایک ہی شخص کو کبھی سوچنا، کبھی بھول جانا
جو نہ بجھ سکے وہ دیا جلا جو نہ ہو سکے وہ کمال کر

حرا سرفراز ــــــ نامعلوم

غم آرزو میری جستجو میں سمٹ کے آ گیا روبرو
یہ سکوت مرگ ہے کس لیے میں جواب دوں تو سوال کر
میرے درد کا، میرے ضبط کا، میری بے بسی میرے صبر کا
جو یقین نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

نخبہ اکرم ــــــ گاؤں کوٹ نیگی

ہمارے پاؤں الٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

نادیہ ــــــ لاہور

سنو کوئی بھی بات بری نہیں ہوتی
بس لہجے تکلیف دیتے ہیں

ماروی ــــــ سکھر

نہ گلہ ہے کوئی حالات سے، نہ شکایتیں کسی کی ذات سے
خود ہی سارے ورق جدا ہو رہے ہیں میری زندگی کی کتاب سے

نوشی گیلانی ــــــ گاؤں بدھ مرجان

لفظ تاثیر سے بنتے ہیں تلفظ سے نہیں
اہل دل آج بھی ہیں اہل زباں سے آگے

عائشہ خان ــــــ ٹنڈو محمد خان

ہمیں خبر ہے دشمن کے سب ٹھکانوں کی
شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے

اریبہ ساجد ــــــ تھوہا راجگان

یوں ہی رنجشوں میں گزر گئے کبھی وہ خفا کبھی میں خفا
چاہتوں کے موڑ پر کبھی وہ رکا کبھی میں رکا
وہی رنجشیں وہی چاہتیں نہ اسے خبر نہ مجھے پتا
ہم اپنی اپنی انا میں گم کبھی وہ جدا کبھی میں جدا

نمرہ، اقرا ــــــ کراچی

میں کیوں نہ ترک تعلق کی ابتدا کرتا
وہ دور دیس کا باسی تھا کیا وفا کرتا
وہ میرے ضبط کا اندازہ کرنے آیا تھا
میں ہنس کے زخم نہ کھاتا تو اور کیا کرتا

حافظ سمیرا ــــــ 157 - ای بی

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گرد و غبار عہد ستم اور کتنی دیر
شام آ رہی ہے ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

سدرہ شاہین ــــــ خانیوال

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

فائزہ ــــــ کراچی

میں آبلہ پا دھوپ کے صحرا کا مسافر
سائے کا بھی احسان اٹھا کر نہیں رکھا

فرزانہ مغل ــــــ واہ کینٹ

امید کا باب لکھ رہا ہوں
پتھر پہ گلاب لکھ رہا ہوں
صحرا میں وفور تشنگی سے
سائے کو سحاب لکھ رہا ہوں

گل صفہ سہیل

زوال

ماضی کی خوب صورت اداکارہ بابرہ شریف نے کہا ہے کہ "وہ فلم انڈسٹری کے موجودہ حالات سے مایوس نہیں، مجھے یقین ہے کہ بہت جلد فلم انڈسٹری کی رونقیں بحال ہوجائیں گی۔ فلم انڈسٹری میں پروفیشنلزم آجائے تو کوئی شک نہیں کہ ہماری انڈسٹری دوبارہ عروج حاصل نہ کرسکے۔ انڈسٹری میں زوال کہیں باہر سے نہیں آیا بلکہ انڈسٹری سے وابستہ لوگ ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔" (ان میں کیا آپ بھی شامل ہیں بابرہ۔؟)

اعتراف

لاہور گھرانے کے معروف گٹارسٹ طافو کا نام ان کی چالیس سالہ خدمات کے اعتراف کے طور پر الحمرا آرٹس کونسل لاہور کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ کے لیے بھیجا گیا ہے۔ سجاد طافو کہتے ہیں کہ "پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ ان لوگوں کو ملنا چاہیے جنھوں نے واقعی کام کیا ہو۔ اداکارہ میرا کو غلط ایوارڈ ملا ہے۔ یہ ایوارڈ رانی، زیبا، سنگیتا جیسی اداکاراؤں کو ملنا چاہیے جس دن سے ہمارے ملک میں مولا جٹ اور وحشی جٹ جیسی فلمیں بننا شروع ہوئیں اسی وقت سے ہماری فلم کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں اور میرے گھرانے کے لوگوں نے ان فلموں میں بھی موسیقی دی ہے جنھوں نے فلم انڈسٹری کے زوال میں حصہ ڈالا ہے، لیکن ہمارا کام صرف میوزک کی حد تک تھا۔ سُر آج بھی سچا ہے اور کل بھی سچا تھا۔ صرف شاعری اور پرفارمنس نے ماحول کا بیڑہ غرق کیا ہے۔ میں کئی مرتبہ فلم ڈائریکٹرز سے کہا کرتا تھا کہ ہم ایسی فلمیں کیوں بنارہے ہیں جن کو صرف چند لوگ دیکھتے ہیں ہمیں کلاسک سوچ کے ساتھ کام کرنا چاہیے، لیکن سب اپنی دھن میں مگن تھے۔"

سفیر

ہمارے ملک کے لوگ باتیں بنانے میں بڑے ماہر ہیں، کچھ کریں نہ کریں بڑی بڑی باتیں خوب کرتے ہیں اب حمیمہ ملک کو ہی دیکھ لیں۔ کہتی ہیں کہ "شوبز میں کافی عرصے سے کام کررہی ہوں (کیا کام۔۔؟) لیکن اب باقاعدہ طور پر فلاحی کام کرنے کا ارادہ ہے۔ ابھی حال ہی میں مجھے W-W-F کا سفیر بھی بنایا گیا ہے جو کہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے (یقیناً "۔۔!) مختلف برانڈز کی سفیر تو میں پہلے ہی تھی۔ اب اس ادارے کے لیے بھی کام کروں گی۔ (لیکن W-W-F کے لیے حمیمہ ملک کیا کریں گی۔۔؟)

اعزاز

فلم ٹائی ٹینک کے موسیقار جیمز ہارنر پاکستانی قوال شیر میانداد پر فدا ہوگئے ہیں۔ ایک شو کے دوران جیمز ہارنر نے جب شیر میانداد کو سنا تو ان کی پرفارمنس کی بہت تعریف کی اور فوری طور پر انہیں اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کردی اور شیر میانداد نے اسے قبول بھی کرلیا۔ (پاکستانی ایسے موقعے کبھی ضائع نہیں کرتے۔) اب شیر میانداد امریکا میں جیمز ہارنر کی فلم میں الاپ سرگم ریکارڈ کروائیں گے۔ جیمز ہارنر نے شیر میانداد کو امریکا میں ایک گھر اور گاڑی کی آفر بھی دی (صرف آفر دی۔۔؟)

شیر میانداد نے بتایا کہ "میں اور میرے بڑے بھائی بدر میانداد نے اپنے بڑوں کے مشن کو آگے بڑھایا، میرے والد استاد میانداد خان کو قوالوں کی نور جہاں اور لتا کا لقب دیا گیا۔ مجھ پر بھی اللہ کا یہ کرم ہے کہ میں نے قوالی کی جدت دینے کی کوشش کی ہے۔"

شان سے

اداکار و ہدایت کار شان نے اپنی فلم ارتھ ٹو کے لیے ہمایوں سعید کو بھی سائن کرلیا ہے۔ پرویز کلیم کے لکھے ہوئے اسکرپٹ کو سن کر ہمایوں بھی اس فلم میں کام کرنے پر رضامند ہوگئے ہیں۔ فلم کا اسکرپٹ لکھنے والے پرویز کلیم کا کہنا ہے کہ ہمایوں سعید اور شان پہلی مرتبہ کسی فلم میں اکٹھے کام کررہے ہیں جو ان کے پرستاروں کے لیے خوش خبری ہے، فلم کی دیگر کاسٹ میں حمیمہ ملک اور عظمیٰ حسن خان بھی شامل ہیں۔

پرویز کلیم کا کہنا ہے کہ یہ عالمی معیار کی فلم ہے۔ جس کی عکس بندی اپریل کے آخر تک شروع ہونے کے امکانات ہیں۔

سفارش

نازک اندام اداکارہ جیا علی کا کہنا ہے کہ میں نے ہمیشہ محنت پر یقین رکھا ہے، سفارش پر نہیں، سفارش

وہی لوگ کرواتے ہیں جنہیں کچھ آتا نہیں' (لیکن جیا جہاں پر کام ہی سفارش پر ہوتا ہو وہاں آپ کیا کہیں گی؟) یا پھر ان کے اندر خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے پر میری اداکاری کے کیریر میں کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں میں نے سفارش سے کام کیا ہو (صرف اداکاری کے کیریر میں باقی۔۔۔؟) جیا نے مزید کہا کہ آج کل فلموں میں مصروفیت کی وجہ سے زیادہ تر وقت شوٹنگز میں گزرتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ کئی کئی دن تک گھر والوں سے بھی ملنا نہیں ہوتا۔"

انگور کھٹے۔۔

سعدیہ امام جو شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ جرمنی چلی گئی تھیں ان دنوں کراچی آئی ہوئی ہیں (لیکن کسی مارننگ شو میں تو دکھائی نہیں دیں۔) سعدیہ امام کا کہنا ہے کہ ان کا فی الحال ڈراموں میں کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ (سعدیہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کو ڈراموں سے آؤٹ کیا گیا تب ہی آپ نے شادی کی تھی۔) دوستوں اور عزیزوں سے ملنے پاکستان

آئی ہوں' ڈراموں کی آفرز تو ہر اداکارہ کو ملتی ہے (صرف آفر یا۔۔؟) مجھے بھی مل رہی ہے تاہم میں سب پر یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میرا ڈراموں میں کام کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ (ویسے یہ سب کون ہیں؟) یہ تاثر بھی غلط ہے کہ ذاتی پروڈکشن کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہوں (ورنہ اسی میں چانس لگ جاتا۔) سعدیہ چند روز میں واپس جرمنی چلی جائیں گی۔ (ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ ہمارا میڈیا جس میں رپورٹ ہوتا رہتا ہے کہ ایک پیر ایوان صدر کی دعوت میں صحافیوں کو یہ بتاتا پھرتا ہے کہ صدر صاحب نے میرے علم کے باعث پانچ سال پورے کیے ہیں تو پھر اس پیر کی خدمات کیوں نہیں لی جائیں گی۔ اس طرح ملک میں پیروں اور عاملوں کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

(آواز حق۔۔۔ اعجاز منگی)

☆ بھارتی ریاست بہار کے ضلع پورنیا میں واقع ایک گاؤں ایسا بھی ہے جس کا نام "پاکستان" ہے۔ لیکن یہاں نہ کوئی مسلمان ہے نہ مسجد' 50 گھرانوں پر مشتمل اس گاؤں کا نام پاکستان اس لئے ٹھہرا کہ اعلان آزادی کے بعد جب مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کی تو اپنے گھر' زمینیں اور کھیت گاؤں کے غریب ہندوؤں کو سونپ گئے تھے۔ یہ منظر اس قدر رقت انگیز تھا کہ یہاں کے ہندوؤں نے ان مسلمانوں کی یاد میں اس گاؤں کا نام "پاکستان" رکھ دیا۔ (امت)

☆ فروغ نسیم کہتے ہیں کہ صرف ایک شخص کا ٹرائل عالمی قانون کی خلاف ورزی ہے' بنگلہ دیش میں مارشل لاء لگانے والے جنرل حسین ارشاد کو سزا دی گئی تو کیا وہ صرف ایک شخص کا ٹرائل نہیں تھا۔۔۔؟

(جسارت)

شعاع کے ساتھ

ادارہ

رابعہ تبسم۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

شعاع سے وابستگی کو زمانہ بیت گیا۔ پرانی بات ہے۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال پہلے اپنی فرینڈ کے بیگ سے چرا کر پڑھا۔ کہ مانگنے پر وہ ہرگز نہ دیتی یہ الگ بات تھی اگلے کئی دن وہ ہم سے خفا رہی۔ خیر دوست تھی مان گئی۔ پر دوبارہ کبھی شعاع اسکول نہ لائی کہ اس کی آپی نے کڑی نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ کچھ عرصہ یونہی ادھر ادھر سے لے کر پڑھا۔ میٹرک کے بعد اپنا خریدنا شروع کر دیا۔ پڑھنے سے منع کبھی کسی نے نہ کیا کیونکہ امی اور ابو جی دونوں ہی مطالعہ کے شوقین ہیں۔ سو ہمارے مزے ہیں۔

لیکن پہلے پڑھنے کے لئے ہم دونوں بہنوں میں ہر بار جنگ عظیم ہوتی ہے۔ سیز فائر کوئی نہیں کرواتا کہ گھر والے عادی ہو چکے ہیں۔ ارم چونکہ زیادہ تر فارغ ہوتی ہے سو اس کا قبضہ مسلم ہے۔

2 دن کا آغاز ہر اچھے مسلمان کی طرح نماز فجر اور تلاوت قرآن پاک سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ناشتے کی تیاری شروع' چونکہ ناشتہ بنانے کی ذمہ داری میری ہے (ہمیشہ سے) اس لیے دوبارہ سونے کی حسرت دل میں دبائے کچن کو شرف بخشا جاتا ہے۔ سب کو ان کی پسند کے مطابق ناشتہ دینے کے بعد خود ناشتہ کرتی ہوں۔ چائے کا کپ اور نیوز اکٹھا ہی چلتے ہیں۔ کیونکہ ابو جی ناشتہ کے بعد نیوز ضرور سنتے ہیں۔ مجبوراً ''ہمیں بھی زہر مار کرنی پڑتی ہیں۔

ابو جی کے جانے کے بعد چینل سرچ کرتی ہوں اور امی کی ڈانٹ کھاتی ہوں بہت مزے کی ہوتی ہے یقین جانئے کیونکہ انہیں بھی نیوز سننے کا کریز ہے۔ "ارے ارے دیکھنے تو دو' کہاں دھماکا ہو گیا۔ عدالت نے کیا فیصلہ کیا۔۔۔ پر ہم نہ سنتے ہیں' نہ ہی دیکھتے ہیں۔ تقریباً" دس منٹ کی چینل خواری کے بعد ریموٹ امی کے ہاتھ میں تھما کر کام کے لیے کمر کس لیتے ہیں۔ ارم کچن سمیٹتی ہے اور میں صفائی وغیرہ نمٹاتی ہوں۔ اس کے بعد ہمارا پیارا شعاع' خواتین پلس کھینچا تانی۔ ایک دو گھنٹے ایسے ہی گزرتے ہیں۔

اس کے بعد میں اور امی دوپہر کا کھانا تیار کرتے ہیں۔ کھانے کے بعد لمبی نیند (گرمیوں میں) میرا اور ارم کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

عصر کی نماز کے بعد چائے اور اس کے ساتھ کوئی کتاب اس کے بعد رات کے کھانے کی تیاری اور کہانیوں پر تبصرے اس میں امی بھی شامل ہوتی ہے۔ رات میں دونوں بہنیں پیار اور محبت کی اعلا مثال قائم کرتے ہوئے ریموٹ پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ آٹھ بجے کا ڈراما گھر والے ہزار مخالفت کے باوجود دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نو بجے ریموٹ پر سے ہمارا تسلط ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد نماز پڑھتے ہیں۔ بستر لگانے کے بعد کچن سمیٹنا اور سونے کی تیاری۔ بس جی دن ختم۔

4 خوبیوں' خامیوں کے لیے سب سے پہلے بھائی سے رجوع کیا۔ اس کے بقول' تمہیں اللہ پر بہت یقین ہے۔ زیادہ دیر ناراض نہیں رہتی ہو' جلدی مان جاتی ہو۔ خامیاں' غصہ زیادہ کرتی ہو۔ جلدی یقین کر لیتی ہو تھوڑی سی جلد باز ہو۔

ارم کا کہنا ہے تم پلاؤ مزے کا بناتی ہو صفائی دل لگا کے کرتی ہو۔ میرے بہت سے کام کر دیتی ہو۔ ہر بات پہ رونے لگتی ہو۔ غصہ بہت کرتی ہو۔ کوئی پیار سے کہہ دے تو پہاڑ توڑنے پر رضامند۔۔ ہو جاتی ہو۔ دل صاف رکھتی ہو۔ (خوبیاں خامیاں آپ خود الگ کرلیں) امی کا کہنا ہے۔ میری سب سے پیاری بیٹی ہو' برداشت اور صبر سے کام لیتی ہو' نماز کی پابند ہو' سگھڑ ہو (آہم) باذوق ہو' باادب ہو (واہ جی) اور خامی یہ کہ غصہ زیادہ کرتی ہو۔

خود تجزیہ کروں تو میں ضدی بالکل نہیں۔ انا پرست نہیں' کینہ اور حسد نہیں پالتی دل میں۔ باقی ہر انسان خوبیوں خامیوں کا مجموعہ ہے۔ پرفیکٹ تو کوئی بھی نہیں۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے مسرت الطاف احمد کا ہے لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا مریم عزیز کا مکمل ناول "تعبیر" بالکل متاثر کن تحریر نہیں تھی، فہد کی تعبیر کے لیے پسندیدگی ایک آنکھ نہیں بھائی جو بھی تھا ثمرین اس کی کزن تھی وہ اسے بچپن سے دیکھتا آرہا تھا اور ثمرین پر بھی بہت غصہ آیا فہد کے انکار کرنے کے باوجود اسی سے شادی کی خواہش کو ظاہر کرنا اپنی ہی ذات کی تذلیل کرنا لگا۔ آسیہ رزاقی کا ناولٹ "بڑی آزمائش" بہت ہی فینٹاسٹک تحریر تھی آسیہ جی نے بہت ہی اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ یہ ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقت ہے۔ لوگ پیر فقیروں کے چکر میں اپنا ایمان تک بیچ دیتے ہیں اور ان کا اللہ پر بھروسہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ "کون جیتا کون ہارا" یہ ناول سپرہٹ رہا اس ناول نے اسٹارٹ سے ہی مجھے اپنے سحر میں لے لیا مجھے منابل کا حساس اور معصوم کردار بہت پسند آیا لیکن اسے بہت مختصر لکھا گیا قندیل کے رویے پر افسوس کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ مرتے مرتے بھی صندل کے دل میں سمیع کے لیے بدگمانی پیدا کر دی۔ "محبت کب سمجھتی ہے" بہت انٹرسٹنگ تحریر تھی صبغہ کا راحم جیسے مغرور اور اکھڑ مزاج شخص کو دوبدو جواب دینا بہت مزا آیا افسانوں میں نیلا گلاب، بہت زبردست تحریر تھی بہت ہی متاثر کن۔

ج : پیاری مسرت! آپ نے تین ماہ بعد شرکت کی۔ بہت اچھا لگا اور آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہمیں آپ کی کمی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ ہماری مستقل قارئین جو ہر ماہ شرکت کرتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے خط نہ لکھ سکیں تو ہمیں نہ صرف ان کی کمی محسوس ہوتی ہے بلکہ تشویش بھی ہوتی ہے۔
شعاع کے ساتھ ساتھ کے لیے آپ اپنا تعارف دوبارہ بھجوائیں اور مزید بہتر لکھیں۔ پچھلے تعارف میں کچھ کمی سی محسوس ہوئی تھی۔
4 مئی کو آپ کی سالگرہ ہے۔ دلی مبارک باد اور دعائیں۔

نادیہ عباس دیا اور آورش نایاب موسیٰ خیل سے لکھتی ہیں

مجھے جس کہانی نے لکھنے پہ مجبور کیا وہ ہے "تعبیر" ہاں جی مریم عزیز کی کہانی تعبیر سب سے پہلے ہی پڑھی اور بہت جوش و خروش سے پڑھتی رہی لیکن جب اینڈ پہ پہنچی تو یہ کیا آئندہ ماہ منہ چڑا رہا تھا غصے سے لائٹ بند کر کے رضائی میں گھس گئی۔ باقی رسالہ بعد میں پڑھا "بڑی آزمائش"، "شکستہ آئینے" اور "کون جیتا ہے" بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

ج : پیاری نادیہ اور آورش! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ باقی آئندہ دیکھ کر آپ کو غصہ آیا۔ حق بجانب ہیں آپ۔ قسط وار کہانیاں ہمیں بھی پسند نہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہماری بیشتر مصنفین طویل تحریریں ہی لکھتی ہیں۔ جو ایک قسط میں شائع نہیں ہو سکتیں۔
کہانیاں ضرور بھجوائیں اور شادی کا احوال بھی۔ شائع ہوں گی یا نہیں؟ یہ بات ہم پڑھے بغیر کیسے بتا سکتے ہیں۔

نوال افضل گھمن گجرات سے شریک محفل ہیں

ماڈل گرل کو دیکھ کر بے اختیار فنکارہ سیمی زیدی شدت سے یاد آئیں۔ خط کافی عرصہ بعد لکھا کیونکہ میرے بیٹے محمد طٰہ ابراہیم کی پیدائش سے روٹین لائف تھوڑی نہیں بلکہ کافی حد تک تنگ ہو گئی ہے۔ لوگ الگ الگ، ٹمپرامنٹ علیحدہ علیحدہ نئی جگہ ــــ اور پھر نوکری، ملازمت کے مسائل الگ ــــ خیر شعاع اور خواتین سے تعلق مسلسل قائم ہے ــــ پلیز تین چار ماہ سے شاعری والا صفحہ نہیں مل رہا۔ اس طرح نہ کریں ــــ ڈائجسٹ معیاری ہی رہنے دیں۔ شعاع میں ایک صفحہ شادی شدہ خواتین کے لیے اور شادی سے منسلک اسپیشلی پریگننسی سے متعلقہ مشورے وغیرہ کا حصہ ضرور ہونا چاہیے۔

ج : پیاری نوال! طٰہ ابراہیم کے لیے دعائیں اور آپ کو دلی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشی اور خوش نصیبی عطا فرمائے، آمین۔ شاعری کا صفحہ بڑھا دیں گے۔ شادی شدہ خواتین کے لیے آپ کی تجویز اچھی ہے۔ عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

لاہور سے زہرا تنویر نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین میں ہر تحریر اپنے اندر کوئی نہ کوئی سبق لیے ہوتی ہے، چاہے وہ سبق کسی کردار کے ذریعے ملے یا پھر رائٹر کی بیان کی ہوئی سوچ اور نصیحتوں سے۔ زمین کے آنسو نگہت سیما کی لاجواب تحریر ہے۔ زمین کس کس کرب پر کراہتی ہے۔ اس کا اندازہ شاید کوئی نہ کر سکے۔ جیسے آج کل تھر کی زمین کراہتی ہے۔ پیاس سے، بھوک سے مگر کوئی بھی اس زمین کے آنسو نہ دیکھتا ہے اور نہ ہی مرہم کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ہم اتنی بے حس قوم تو نہیں کہ چپ چاپ تماشا دیکھیں۔ وہ ولولہ اور جوش تھر کے لیے ناپید ہے جو انڈیا اور پاکستان کے کرکٹ میچ کے روز دکھائی دیتا ہے۔
اس دفعہ کا شمارہ بھی لاجواب تھا۔ آسیہ رزاقی نے پیروں کی مرید، آپا کا کردار بہت اعلیٰ تحریر کیا۔ جب ہمارا اصل ہی ہم سے دور ہے پھر یہ پیر تو اپنے کاروبار چمکائیں گے ہی۔ افسانے اس دفعہ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے "نیلا گلاب" ــــ سنیعہ عمر نے بہت اچھا لکھا۔ وائرہ بہت سبق آموز تحریر تھی۔

ج : پیاری زہرا! آپ نے صحیح لکھا، پاکستانی قوم بے حس نہیں ہے کراچی میں بے شمار خیراتی ادارے ہیں۔ جو لوگوں کو کھانا، کپڑا مہیا کرتے ہیں خیراتی ہسپتال بھی ہیں جہاں مفت علاج کی سہولت مہیا ہے پاکستان کے دیگر علاقوں میں بھی حالات اتنے خراب نہیں، نہ جانے کیوں تھر کے معاملے میں یہ بے حسی کا رویہ ہے۔ تھر ہی نہیں سندھ کے بیشتر علاقے اسی پسماندگی کا شکار ہیں۔ سندھ کے لوگوں کو اپنے منتخب نمائندوں سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ ان کے ساتھ یہ بے حسی کا رویہ کیوں ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

عائشہ مقبول نے سرگودھا سے لکھا ہے

ٹائٹل بے طرح بھایا پہلی شعاع سے ہوتے ہوئے حمد و نعت سے دل ودماغ کو منور ہوتے پایا۔
"رقص بسمل" میں وہی مبہم سے کردار، پھر بھی اچھا جا رہا ہے نبیلہ جی پلیز، تھوڑا زیادہ لکھا کریں "ایک تھی مشال" "نہ پا کر دل نادان کو بالکل اچھا نہیں لگا" "بت شکن" پر نظر عنایت کی (اہم) کرداروں کے حالات و واقعات خوب صورتی سے واضح ہو رہے ہیں نازنین کا رویہ سب کے ساتھ (پوری کہانی میں) سمجھ سے باہر رہا۔ سسرال میں ناپسندیدگی و مشکلات بہت سارے لوگوں کو پیش آتی ہیں۔ مگر ایسا ردعمل ــــ رامین کا کردار بہت اچھا ہے اس کا مورتیاں مجسمے اور نیوڈ پینٹنگز وغیرہ جلا کر خاک کرنے کے عمل نے دل ودماغ کو عجیب سی طمانیت بخشی "مریم عزیز" نے ہمیشہ کی طرح خوب لکھا تبصرہ آخری قسط تک موخر کرتے ہیں (ٹھیک؟) آسیہ جی اپنے ازلی منفرد انداز میں بہت بڑی بات سمجھا گئیں۔ فرحین اظفر اور حنا یاسمین نے بھی بہترین لکھا۔ افسانے تمام اے ون تھے پر "شکستہ آئینے" سبق دے گیا اور نمرہ احمد کے ناول مصحف کی ہیروئین محمل کے نام کا مطلب بتا دیں پلیز۔

ج : پیاری عائشہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔
محمل ایک قسم کی ڈولی کو کہتے ہیں جو اونٹ پر باندھی جاتی ہے۔ اسے ہودہ بھی کہا جاتا ہے۔ اونٹ پر سواری کے لیے عموماً خواتین اس میں بیٹھتی ہیں۔ نبیلہ عزیز تک آپ کی فرمائش پہنچائی جا رہی ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اس ناول کے صفحات زیادہ ہونے سے ناول کی دلچسپی

میں اضافہ ہوگا۔

امامہ خان کے ناول میں نازنین کا کردار ان لوگوں کی عکاسی کرتا ہے، جو منفی ذہن رکھتے ہیں۔ وہ جب والدین کے گھر میں تھی تب بھی اس کا بہن بھائیوں کے ساتھ یہی رویہ تھا۔ سسرال والوں کی تنقید نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور کریلا اوپر سے نیم چڑھا والا معاملہ ہوگیا۔

ثناء اقبال اسلام آباد سے لکھتی ہیں

سرورق پسند آیا۔ "بت شکن" کی اس ماہ کی قسط ہمیشہ کی طرح زبردست تھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ یمین رضا کا افسانہ پسند آیا۔

ج : جی ثناء! مارچ کے خواتین پر بھی شمارہ تھی لیکن مختلف انداز اور لباس میں۔ شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ "امامہ خان اور ایمل رضا تک آپ کی تعریف پہنچائی جارہی ہے۔ جی ہاں۔ افسانہ دائرہ ایمل رضا نے لکھا تھا۔ سہوا" یمین رضا لکھا گیا۔

فرحی ارمان اور طیبہ وسیم مکھانہ گجرات سے شریک محفل ہیں

پہلی شعاع پڑھی اگر حکومت کچھ نہیں کررہی تو ہم لوگ ہی حتی المقدور تھر والوں کی مدد کردیں۔ میڈیا منٹ منٹ بعد یہ اطلاع دیتا ہے کہ تھر کے قحط زدہ دو بچے مر گئے اور اب دو کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لیکن یہ نہیں کہتا کہ آج اس ٹی وی چینل نے ان کی مدد کی۔ یا پانی اور اناج دیا۔

٭ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ اگر کسی شادی کا احوال بھیجنا ہو تو تصویر ساتھ بھیجنا لازمی ہے کیا؟ دستک میں اگر آمنہ کے ساتھ ان کے ہزبینڈ کا بھی انٹرویو ہوجاتا تو کیا بات تھی۔ "خط آپ کے" میں سب سے پہلے فوزو (فوزیہ ثمر) کا خط پڑھا۔ بہت اچھا اور جامع تبصرہ لکھتی ہیں۔ طلعت خان (کوٹ فضلا) بھی شریک محفل تھیں۔ اچھا لگا۔ انیقہ جی آپ نے اب ریگولر حاضری لگائی ہے۔ شمع مسکان کہاں ہو۔ فوزیہ سے رابطہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

نبیلہ عزیز کے "رقص بسمل" پر ماورا کی تو کیا ہی بات ہے بقول شخصے! پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ میمونہ صدف کا "شکستہ آئینے" بہت زبردست تھا۔ ناول "بڑی آزمائش" رائٹر (آسیہ رزاقی) واہ واہ۔ آج کے دور میں تعویذ گنڈوں اور پیروں فقیروں کے پاس جانے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ آسیہ صاحبہ نے اس پہلو پر لکھا۔ اچھا لگا۔ پارے کے ساتھ انصاف ہوا۔ ارم کا انجام اس طرح ہی ہونا چاہیے تھا۔ سعدیہ عزیز آفریدی آپ کا افسانہ "پلڑا" بے یقینی کی کیفیت لیے رہا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کو اپنا کہنے سے انکاری ہوجائے۔ امیا سبل "فرحین اظفر کی اسٹوری" "کون جیتا ہے کون ہارا ہے" الجھنوں سے بھری تحریر، ثمرہ بخاری آپ شاید ناراض ہیں ہم سے بھی اور شبلی جوادی سے بھی "امامہ خان" کا ناولٹ (بت شکن) اس ماہ کی بیسٹ تحریر۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس قسط کی تعریف کروں۔ نازنین کے ساتھ برا ہوا۔ شکر ہے زین تو ملا۔ لیکن مہرز کا ذکر گول کر گئیں آپ امامہ؟

سنیعہ عمر کی شمارے سے باہر جھانکتی تحریر نیلا گلاب بے شک اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ حنا یاسمین کی تحریر "محبت کب سمجھتی ہے" اچھوتی تحریر، لیکن ایک دم سے منگنی توڑنے والی بات ہضم نہیں ہوئی۔ "دائرہ" سارے شمارے کا حاصل۔ یمین رضا کی بہت ہی اچھی کاوش۔ باقی مجموعی طور پر شمارہ عمدہ رہا۔ اگر گول گپوں کی ترکیب دے دیں تو نوازش ہوگی۔

فرحی! 16 مئی کو آپ کا جنم دن ہے۔ مبارک باد اور دعائیں۔

شعاع پر تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سارہ خان نے کلور کوٹ ضلع بھکر سے لکھا ہے

معذرت کے ساتھ ٹائیٹل پسند نہیں آیا۔ اب کی بار بلیک کلر کا ٹائیٹل دیں۔ امامہ خان کا بت شکن بہت زبردست جارہا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے یہ تحریر، نبیلہ جی کا رقص بسمل اور رخسانہ جی کا ایک تھی مثال بھی اچھی تحریریں ہیں بس ذرا سستی کا شکار ہیں ان کی رفتار بڑھائیے اور صفحات بھی۔ حنا یاسمین کا ناولٹ پسند نہیں آیا۔ آسیہ رزاقی کا بڑی آزمائش اور میمونہ صدف کا افسانہ شکستہ آئینہ پسند آئے۔ خط لکھنے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ آپی مجھے کچھ ناولز منگوانے ہیں۔

پیاری سارہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کو ٹائیٹل اچھا نہیں لگا۔ اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

ناول منگوانے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کرکے قیمت اور دیگر تمام معلومات حاصل کرسکتی ہیں۔ 2735021-021۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

آمنہ اجالا نے ڈھرکی سے لکھا ہے

ٹائٹل اس بار بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ فہرست میں خلاف توقع اس بار اپنی فیورٹ رائٹر مریم عزیز کا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی لیکن اینڈ میں باقی آئندہ ماہ دیکھ کر ہمارے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ کبھی کبھی یہ رشتے کتنے بے حس ہوجاتے ہیں۔ شاہدہ خود ایک عدد بیٹی کی ماں ہوکر بھی ہر احساس سے عاری تھیں۔ اس ناول میں ماموں تنویر اور ثمرین کا کردار مجھے پسند آیا ہے۔ اس کے بعد نبیلہ آپی کا سلسلہ وار ناول رقص بسمل پڑھا۔ صفحات وہی تھوڑے ہے۔ نبیلہ آپی بالکل کان نہیں دھرتیں ہماری شکایت پر۔ اشعار کا اس بار بھی ایک ہی صفحہ تھا۔ اشعار میں اس بار فوزیہ ثمرٹ اور رابعہ رشید کے اشعار پسند آئے۔

ج : پیاری آمنہ! قسط وار تحریریں ہمیں بھی پسند نہیں، اسی لیے ہم اپنی مصنفین سے درخواست کرتے ہیں کہ ایسی تحریریں لکھیں جو ایک ہی قسط میں مکمل ہوں۔ طویل تحریر ہم ــــ ایک ہی قسط میں مکمل شائع نہیں کرسکتے کیونکہ اس صورت میں دیگر مصنفین کی تحریریں اور دیگر سلسلے جگہ نہ پاسکیں گے۔

ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ جبکہ ہمارے خیال میں یہ ایک اچھا ٹائٹل تھا۔ خوب صورت ماڈل، فطری انداز، فوٹو گرافی مہارت اور دلکش رنگ ــــ بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ مزید بہتر بناسکیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کائنات اصغر ڈہرکی سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

ٹائٹل پہ گجروں کے سوا کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ "پہلی شعاع" میں آپ کے موتیوں جیسے الفاظ سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکی۔ "کوثر اور ثمینہ آنٹی کا شعاع پہ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ "صحرائے تھر کی صدا" ام ثمامہ آپ کی کاوش اچھی تھی ہمارے حکمرانوں کی بے توجہی کی وجہ سے تھر کے پھول دم توڑتے جارہے ہیں۔ مائیں اپنے جگر گوشوں کو اپنے سامنے تڑپتے، بلکتے دیکھ رہی ہیں "کیا ان کی آہوں اور سسکیوں سے ہمارے حکمرانوں کو ڈر نہیں لگتا۔

ناصر کاظمی کی غزل زبردست تھی۔ انٹرویو میں سوہائی ابرو سے ملاقات اچھی رہی۔ وہ عطیہ داؤد کی بیٹی ہے، مجھے عطیہ داؤد کے ڈرامے اچھے لگتے ہیں۔ اشعار کچھ خاص نہیں تھے، افسانوں میں سنیعہ عمر "نیلا گلاب" بھائی مرچکا تھا اور دوسرے بھائی کو جائیداد کی پڑی تھی۔ "دائرہ" یمین رضا نے "مکافات عمل" کو دکھایا۔ میمونہ صدف "شکستہ آئینے" غرور وتکبر اور دکھاوا کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے "پلڑا" اینڈ میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ "محبت کب سمجھتی ہے" میں راحم کو بہت جلدی پچھتاووں نے گھیرا۔ مریم عزیز پلیز تعبیر کے ساتھ کچھ بھی برا مت کیجیے، فہد اور تعبیر کی جوڑی بنائیے گا۔ "رقص بسمل" مائی موسٹ فیورٹ بٹ مجھے تیمور جو کہ ناول کا ہیرو ہے پسند نہیں، پہلے نبیلہ آپی نے اس کی پرسنالٹی زبردست دکھائی مگر اب وہ ٹین ایجر کی طرح بی ہیو کررہا ہے۔ اس سے تو اچھا آفاق ہے۔

ج : پیاری کائنات! حکمرانوں میں خوف خدا ہی تو نہیں ہے "ان میں خوف خدا پیدا ہوجائے تو پاکستان کی تقدیر نہ بدل جائے۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ عوام خود بھی کسی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں، وہ جن لوگوں سے دھوکا کھاتے ہیں، بار بار ان ہی کو منتخب کرتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔

زرینہ بشیر احمد شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں

سرورق بس ٹھیک تھا۔ "رقص بسمل" ایک قدم آگے کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ "بت شکن" امامہ خان کا یہ ناولٹ پاور فل ہے۔ یقین نہیں آتا۔ کوئی ماں ایسی بھی ہوسکتی ہے۔ تعبیر مریم عزیز کا یہ ناول بھی اچھا ہے، تبصرہ محفوظ ہے۔ آخری قسط پڑھنے کے بعد ہی کیا جائے گا۔ گزرے برسوں میں دو کہانیاں ایسی تھیں جو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ "جنت کے پتے" اور دوسری "عشق آتش" کیا عشق آتش کتابی شکل میں آچکی ہے۔

ج : زرینہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ عشق آتش کتابی شکل میں نہیں آئی۔

اقصیٰ بتول نے نیا لاہور سے لکھا ہے

سرورق کو چار چاند لگاتی موہنی صورت والی ماڈل نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ سیدھی دل میں اتر گئی۔ اتنے خوب صورت انداز میں آیت الکرسی کو حمد کی شکل میں ڈھالا گیا کہ بس۔ نعت رسول سے دل و نگاہ کو معطر کرتے ہوئے آگے بڑھے تو پیارے نبی کی پیاری پیاری باتوں نے جکڑ ڈالا' بہت عرصے سے میرے دل میں کچھ گرہیں تھیں خوابوں کے حوالے سے جو کافی حد تک کھل گئیں۔

ثمینہ اکرم کا خط دیکھ کر ان سے بہت اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے' آبرو ملک کو آسیہ رزاقی کے بارے میں دیے گئے جواب نے مسکراہٹ دوڑا دی۔ رقص بسمل تو آپ نے بھی شائع کریں گے تو ہمیں کوئی افسوس نہ ہوگا' بہت سطحی سا ناول ہے یہ۔ میمونہ صدف نے سحر عترت سے میدان مارا اور اب شگفتہ آئینے سمیت پسندیدہ مصنفین کی فہرست میں شامل ہو چکی ہیں۔ آسیہ رزاقی کی تحریر پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ بت شکن نے اپنے سحر میں پور پور ڈبویا ہوا ہے۔ فرحین اظفر کا ناول بے حد پسند آیا۔ بہت متاثر کن لکھا انہوں نے۔ مریم عزیز آپ نے تعبیر بہت ہی خوب صورت لکھا۔ "محبت کب سمجھتی ہے" ناولٹ تو بہت اچھا لگا مگر صبغہ کی اتنی توہین کی راحم کو سخت سزا ملنی چاہیے تھی۔

ج : پیاری اقصیٰ! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ صفحات کی مجبوری نہ ہوتی پورا تبصرہ شائع کرتے۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

شمع مسکان جام پور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

تین مکمل ناولز کو دیکھ کر تو دل ہیپی ہیپی ہو گیا۔ سب سے پہلے "رقص بسمل" پڑھا۔ نبیلہ جی کی بیسٹ اسٹوری ہے۔ "بڑی آزمائش" آسیہ رزاقی نے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ حساسیت اور خلوص کا پیکر عادل بیسٹ کردار تھا۔ اے ہمسفر بھی اتنی ہی اچھی لگی۔ ارم نے پیروں فقیروں کے چکر میں اپنی گرہستی کھو دی۔ "کون جیتا کون ہارا" فرحین اظفر نے کہانی کو کہاں سے کہاں جا ملایا۔ قندیل اپنی شیطانی چال چلنے کے چکر میں جان گنوا بیٹھی۔ امبر گل ہم تو پہلی جیت سے خوش ہو ہی نہ پائے کہ ہماری ٹیم نے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں انڈیا کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اور لال آندھی کے ہاتھوں شکست نے تو مجھے حقیقت میں رلا دیا۔

ج : پیاری شمع! کراچی جو ملک کا معاشی حب ہے۔ پچھلے پچیس سالوں سے دہشت گردی کا نشانہ ہے' روزانہ بے گناہ معصوم افراد ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوتے ہیں۔ مسلک کی بنیاد پر قتل کر کے عوام کو آپس میں لڑانے کی سازش کی جارہی ہے۔ بھتہ خوری' ڈاکے' اغوا برائے تاوان عروج پر ہیں۔ اس ملک میں چار بار مارشل لا آچکا ہے۔ ہر بار عوام کے منتخب نمائندوں کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز سلوک کیا گیا۔ کرپشن' مہنگائی' بے روزگاری۔ مقامات آہ و فغاں تو بہت ہیں۔ اس لیے کھیل میں ہار پر رنجیدہ نہ ہوں' کھیل میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ اسے جی سے نہ لگائیں۔

آپ کے خط شامل نہ ہو سکے۔ اس کے لیے معذرت' تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا کرتی ہیں۔ اس بار بھی بہت اچھا لگا۔

سمیعہ سحر نے ضلع بہاول نگر سے لکھا ہے

لائٹ سے سوٹ لائٹ سے میک اپ اور لائٹ سی مسکراتی ہوئی دل میں اتر گئی ماڈل۔

مجھے شعاع کا ہر لفظ ہر انداز اچھا لگتا ہے چاہے وہ ناول ر ناولٹ ر افسانے ہوں یا شعاع کے سلسلے خط آپ کے ایسا لگتا ہے خط ہم نہیں پڑھ رہے بلکہ آپ خود ہمیں سنا رہی ہیں۔

ج : پیاری سمیعہ! بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے خط لکھا آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

فاطمہ سکندر گرین ٹاؤن لاہور سے لکھتی ہیں

"رقص بسمل" بہت زیادہ سست روی کا شکار ہے۔

"بت شکن" پڑھا۔ یہ بھی اچھا جا رہا ہے۔

افسانوں میں "دائرہ" سب سے زیادہ بہترین لگا۔ ایسا افسانہ پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ یمین رضا نے تو کمال ہی کر دیا۔

آخر میں آپ سے کہنا تھا کہ صرف معیاری کہانیاں شائع کیا کریں جن سے سبق بھی حاصل ہو۔ پچھلے ماہ دو سے تین دفعہ پٹھانی کلچر پڑھا۔ یہ اچھا تھا لیکن کہانی عجیب ہی تھی۔

ج : پیاری فاطمہ! بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ معیاری کہانیاں منتخب کی جائیں۔

افسانہ دائرہ ایمل رضا نے لکھا تھا' غلطی سے یمین رضا کا نام لکھا گیا۔

سونیا ربانی نے موہڑہ دھیمال سے لکھا ہے

شادی کے بعد کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ چھ ماہ بعد وقت نکال سکی اور جس روز مبین شعاع لے کر آئے رات بارہ بجے مجھے پڑھتا دیکھ کر وہ حیران ہوئے کہ میں جاگ رہی ہوں اور جاگ کیسے نہ رہی ہوتی۔ شعاع میری پہلی محبت سمجھ لیں۔ زندگی بہت بدل گئی ہے۔ مگر میں نے وقت نکال ہی لیا۔ مکمل ناول میں صرف آسیہ رزاقی کو وقت دیا اور شاید مدت بعد پڑھا تھا اس لیے اک اک لفظ انمول ہی لگا۔ بس کاش یہ بچھڑ کر یوں ملنے والا اتفاق اصل زندگی میں بھی ہوتا ہو۔ مگر عادل کی دوستی اور اچانک اتنا بڑا فیصلہ کرنا ہمت کی بات تھی بھئی۔ حنا یاسمین کی اچھی کہانی تھی۔ افسانے چاروں ہی پڑھ لیے' اچھے تھے مگر ایسا کوئی نہ تھا کہ پڑھنے کے بعد میں اسے ہی سوچتی رہتی اور مستقل سلسلے سب ویسے کے ویسے ہی ہیں۔

25 اکتوبر کی شب کو ہمارا نکاح ہوا اور 2 نومبر کی شب میں اپنے امی ابو کا وہ پیار بھرا آنگن ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔ سونیا مبین بن کر قاضیاں چھوڑا اور موہڑہ دھیمال میں آبسی۔ بس آپ سب دعا کرنا کہ میں جیسے سب کی بن گئی ہوں۔ اسی طرح سب کو اپنا بھی بنالوں۔

ج : پیاری سونیا! سب سے پہلے تو آپ کو نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مبارک باد اور دعائیں۔ زندگی کا یہ خوب صورت موڑ آپ کے لیے ہمیشہ خوشی اور خوش بختی لے کر آئے۔

شعاع کے ساتھ ساتھ میں ضرور شرکت کریں بلکہ شعاع کے ہر سلسلے میں شامل ہوں۔

مسکان جاوید اینڈ ایمان نور کوٹ سمابہ سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

ٹائٹل گرل اچھی تھی۔ سب سے پہلے ہم پہنچے نبیلہ عزیز کے ناول کی طرف (رقص بسمل) اس میں تیمور اور ولید کی نوک جھونک بہت اچھی لگتی ہے۔ آفاق کو ایسا نہیں کرنا چاہیے ہمارے مائنڈ کے مطابق آفاق کا باہر کسی کے ساتھ افیئر چل رہا ہوگا۔ اب آتی ہوں مکمل ناول کی طرف۔ آسیہ رزاقی کا ناول (بڑی آزمائش) ویل ڈن اپی کی بہت بہت اچھا تھا اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا (کون جیتا ہے) فرحین اظفر آپی جی تو سی تے گریٹ۔ مریم عزیز آپی جی آپ نے کیا خوب لکھا۔ قسم سے رلا دیا۔ نمرین کے ابو نے اگر تعبیر کو بیٹی بنایا تھا تو بیٹی کا حق ادا کرتے۔ ایک کی خوشی چھین کر دوسری بیٹی کو دے دی۔ بہت افسوس ہوا۔ ناولٹ "محبت کب سمجھتی ہے" حنا یاسمین کا بہت اچھا تھا۔ امایہ خان آپ کا ناولٹ (بت شکن) بس ٹھیک تھا۔ افسانے سب رائٹرز کے اچھے تھے۔ میری ایک ریکویسٹ ہے کہ پلیز غزلیں اور شاعری زیادہ سے زیادہ لکھا کریں۔

شعاع کے ساتھ میں فاطمہ کبیروالا اور ثمینہ کوثر عطاری ڈوگہ گجرات ان دونوں کا بہت اچھا لگا۔ نبی کی باتیں اس میں خواب کی تعبیر کے بارے میں پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

ج : مسکان اور ایمان! تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ' امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

حرم خان نے لکھا ہے

ماڈل اچھی تھی اور کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ میری امی جب میری عمر کی تھیں تب سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہیں میرا آج آخری پرچا تھا' میرے لیے دعا کیجیے گا۔ میرا نام حرم خان ہے آپ نے حرا شائع کیا۔

ج : پیاری حرم! آپ کا صحیح نام شائع کیا جا رہا ہے۔ ہماری طرف سے اپنی امی کا شکریہ ادا کر دیں۔

حرا قریشی بلال کالونی ملتان سے لکھتی ہیں

پہلی شعاع' ایک قوم کی صورت متحد ہو جانا تاسک تھوڑا سا مشکل ضرور ہے یہ ناممکن نہیں۔ بس ضرورت ہے ایک ہونے کی۔ ہم سب پاکستانی ہی تو ہیں۔

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" خوابوں سے متعلق کچھ حقائق سے آگاہ ہوئے۔ خوابوں سے بہت سے زیست کے پہلو عیاں ہوتے ہیں لیکن بس کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے فکسڈ ٹائم پر ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ خطوط میں اتنے تفصیلی' محبت و عقیدت کے لبادے میں ملفوف تبصرے مزا دے گئے۔ مجھے ویسے بھی تفصیلی خطوط پڑھ کر از حد

لطف آتا ہے اور اس پر چاشنی دار جوابات اس لطف کو مزید دوچند کردیتے ہیں۔ (خصوصی دعائیں، پیاری قارئین کے لیے!) میمونہ صدف "شکستہ آئینے" کی صورت ایک چھوٹی مگر نائس تحریر کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔ ویسے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ لوگ واقعی رب تعالیٰ کے حضور بہت خاص ہوتے ہیں۔ تحریر کی آخری سطریں بہت اعلیٰ تھیں۔ سعدیہ عزیز جی خوب پلڑے کا توازن برابر رکھا۔ "کون جیتا ہے کون ہارا ہے" فرحین اظفر جی کافی لمبی جست لگائی آپ نے، مکمل ناول شروع کیا تو پڑھ کر ہی اٹھے۔ شکر ہے صندل تنہا نہیں رہی۔ "نیلا گلاب" سنیعہ عمیر کی چھوٹی سی مورل بیسڈ اسٹوری تھی۔ مریم عزیز کی تعبیر بہت دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنی رہی آخر تک، حنا یاسمین کا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ راحم کا رویہ قدرے کٹھور تھا، صبغہ کے لیے کوئی اور۔؟ "دائرہ" بہترین افسانہ تھا ناصر کاظمی اور خمار بارہ بنکوی دونوں کی غزلیں اچھی تھیں۔ "باتوں سے خوشبو آئے" ساری باتیں مہک کا پیش خیمہ رہیں خصوصاً "نمرو اقرار کا انتخاب "شعاع کے ساتھ ساتھ" میں فاطمہ اور ثمینہ کے خیالات اور عادات پڑھ کر اچھا لگا۔ تاریخ کے جھروکے تو حیران کیے دیتے ہیں۔ (سدا خوش رہیں دعاؤں کے سائے میں!) آمین!

ج : پیاری حرا! خوب صورت الفاظ میں آپ کا تفصیلی تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت دلچسپی سے پڑھا، بہت اچھا لگا۔ صرف ایک کمی محسوس ہوئی کہ آپ نے تعریف تو کی تنقید نہیں۔ جبکہ مکمل تبصرہ وہی ہوتا ہے جس میں تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ہو۔

فرحت گاؤں بوسال سکھا ضلع راولپنڈی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

میں پچھلے نو سال سے شعاع کی خاموش قاری ہوں، میں ایک ہی بہن ہوں اور تین بھائی۔ ہمارے گاؤں میں تعلیم کی سہولت ہے ہسپتال بھی ہے۔ سوئی گیس بھی ہے "رقص بسمل" بہت خوب لکھ رہی ہیں نبیلہ عزیز۔

ج : پیاری فرحت! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیے گا۔

قارئین متوجہ ہوں!

1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابلِ اشاعت کی صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	عفرا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گول گپے

اجزا :

آٹا	ڈھائی پیالی
سوجی	آدھی پیالی
املی کا رس	ایک پیالی
کابلی چنے	ایک پیالی
گڑ	چار کھانے کے چمچے
سونٹھ، زیرہ	آدھا، آدھا چائے کا چمچہ
کالا نمک	ایک چٹکی
چینی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

آٹا اور سوجی ملا کر اس میں تقریباً" تین کھانے کے چمچے تیل گرم کرکے ملائیں اور نیم گرم پانی سے سخت گوندھ لیں اور ململ کے کپڑے سے ڈھک کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ چھوٹے پیڑے بنا کر نہایت پتلی روٹی کی طرح بیل لیں اور کسی کٹر یا گلاس سے ایک سائز کی ٹکیاں کاٹ لیں۔ گرم اور گہرے تیل میں ڈالیں اور درمیان سے چمچے کی مدد سے دبائیں۔ اس طرح وہ پھول جائیں گی۔

املی کے رس میں چار پیالی پانی کے ساتھ تمام اجزا ڈال کر دس منٹ تک پکائیں۔ گاڑھا ہوجائے تو اتار لیں۔ کالا نمک ٹھنڈا کرنے کے بعد ڈالیں۔ پھولی ہوئی پوریوں میں انگلی سے سوراخ کرکے تھوڑے تھوڑے کابلی چنے بھریں اور املی کی کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چکن اسٹیکس

اجزا :

چکن بریسٹ	چار عدد
سفید و سیاہ مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس، سرکہ	دو دو کھانے کا چمچہ
چینی یا شہد	ایک کھانے کا چمچہ

مسٹرڈ پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ
نمک حسب ذائقہ
تیل حسب ضرورت

چکن بریسٹ پر کٹ لگائیں اور ہڈی الگ کر کے چھری کی مدد سے کود لیں۔ سارے مسالے یکجان کر کے چکن اسٹیکس پر لگائیں اور دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پان کو چکنا کر کے گرم کریں۔ ہلکی آنچ پر دو، دو چکن اسٹیکس پھیلا کر رکھ دیں۔ ایک طرف سے سینکنے کے بعد پلٹ دیں۔ دونوں طرف سے سینک لیں تو آنچ تیز کر دیں۔ تھوڑا سا تیل اور تھوڑا سا پانی ڈالیں۔ فرائنگ پان میں آگ سی بھڑکے گی۔ اس طریقے سے باربی کیو کا مزا آتا ہے۔ دو منٹ بعد اتار لیں۔ چکن اسٹیکس تیار ہیں۔

صندل کا شربت

اجزا :

صندل کا برادہ آدھا پاؤ
عرق گلاب ایک لیٹر
چینی آدھا کلو

ترکیب :

صندل کا برادہ عرق گلاب میں چوبیس گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ پھر اتنا پکائیں کہ عرق گلاب آدھا رہ جائے۔ چولہے سے اتار کر چھان لیں اور چینی ملا کر دوبارہ پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو ٹھنڈا کر کے بوتل میں محفوظ کر لیں۔ ٹھنڈے پانی میں دو سے تین چمچے صندل کے شربت کے ملائیں اور کچلی ہوئی برف ڈال کر پیش کریں۔

کیری کا شربت

اجزا :

کیری ایک کلو
چینی ایک کلو
لیموں چار عدد
کالا نمک چٹکی بھر

کیریاں چھیل کر اسٹین لیس اسٹیل کی پتیلی میں آٹھ گلاس پانی کے ساتھ ابال لیں۔ اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ گٹھلی نکال کر پھینک دیں۔ اور بلینڈر میں باریک کر لیں۔ دوبارہ پتیلی میں ڈال کر چینی کے ساتھ پکائیں۔ ٹھنڈا ہونے پر لیموں کا رس اور کالا نمک ملا کر بوتل میں محفوظ کر لیں۔ ایک گلاس میں دو سے تین چمچے کیری کے شربت کے ملائیں اور کچلی ہوئی برف ڈال کر پیش کریں۔

(دونوں شربتوں کو کیوبز کی صورت فریز بھی کیا جاسکتا ہے۔ بوقت استعمال ایک گلاس ٹھنڈے پانی میں کیوبز ڈال کر لطف اٹھائیں۔)

قلفی

اجزا :

دودھ دو کلو
سویاں ایک پیالی
کارن فلور دو کھانے کے چمچے
چاول کا آٹا دو کھانے کے چمچے
فلاقند آدھا کلو
پستے، بادام، الائچی دو کھانے کے چمچے
چینی دو پیالی

ایک پیالی دودھ نکال کر باقی دودھ کو ایک جوش دے کر ہلکی آنچ پر چولہے پر ہی چھوڑ دیں۔ سویاں ایک پیالی پانی میں ابال کر باریک پیس لیں۔ الائچی دانے اور بادام، پستے باریک کتر کر چینی کے ساتھ دودھ میں ڈال دیں۔ چمچہ چلاتے رہیں۔ ٹھنڈے دودھ میں چاول کا آٹا اور کارن فلور گھول کر ابلتے دودھ میں شامل کر دیں اور چولہا بند کر دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو فلاقند مسل کر مکس کر دیں۔ سانچے میں ڈال کر خوب پھینٹیں پھر فریزر میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد نکال کر دوبارہ پھینٹیں۔ پھر فریزر میں رکھ دیں۔ ہر گھنٹے بعد دو تین بار یہ عمل دہرائیں۔ اس سے قلفی میں برف نہیں جمے گی اور وہ نرم بھی رہے گی۔ تین گھنٹے بعد مزے دار قلفی تیار ہوگی۔

☆

امت الصبور

تاریخ کے جھروکے سے

خورم جس کے لیے والدہ سلطان نے کہا تھا۔

"وہ ضدی، سرکش، غصیلی، منتقم مزاج، ناتراشیدہ، عجلت پسند، سازشی اور دو غلی ہے تو اسے ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ وہ مدتوں غلام رہی ہے۔"

خورم سلطان نے جہاں اور خرابیاں پیدا کیں۔ وہیں اس نے سلطنت عثمانیہ کو سب سے زیادہ ناقابل تلافی نقصان یہ پہنچایا کہ سلطان کے ولی عہد شہزادہ مصطفیٰ کو مروا دیا۔ ابراہیم کے بعد شہزادہ مصطفیٰ وہ واحد شخصیت تھی جو ترکی سلطنت کو بام عروج پر لے جاسکتی تھی۔

خورم نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان بھی نفرت کی دیوار کھڑی کر دی۔ اس نے سلیم کو ولی عہد بنانے کی کوشش کی جو بزدل اور احمق تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں بایزید زیادہ ذہین اور بہادر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مصطفیٰ کی روح سلیمان کا پیچھا کر رہی تھی۔ خورم دنیا سے جاچکی تھی' لیکن سازشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مصطفیٰ کو مروایا گیا تھا۔ اب بایزید کی باری تھی۔

ظالم رستم نے جو کثرت کار کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تھا اور لب مرگ تھا' لالہ موسیٰ کی سازش کا حال بیان کیا اور سلیم کے احتجاج کے باوجود اسے جلاوطن کر دیا۔ لالہ موسیٰ کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ اصل خوف فوج کا تھا۔ جو بایزید کے خلاف تلوار نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔

"ہمیں تیغ کشی کا حکم ملا ہے۔ لیکن اس کے خلاف جس سے اس ملک کی ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کے خلاف' جو ہمارے سلطان کی جیتی جاگتی شبیہہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سلیمان' سلیم کو کیوں ترجیح دیتا ہے۔ جسے عیاشی اور عورتوں سے فرصت نہیں اور جو اس قابل ہے کہ اسے لاتیں مار مار کے کام کاج کے کپڑے پہننا سکھایا جائے۔ آخر بایزید نے قصور کیا کیا ہے جو ہم اس کے خلاف تلوار اٹھائیں؟ بایزید نے اپنے باپ کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔ وہ تو اپنے باپ کو دل سے چاہتا ہے۔ نہیں۔۔۔ بایزید کے خلاف تلوار اٹھانے کے حکم کی تعمیل کرنا گناہ کبریٰ ہے۔"

میدان سے خبریں آنے لگیں کہ کئی دستوں نے کوچ کرنے سے انکار کر دیا۔ سواروں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے انہیں یہ خانہ جنگی پسند نہیں سست گامی شروع کر دی۔ سلیمان ان علاقوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔

بیمار رستم نے بوزبک کو بتایا کہ "سلطان بھی اپنی سپاہ کی بغاوت سے خوف کھاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ انہیں سنبھال نہ سکا تو پھر اور کوئی نہ سنبھال پائے گا۔"

قونیہ سے اطلاع آئی تھی "مولانائے روم کی خانقاہ کے قریب جو لڑائی ہوئی تھی۔ اس میں جنگجو سپاہیوں کے جسموں ہی نے سوکولی کے حکم کی تعمیل کی تھی' ان کے دل بایزید کے ساتھ تھے۔"

بایزید نے اپنے والد سے استدعا کی تھی کہ سمندر پار کر کے ایشیا نہ تشریف لائیں۔ بایزید کی لڑائی صرف سلیم سے تھی۔ لیکن اگر سلطان خود تشریف لائے تو سارا ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔

سلیمان نے اس خط کو خاموشی سے الگ رکھ دیا۔ بڑی تلخی سے اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس کے ساتھیوں اور اس کے ہمرکابوں نے جان لیا کہ اب سلطان خود بنفس نفیس اپنی اس فوج کی سپہ سالاری کرے گا۔ جسے کسی جنگ میں شکست نصیب نہیں ہوئی۔

اس کے کاندھے میں بڑا شدید کرب آمیز درد تھا' لیکن وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے تین سوال ایک میر منشی کو رنگین کاغذ پر لکھوائے۔ رستم نے انہیں غور سے پڑھا اور اتفاق رائے سے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"پہلا سوال' سلطان ایک ایسے شخص سے کس طرح کا سلوک کرے۔ جس نے اس کی زندگی میں روپیہ جمع کرکے فوج جمع کی' قصبوں پر حملے کیے اور ملک کے امن میں خلل ڈالا۔"

"دوسرا سوال' اس کے مددگاروں کے متعلق سلطان کیا رائے قائم کرے۔"

"تیسرا سوال ایسوں کے متعلق سلطان کیا رائے قائم کرے جو اس کی تائید کرتے ہیں اور اس کے خلاف تلوار اٹھانے سے انکار کرتے ہیں؟"

یہ تینوں سوال اس نے لکھوا کے قاضی القضاۃ ابن سعود کے پاس بھیجے۔ حسب توقع مفتی اعظم نے یہی فتویٰ دیا کہ ایسا شخص بدترین سزا کا مستوجب ہے۔ اس کے مددگار اس لیے گناہ گار ہیں کہ انہوں نے شرع کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس نے سوکولی کو سلیم کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ بایزید کی نئی فوج کا تعاقب کرے۔

گرمیوں کے مختصر سے موسم میں سرحد پر لڑائی کا خاتمہ ہوگیا۔ بہادر اور نڈر سوکولی بایزید کی فوج کے تعاقب میں جا پہنچا اور بایزید تعاقب سے بچنے کے لیے سرحد پار کرکے اپنے چاروں بیٹوں' اپنے حرم اور اونٹوں پر لدے ہوئے سازو سامان سمیت ایران پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ کچھ بہادر سوار تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح شاہ طہماسپ کے دربار میں پہنچ گئے۔ شاہ طہماسپ نے شاہانہ شان و شوکت سے بایزید کا استقبال کیا اور قسم کھائی کہ ایران کی سرزمین پر اسے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

لیکن سرحد پار کرکے بایزید نے دراصل موت کے منہ میں قدم رکھا تھا۔

شروع میں تو وہ جوش کے عالم میں اپنی اس کامیابی پر خوش تھا کہ اپنے نڈر سواروں کے ساتھ وہ سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اب وہ شائستہ مزاج شاہ طہماسپ کا شاہی مہمان ہے۔ وہ دنگلوں اور کئی دعوتوں میں شریک ہوا۔

جب بایزید نے ترک سرزمین کو چھوڑا' تب بایزید اس کا بیٹا نہیں رہا تھا۔ محض باغی رہ گیا تھا۔ یہ معمر تاجدار اپنے قریبی عزیزوں کی غداری برداشت نہ کرسکتا تھا۔ مزید برآں سوکولی سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک سارے لشکر میں اب یہی احساس تھا کہ تبریز میں پناہ لے کر بایزید نے اپنے ترکہ اور تخت و تاج پر اپنا حق ترک کردیا۔ اب آل عثمان سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

ترکوں میں وفاداری کا جو سخت معیار تھا۔ اس کے لحاظ سے مصطفیٰ کو شہید اور بایزید کو غدار سمجھا جانے لگا۔ اب خانہ جنگی کا اندیشہ نہیں رہا اور سلیمان نے سرحد پر اس قدر شورش کا انتظام کردیا کہ شاہ ایران کو اپنی سرحد غیر محفوظ نظر آنے لگی۔

سلطان نے شاہ طہماسپ پر دو باتیں واضح کردیں۔ جب تک بایزید کو اس کے حوالے نہ کردیا جائے گا؟ ایران کو امن نصیب نہ ہوگا اور بایزید کا تاوان محض زر نقد کی صورت میں ادا کیا جائے گا۔ سلیمان کا فرزند شاہ کا مہمان تھا اور یہ شاہ کی سبکی تھی کہ اسے قید کرکے سلطان کے حوالے کردیا جائے۔

سلیمان جوش غضب میں ایرانیوں سے سودا کرنے یا ان کی سبکی وغیرہ کا لحاظ کرنے کو قطعاً تیار نہ تھا۔ ایک جلاد کے ہاتھ چار لاکھ اشرفیاں طہماسپ کو بھجوادی گئیں۔ ایرانیوں نے بہانہ کرکے بایزید کے ساتھیوں کو دور دراز دیہاتوں میں منتشر کردیا اور ان سے ہتھیار رکھوا کے سازش کے الزام میں انہیں قتل کرادیا۔

بایزید اس وقت گرفتار کیا گیا۔ جب وہ شاہ کے ساتھ ضیافت کے دسترخوان پر بیٹھا تھا اور اس بہانے اسے ترکوں کے حوالے کردیا گیا کہ اسے سلیمان کے پاس نہیں' بلکہ اپنے بھائی کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا۔

تھوڑی دور تک سفر کرنے کے بعد راستے ہی میں ترک جلاد نے اس کا اور اس کے تمام بیٹوں کا کام تمام کردیا۔ روایت کی جاتی ہے کہ پہلے اس کی داڑھی مونچھ

مونڈی گئی' تاکہ اچھی طرح پہچان لیا جائے کہ یہی وہ بایزید ہے۔ جس نے اماسیہ میں اپنا دربار لگایا تھا۔

ایرانیوں نے اسے میلا سمور پہنایا تھا اور اس کی کمر میں رسی باندھ دی تھی۔

جب سلیمان نے سرائے کو واپس مراجعت فرمائی اور تیسرے صحن کے حوض کے قریب اپنے راہوار سے اترا تو بہت کم پہچانے ہوئے چہرے اس کے استقبال کے لیے نظر آئے۔ اب اس کا صرف ایک بیٹا سلیم زندہ رہ گیا تھا۔ جو اناطولیہ میں قطاہیہ کا گورنر تھا۔ جیتے جی سلیمان نے پھر اسے اپنے حضور طلب نہ کیا تھا۔

جس سال بایزید کو قتل کیا گیا۔ اسی سال رستم نے بھی وفات پائی۔ اپنے مرنے سے پہلے اس سفاک وزیر نے بھی وہی کیا جو سلطان نے کیا۔ اپنی بے حد و انتہا جائیداد وقف کردی۔ اس وقف سے مساجد اور کارہائے خیر کے اداروں کو سالانہ دو لاکھ اشرفیوں کی آمدنی ہوئی تھی۔

اسے توقع تھی کہ اس کی بیٹی مہماہ اس کی خدمت گزاری کرے گی۔ لیکن وہ حرم سرائے کے اس حصے سے الگ ہوگئی۔ اسے اپنے بھائی بایزید سے بہت محبت تھی اور وہ اپنے باپ کو کبھی معاف نہ کرسکی جس نے اسے قتل کرایا تھا۔ جب سلیمان نے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ مہماہ پرانے قصر کے کھنڈر میں منتقل ہوگئی ہے۔

وہ لڑکیوں کی داروغہ کی زبانی اس کے لیے ایک پیغام چھوڑ گئی تھی کہ وہ اپنے پورے خاندان کے ماتم میں سیاہ پوش ہے۔ اب وہ روکسے لانا کے شاہی حجروں میں رہنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس پیغام سے اس غصے کا اظہار ہوتا تھا جو ایک عورت ہی کو آسکتا ہے۔ سلیمان کو برسوں پہلے پرانے قصر میں اپنی بہن خزینہ سلطان کے الفاظ یاد آگئے تھے۔ اس نے بھی تو اپنے شوہر وزیر اعظم ابراہیم کی وفات پر یہی کہا تھا "خدا کرے! مجھے ایک دن اپنے بھائی کے سوگ میں بھی سیاہ پوش ہونا پڑے۔"

اب اس کے گھر میں صرف مہماہ ہی ایک ایسی ہستی رہ گئی تھی۔ جس سے اس کو محبت تھی اور سلیمان سوچا کرتا تھا کہ شاید اس لڑکی کو اپنی ذہین ماں حورم اور خود اس سے نفرت ہے۔

بایزید کا بشاش چہرہ۔

جہانگیر کی مسکراہٹ۔

سب اسے یاد آتے۔

اس کے شانے جھک چکے تھے۔ اس کے خاندان بھر کی زندگی سمٹ کے سلیم کے بھوکے جسم میں آگئی تھی' جسے شراب خوری اور عیاشی سے فرصت نہ تھی۔ وہ اپنے گھربار کو پھر سے زندہ نہ کرسکتا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہوچکا تھا اور کسی اجنبی لڑکی کے جسم سے نئی اولاد پیدا نہ کرسکتا تھا۔

اس نے حکم دیا کہ روکسے لانا (حورم سلطان) کے کمروں کے دروازے چن دیے جائیں۔ اپنے دو کمروں میں وہ اکیلا رہتا اور اکیلا سوتا۔ اکثر وہ لنگڑاتا ہوا زریں بارہ دری سے گزرتا' جہاں اپنے اپنے مقام پر خواجہ سرا اور غلام اسے جھک جھک کر آداب بجا لاتے۔

جب سلیمان زین سے اترتا اور اس کی رکاب کے ساتھ دوڑتے ہوئے ہرکارے اسے اترنے میں مدد دیتے تو وہ درد جو اس کے پیروں میں تھا' اس کے جوڑ جوڑ میں سرایت کرجاتا' اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ اس — زمانے میں مارک انتونیو دونی وینس کے سفیر کا معتمد تھا۔ وہ سلطان کی ایک ایک جنبش پر نگاہ رکھتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس ایک سال میں سلطان بہت بوڑھا ہوگیا۔ وہ استسقاء میں مبتلا ہے۔ اس کی ٹانگیں سوج گئی ہیں۔ اسے بھوک نہیں لگتی۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی ہے۔ گزشتہ مارچ کے مہینے میں اسے چار' پانچ بار غشی کے دورے پڑے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب وہ کچھ ہی روز بعد مرجائے گا۔ خدا کرے ایسا ہو' کیونکہ اس سے عیسائی

دنیا کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔
عیسائی دنیا کو بڑا فائدہ اصل میں بایزید کے قتل سے پہنچ چکا تھا۔ سلیمان کو اس نقصان کا احساس تھا۔ بزدل سلیم کی حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت یا استحکام کا امکان نہ تھا۔
اس کے دونوں ہر دل عزیز لڑکے مصطفیٰ اور بایزید اگر زندہ رہ جاتے تو یہ ممکن تھا۔ لیکن اس وقت وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس نے اپنی سلطنت کو کتنا شدید صدمہ پہنچایا ہے۔
سلیم ثانی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی ڈیڑھ سو بیویوں اور خواصوں کے ساتھ حرم سرا کی سکونت اختیار کرلی۔ شروع میں تو آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر عثمانی سلاطین کو کنیزوں کو حرم میں داخل کرنے کی سزا بھگتنی پڑی۔ جیسے جیسے ان عورتوں پر نگرانی میں کمی ہوتی گئی انہوں نے وحشیانہ طور پر پہلے تو اپنے حقوق و اثر پھر دولت اور پھر طاقت کے لیے لڑنا شروع کیا۔
کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز روکسے لانا سے ہوا۔ محفوظ سرائے باب عالی روکسے لانا کی آمد خطرناک ثابت ہوئی۔ سرائے کی بارہ دریوں اور جھروکوں میں یہ عورتیں آسانی سے دیوان کے وزراء سے کانا پھوسی کرسکتی تھیں۔ ان عورتوں کے نگہبان حبشی خواجہ سرا تھے اور محل کے باہر سفید فام سپاہیوں کا پہرہ رہا کرتا تھا۔ زنان خانے کی تخت گاہ سے شاہی خزانہ دور نہ تھا۔
ان تمام نقشوں اور اس سارے محل وقوع سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ سلطان کے حکم میں زیست و مرگ کی طاقت تھی۔ اگر عورتیں سلطان پر قابو پالیتیں تو پھر یہ ان کی اپنی طاقت بن جاتی۔ سلیمان خود ایک عورت کے زیر اثر آچکا تھا۔ سلیم پر مدہوشی کا عالم ہو یا ہوش کا' آسانی سے عورتوں کی گرفت میں آسکتا تھا۔ لیکن اس نے سلطنت کے اعلا امور محمد سوکولی کو تفویض کردیے تھے' جو حرم سرا کے حلقہ اثر سے باہر تھا۔ لیکن جوں جوں سلیم کی مدہوشی بڑھتی گئی۔ اس کی پہلی قدن نور بانو کا اقتدار حرم سرا میں بڑھتا گیا۔ وہ مراد کی ماں تھی۔ اس لیے سلیم کے مرنے کے بعد اس نے اپنے لیے سلطان والدہ کا لقب طلب اور اختیار کیا۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ سلطان والدہ نے خاص سرائے باب عالی میں اپنا جداگانہ دربار لگایا۔ نور بانو نے اس کی اجازت نہ دی کہ اس کے بیٹے کی پہلی قدن اس کی ہمسری کرے۔ اندرونی تخت گاہ کو اس نے سچ مچ تخت گاہ بنایا۔
پھر جب کہن سال سوکولی قتل کردیا گیا تو عورتوں کے اقتدار کے راستے میں حائل آخری رکاوٹ بھی رفع ہوگئی۔ اس کے بعد جو صدی شروع ہوئی اسے ترک "قدن لر سلطنت" (حرم سرائے کی محبوباؤں کی سلطنت) کا زمانہ کہتے ہیں۔
مراد کی منظور نظر ایک بڑی خاص لڑکی تھی۔ جو وینس کے معزز بافو گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ حرم سرا میں اس کا نام صفیہ تھا۔ اس کے بال سنہرے تھے یا سرخ۔ اسے کسی ترک کپتان نے کسی جہاز میں گرفتار کیا تھا یا ہوشیار اہل وینس نے اپنے کسی جاسوس کے ذریعے اسے حرم میں پہنچوادیا۔ یہاں وہ وینس کے مفاد کے لیے کوشش کرتی اور روکسے لانا کی طرح کوشاں رہتی کہ مراد کے اس کے اپنے بطن کی اولاد تخت نشین ہو۔
چونکہ مراد کو عورتوں سے بہت رغبت تھی۔ اس لیے اس کی والدہ نور بانو اس کے لیے کوشش کرکے بڑی اچھی اچھی لڑکیاں تلاش کرتی' تاکہ وہ خطرناک صفیہ کے زیر اثر نہ آنے پائے۔ اس طرح کی رقابت کو رفع کرنے کی مراد نے کوئی کوشش نہ کی۔ اس کے باپ کی نظیر اس کے سامنے تھی جو صرف حرم سرا سے سروکار رکھتا تھا اور جس نے سلطنت کے تمام امور دیوان کے سپرد کردیے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے لیے اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا' وہ ہوا۔ سلطنت کا وقار بڑھ گیا اور فرانس کی طرح وینس کے باشندوں کو بھی خصوصی مراعات عطا کیے گئے۔ بازاروں سے بے شمار لڑکیوں کی خرید کی وجہ سے خواجہ سرائے حرم کے اثرات و رسوخ میں بڑا اضافہ ہوگیا۔ صفیہ کا فوجوں اور بیڑوں کی نقل و حرکت میں بڑا دخل تھا اور اس معاملے میں غالباً" وہ وینس والوں کے اشاروں پر چلتی تھی۔
ایک یہودن جوہری جس کا نام کیارتسا تھا۔ اس کے اور وینس کی میکنی فی کا کامیونی تا' کے درمیان نامہ بری اور مخبری کا کام انجام دیتی تھی۔
اس کے عروج کے زمانے میں مراد کے انیس بیٹے قتل کیے گئے۔ جو دوسری عورتوں کے بطن سے تھے۔ وہ آگے چل کے والدہ سلطان ہونے والی تھی۔ کچھ عرصہ کے لیے اس نے بڑی قوت حاصل کرلی۔
جب اس کا بیٹا محمد ثالث کے نام سے تخت نشین ہوا تو صفیہ نے دیکھا کہ اس کے مخالفین کا زور بڑھتا جارہا ہے۔ حرم کے اندر تو وینس کی رہنے والی یہ والدہ سلطان محفوظ تھی۔ لیکن حرم سرا کے باہر دنیا اسے خونی سمجھتی تھی۔ وہ کھڑکی کی جالی سے دیوان کے مباحث سنتی' لیکن اس کی کبھی ہمت نہ پڑتی کہ جالی کے باہر قدم رکھ سکے۔
جب صفیہ اور وزراء سلطنت کے مابین مخالفت بہت شدید ہوگئی تو اس نے طرح طرح کی نئی لڑکیاں محمد ثالث کے لیے فراہم کرنی شروع کیں' تاکہ وہ ان ہی میں الجھا رہے اور کسی امر کی توجہ نہ کرسکے۔ لیکن جب شمالی سرحد پر بغاوت ہوئی تو سپہ سالاروں کو اس کا موقع مل گیا کہ محمد ثالث کو حرم سرائے سے باہر نکال کے اپنے ساتھ ہنگری لے گئے۔
جب حرم سرا سے دور ہونے کے باوجود سلطان محمد ثالث حرم کی عورتوں کے عشق کو اور عیاشی کو فراموش نہ کرسکا تو صفیہ کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت جو باقی رہ گئی تھی' اختیار کی گئی۔ دوسروں عورتوں کے خواجہ سراؤں نے سوتے میں صفیہ کا گلا گھونٹ کے اس کا کام تمام کردیا۔ یہ اس قسم کا پہلا قتل تھا۔ کچھ عرصے بعد اس طرح کے قتل عام ہوگئے۔ ان سارے ہنگاموں کا مرکز حرم سرا تھی' جس کی آبادی میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ اب سلطان کی اولاد آئندہ طاقت حاصل کرنے کا پروانہ سمجھی جانے لگی۔ ہر لڑکے کو بڑی احتیاط سے حرم ہی کی چار دیواری میں رکھا جاتا اور سن بلوغ کو پہنچنے تک ہر لڑکا عورتوں کی سازشوں میں گھرا رہتا۔
حرم سرا کے دروازوں سے افواہیں نکل نکل کر پھیلنے لگیں۔ ایک دروازے کا نام باب دوشالہ پڑگیا۔ دوسرا دروازہ باب الیت مستورات کہلانے لگا۔ شاخ زریں کے اس پار غلطہ میں طرح طرح کی رنگین کہانیاں مشہور ہونے لگیں اور یہ افسانے سیاحوں کی زبانی یورپ بھر میں پھیلنے لگے۔ جب یہ سیاح قسطنطنیہ سے واپس جاتے تو اپنے ساتھ سرائے باب عالی کے متعلق طرح طرح کی بے ہودہ کہانیوں کے تحفے دوسروں کو سنانے جاتے۔ ان سب باتوں کے باوجود کبھی کبھی ہی ایسا ہوتا کہ کوئی قدن اتنی طاقت حاصل کرلیتی کہ سلطنت کے معاملات میں دخل اندازی کرسکے اور اتنی طاقت اس کو اس وقت حاصل ہوتی۔ جب وہ خود معمر ہوچکی ہوتی اور حرم سرا کی جوان عورتوں پر اقتدار قائم رکھنے کے لیے اسے بڑی کوشش کرنا پڑتی۔
حرم سرا کی عیاشی اور یہیں بے شمار اولاد کے پیدا ہونے اور بڑھنے سے آل عثمان کی اندرونی طاقت سلب ہوگئی۔ محمد ثالث کا ایک پوتا یقینی طور پر پاگل تھا۔ ایک اور پوتے عثمان کو سپاہیوں نے قتل کردیا۔
اس وقت حرم کی ایک اور اولین خاتون جس کا نام کلثوم تھا۔ وہ مقام حاصل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ جو ایک زمانے میں صفیہ کو حاصل تھا۔ لیکن اس کے بیٹے مراد رابع نے حرم کے اثر سے نکل کے فوجوں کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کیا۔ وہ نوجوان تھا۔ شراب نوشی اور بیماری سے وہ کمزور ہوگیا تھا اور سلیم ثانی کی طرح وہ بھی طرح طرح کے اعصابی خوف کا شکار رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ سورج گرہن کے محض وہم اور دہشت سے اس کی موت واقع ہوئی۔
ممکن ہے کہ مراد اور اس کے بھائی ابراہیم کے دماغ میں بھی خلل ہو۔ بہرحال ان کی ماں کی بے رحم سازشی

چالوں کی وجہ سے حرم کی ان ساری دبی ہوئی قوتوں کا بھی ہیملٹ کے ڈراما کا سا انجام ہوا۔

جواں سال مراد جب اپنے خیمے میں لب مرگ تھا تو اپنے اطمینان کے لیے حکم دیا کہ اس کے بھائی ابراہیم کو اس کے مرنے سے پہلے ہی قتل کردیا جائے۔ یہ دونوں بھائی آل عثمان کے تاجدار خانوادے کے آخری چشم و چراغ تھے۔ ان کے بعد اس خاندان کا نشان مٹ جاتا۔ مراد نے اپنے ایک منظور نظر بھتیجے کو اپنے بعد سلطان نامزد کیا تھا۔ اس نے ابراہیم کے قتل کا حکم دے دیا۔ جو اسی کے قصر کے ایک حجرہ میں پاس ہی قید تھا۔ (کچھ عرصہ بعد "پنجرہ" کا طریقہ رائج ہوگیا) جس میں سلطان وقت اپنے بھائیوں کو مقید کردیتا۔ تاکہ وہ باہر کسی اور سے رسم و راہ نہ کرسکیں۔ اگر مراد کے حکم کی تعمیل کردی جاتی تو خاندان عثمانیہ کا خاتمہ ہوجاتا۔ آئین ختم ہوجاتا اور ترک قوم کی تقدیر میں بڑی گہری تبدیلی ہوتی۔ لیکن اس نازک موقع پر مراد کے ذاتی خدام نے خوف زدہ ہو کر سلطان کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ کلثوم نے بھی انہیں سختی سے اس کی ممانعت کردی تھی۔ انہوں نے لب مرگ مراد کو یہ جھوٹی اطلاع دی کہ ابراہیم کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ مراد کے بعد اپنے قید خانے میں ابراہیم اس قدر خوف زدہ ہوگیا کہ جب قاصدوں نے اسے باہر نکالنے کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے اطراف بہت سی چیزیں جمع کرلیں۔ جب اس کی تاج پوشی ہوئی اور اس کی کمر سے خانوادہ عثمانی کی موروثی تلوار باندھی گئی' تب بھی وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ ہر وقت اپنی ماں اور اپنے اطراف کی سازشوں سے اس قدر خائف رہتا کہ بڑی مجنونانہ حرکتیں کربیٹھتا۔ اوان خونخوار (جس کا انتقال ہوئے اب دو بہشتیں گزر چکی تھیں۔) سے بھی زیادہ اس نے اپنے اطراف تصورات اور مفروضات کی ایک دنیا بنالی تھی۔ وہ من مانی کرتا اور جو اس کی راہ میں حائل ہوتا اس کا کام تمام کردیتا۔ ابراہیم کے آٹھ سالہ دور حکومت میں حرم سرا نے وزراء کے نظم و نسق پر قطعی طور سے اقتدار حاصل کرلیا۔ لیکن یہ اقتدار بے سود تھا۔

ابراہیم نے اپنے قابل اور زبردست وزیر قرا مصطفیٰ کو قتل کرادیا۔ اس کی جگہ جو شخص وزیر مقرر ہوا۔ وہ سلطان کی عجیب و غریب حرکات اور بے ہودہ خواہشات کے معاملے میں قطعاً" دخل نہ دیتا۔ کلثوم کا بھی اسی میں فائدہ تھا کہ اس کے معاملات میں دخل نہ دے۔ یہ نیم مجنوں نوجوان جس نے قید میں آٹھ سال ہر لمحہ جلاد کا انتظار کرتے کرتے گزارے تھے۔ حرم سرا کے دوسرے ساکنوں سے بدلہ لیتا رہا۔

اس کی ساری عجیب و غریب خواہشیں پوری کردی جاتیں۔ اسے عطر میں اور خاص طور پر ابلیم کی تیز خوشبو میں لپٹے رہنے کا شوق تھا۔ اسے سمور بہت پسند تھے۔ (ساری سلطنت میں ابلیم اور سمور اس کے لیے تلاش کیے جاتے۔)

خوشبوؤں کے بعد اسے جواہرات کا خبط ہوا۔ وہ ایسے نادر نادر جواہرات خریدتا کہ ان کی وجہ سے خزانہ خالی ہوگیا۔ جو عورتیں اس کی ذلیل حرکتوں کا نشانہ تھیں۔ وہ بدلہ لینے کے لیے ان بازاروں کے جواہرات اور ملبوسات پر قبضہ کرلیتیں جہاں خرید فروخت کا کام شریف عورتیں کیا کرتی تھیں۔ ابراہیم کو ایک دھن یہ سمائی تھی کہ بازار کی دکانیں دن بھر اور رات بھر کھلی رہا کریں۔

سرائے کے باہر اس کے جنون کا محض ایک مدھم سا اندازہ ہوتا تھا۔ خزانے کے دفتر دار کہتے تھے کہ حرم سرا کے اخراجات کبھی اس قدر نہیں بڑھنے پائے تھے۔ جس قدر کہ اس زمانے میں بڑھے' جبکہ خزانہ خالی ہوچکا تھا۔ سڑکوں پر کسان دیکھتے ہیں کہ ابراہیم کی داڑھی میں جواہرات جگمگا رہے ہیں اور وہ اسے فال بد سمجھتے۔ ان چند سالوں میں حرم سرا کے اس دروازے سے جسے عورتوں کے جنازوں کا دروازہ کہتے تھے۔ بے شمار میتیں باہر نکالی جاتیں۔

ایک شخص نے ایک بار سرائے کے اس دروازے کے قریب جو سمندر کے کنارے ہے گہرے پانی میں غوطہ لگایا اور چیختا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے سمندر کی تہ میں مردہ عورتوں کی قطاریں کی قطاریں دیکھیں جو تھیلوں میں لپٹی ہوئی ادھر سے ادھر تیز دھارے میں جنبش کررہی تھیں حرم سرا کی ان عورتوں کا چپکے سے گلا گھونٹ دیا جاتا تھا۔ پھر انہیں تھیلوں میں سی کے ان کے پیروں سے وزنی پتھر باندھ دیے جاتے اور رات کو کشتی میں لے جاکے انہیں سمندر میں ڈال دیا جاتا۔ وزنی پتھروں کی وجہ سے ان کے پیر تہ میں نصب ہوجاتے اور ان کے جسم پانی میں کھڑے ہوجاتے۔

حرم سرا پر سلطان کے مجنونانہ افعال کی حکومت تھی اور ساری قوم پر حرم سرا کی حکومت تھی۔ ان بدعنوانیوں کے خلاف عوام کی ناراضی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ فوج اور مدارس کے سربر آوردہ کے ایک وفد نے والدہ سلطان کلثوم سے مطالبہ کیا کہ ابراہیم کو تخت سے اتار کے پھر قید کردیا جائے اور اس کے نوعمر لڑکے محمد کو تخت نشین کیا جائے۔

جب ابراہیم نے یہ ماننے سے انکار کردیا تو شورش میں سپاہی بھی شریک ہوگئے اور مفتی اعظم کے فتوے کے مطابق ابراہیم کے قتل کا مطالبہ کیا۔ اس طرح اس عثمانی سلطان کو مفتی اعظم کے فتوے کی بنا پر قتل کردیا گیا۔

مگر کلثوم اس کے لیے تیار نہ تھی کہ اپنی طاقت نئی سلطان والدہ ترخان سلطان کے حوالے کردے۔ سپہ سالار کو اس نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور ابھی اس کے پاس ایک اور چور پتا تھا۔ اس نے یہ سازش کی تھی کہ ینی سپاہی نوعمر محمد کو تخت سے اتار کے اس کے چھوٹے بھائی کو سلطان مقرر کردے۔

کلثوم نے آخری پتا کھیلا اور ہار گئی۔ سازش میں اس کے ساتھیوں میں بھتیجی تھا اور حبشی خواجہ سرا اور ینی چیری کا اپنے آغا سمیت شامل تھے۔ سلطان والدہ ترخان سلطان کے حامیوں میں وزیراعظم' آغا اور مکتب کے طالب علم شامل تھے۔

ایک رات حرم سرا کا یہ مناقشہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچا۔ کلثوم نے بڑے مالی سے کہہ کے حرم سرا کے اندرونی دروازے کھلوا دیے تاکہ مسلح ینی سپاہی اندر آجائیں۔ ان سپاہیوں نے یہ چالاکی کی کہ سوتے میں وزیر کو گرفتار کرلیا اور بطور ضمانت اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ اب سرائے پر ان کا قبضہ یقینی تھا۔ تیسرے احاطے کی حفاظت محض مکتب کے طلبا اور چند خدام کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن جتنی دیر تک وہ اس کی حفاظت کرتے رہے' اتنی ہی دیر میں کلثوم کا کام تمام کردیا گیا۔ سلطان کی بوڑھی دادی کلثوم اپنے حجرے میں ملی۔ وہ کپڑوں کے صندوق میں جاچھپی تھی۔ وہاں سے اسے دشمنوں نے پکڑ کر نکالا اور اس کے لباس اور زیورات اس کے جسم سے نوچ نوچ کے چھین لیے۔ پھر اس کا گلا گھونٹ کے اس کی لاش باہر باغ میں پھینک دی۔

اس کے بعد سخت سزائیں دی گئیں۔ باغیوں کے سرغنوں کو قتل کردیا گیا اور مکتب کو اندرونی احاطہ سے باہر منتقل کردیا گیا۔ ترخان سلطان عقل مند عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ طاقت کے مقابلے میں جان کی سلامتی ہی بہت غنیمت ہے۔ اس لیے اس نے رعایا کے غم و غصہ کے آگے سر جھکا دیا۔ اب ہوشیار اور قریس کپرولو خاندان کے پہلے وزیر نے قلمدان وزارت سنبھالا' حرم سرا کا راج ختم ہوا۔ جہاں ایک صدی تک عورتوں کی حکومت رہی تھی۔

گرمیوں میں انسانی جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی واقع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ٹھنڈک کا احساس دینے والے قدرتی اجزا اور پھلوں سے بنے مشروبات اور غذا میں اس کمی کو دور کرتی ہیں۔

کدو :

گرمی میں معدہ اور خون میں تیزابیت بڑھنے کی شکایت ہو تو کدو کو کش کر کے نچوڑ کر ایک گلاس میں جوس نکالیں پھر اس میں لیموں کا رس ایک چمچ ملا کر روزانہ پئیں تو پیشاب کی جلن اور تیزابیت وغیرہ ختم ہو جاتی ہے۔ کدو کے رس میں چٹکی بھر نمک ڈال کر پینے سے گرمی سے پیدا ہونے والے نمکیات کا متبادل میسر آجاتا ہے۔ اس سے پیاس کی شدت کم ہوتی ہے اور تھکن سے بھی بچت ہو جاتی ہے۔

تربوز :

یہ گرمی کا بہترین توڑ ہے لیکن اس کے ساتھ کالی مرچ اور نمک کے سفوف کا استعمال ضرور کریں۔ بلڈ پریشر کے لوگ صرف کالی مرچ استعمال کریں۔

آم :

پھلوں کا بادشاہ آم گرمی کے موسم میں طبیعت کو بحال رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کچا آم لو لگنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ آدھ پکے آم کو راکھ میں پکا کر اس کے گودے کو پانی اور چینی میں ڈال کر مشروب بنالیں اور وقتاً فوقتاً استعمال کریں۔ یہ مشروب گرمیوں کے بد اثرات سے بچاتا ہے۔ کچا آم نمک لگا کر کھایا جائے تو پیاس کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے زیادہ پسینہ بہنے سے پیدا ہونے والی نقاہت ختم ہو جاتی ہے۔ پکے آم کھانے کے بعد دودھ اور پانی کی کچی لسی پینا چاہیے۔ اس سے آم کی گرم تاثیر ٹھنڈی تاثیر میں بدل جاتی ہے۔

لیموں :

اس میں وٹامن سی کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ گرمیوں میں لیموں کی سکنجبین پینے سے معدے کی تلخی، پسینے کی کثرت اور نقاہت جیسے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ لیموں پانی یا سکنجبین سے بدن میں قوت مدافعت بڑھتی ہے۔

چھوٹی الائچی :

سبز الائچی کو پانی میں پیس کر اس کا شربت حسب ضرورت میٹھا ملا کر ٹھنڈا کر کے دن میں دو بار پیا جائے تو بدن کی حدت کم ہوتی ہے۔ گرمیوں کے موسم میں الائچی کا خالص مشروب فرحت قلب کا باعث بنتا ہے اور پسینے سے پیدا ہونے والی ناگوار بو کو دور کرتا ہے۔

دھنیا :

بے شمار غذائی اجزا اور فوائد کا حامل دھنیا گرمیوں میں قدرتی معالج کی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس کے بیج گرمی سے ہونے والے بخار کو کم کر کے ٹھنڈک کا احساس بڑھاتے ہیں۔ دھنیے کا جوس وٹامنز کا خزانہ ہے۔ لہٰذا گرمیوں میں اس کے بیج یا پتوں کو ایک گلاس پانی میں پیس کر پیا جائے تو گرمیوں کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ یہ مشروب خون میں کولیسٹرول کم کرتا ہے اور گردوں کو متحرک رکھتا ہے۔ دھنیے کا شربت بنانے کا طریقہ یہ ہے ایک کپ دھنیا (خشک) بیج پانی میں ابال کر چھان لیں اور ٹھنڈا ہونے پر اس میں چینی یا شکر ملا کر استعمال کریں۔

اسپغول :

گرمیوں میں صبح ناشتے کے وقت یا شام کے وقت اسپغول گوند کتیرا ٹھنڈے دودھ میں ملا کر پیا جائے تو طبیعت خوش گوار ہوتی ہے اور بدن گرمی کی کثافتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ گرم طبیعت والوں کو روزانہ رات کو ٹھنڈے شربت میں اسپغول کا چھلکا ملا کر پینا چاہیے۔ اس سے ان کے جسم کی اضافی حدت کم ہوگی۔ بالخصوص ہائی بلڈ پریشر اور ہائی کولیسٹرول والوں کو گرمیوں میں اسپغول کو بہ طور غذا ضرور استعمال کرنا چاہیے۔

دودھ دہی :

گرمیوں میں دودھ اور دہی کی لسی پینے سے بھی گرمی سے تحفظ ملتا ہے۔ صبح ناشتے کے وقت اور دوپہر کو اس کی لسی پی جائے تو بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ دہی یا دودھ میں پانی کی مقدار زیادہ بڑھا کر اسے پتلا کر لیجیے۔ پتلی لسی پینے سے گردوں اور مثانے کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے اور پسینہ بھی زیادہ نہیں نکلتا۔